سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ، معاشرت، معیشت، اقدار اور نظریات کی تفہیم پر مبنی قیمتی دستاویز

سرمایہ دارانہ نظام

ایک تنقیدی جائزہ

www.KitaboSunnat.com

مرتب
محمد احمد حافظ

زیر نگرانی
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

الغزالی پبلی کیشنز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ نظام

ایک تنقیدی جائزہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضابطہ

نام کتاب.................. سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ

ادارتی بورڈ.................. نگرانِ اعلیٰ: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

معاونین: جاوید اقبال تاب، سید محمد یونس قادری

زاہد صدیق مغل، امین اشعر

مرتب.................. مولانا محمد احمد حافظ

اشاعت (دوم).................. مئی ۲۰۰۹ء

صفحات:.................. ۲۸۴

ناشر

الغزالی پبلی کیشنز

۴۱۔سی، بلاک ۷ افیڈرل بی ایریا۔کراچی

ملنے کا پتہ

اسلامی کتب خانہ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی ۷۴۸۰۰

۰۲۱۔۴۹۲۷۱۵۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

الاھداء.................................... ٦

پیش لفظ.................................... ۷

مقدمہ.................................... ١١

باب اول:............... "سرمایہ داری کا تاریخی پس منظر"

(١) عیسائیت اور جدید یورپ کی ابتدا.................... ١٤

(٢) سول سوسائٹی کا تاریخی پس منظر.................... ٢١

(٣) سول معاشرہ اور سرمایہ داری.................... ٣٤

باب دوم:............... "سرمایہ دارانہ افکار ونظریات"

(١) مغربی تہذیب کے اصول ومبادی.................... ٤٤

(٢) سرمایہ دارانہ علمیت.................... ٥٨

(٣) سرمایہ دارانہ نظام کی اساسی اقدار.................... ٧٨

(٤) انسانی حقوق؛ سرمایہ داری کا مذہبی صحیفہ.................... ٨٤

(٥) جمہوریت اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق.................... ٩٦

باب سوم:............... "سرمایہ دارانہ معیشت"

(١) سرمایہ دارانہ معیشت کیا ہے؟.................... ١١٠

(٢) سرمایہ دارانہ مارکیٹ.................... ١٢٢

(٣) معاشیات اور سرمایہ داری.................... ١٢٩

(٤) اشتراکیت یا ریاستی سرمایہ داری.................... ١٣٨

باب چہارم:............... "سائنس اور سرمایہ داری"

(١) وحی، سائنس اور سرمایہ داری.................... ١٥٠

(٢) ٹیکنو سائنس، ایک تجزیہ.................... ١٥٦

باب پنجم:............... "سرمایہ دارانہ تنظیم اقتدار"

(١) لبرل سرمایہ دارانہ ریاست.................... ١٦٠

(٢) عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکا.................... ١٨٣

باب ششم:............... "خصوصی مطالعہ"

(١) عالمِ اسلام اور مغرب کی کشمکش.................... ١٩٢

(٢) فلسفۂ یونان کا ابطال اور امام غزالی رحمہ اللہ کا منہج.................... ٢٤٦

ضمیمہ:

کثیر الاستعمال سرمایہ دارانہ اصطلاحات.................... ٢٧١

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الاِھداء

یہ کتاب ہدیہ ہے مدارس دینیہ کے علماء وطلبۂ کرام کی خدمت میں جو علوم نبوت کے وارث اور شریعت اسلامیہ کے امین ومحافظ ہیں...... جنہیں علمی سطح پر سرمایہ دارانہ فلسفہ ونظام کا چیلنج اسی طرح درپیش ہے جس طرح ہمارے اسلاف کو دوسری تیسری صدی ہجری میں یونانی فلسفہ کا چیلنج درپیش تھا...... اور جسے بالآخر حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اور ان کے شاگردوں نے شکستِ فاش دی۔

یہ کتاب ایک تحفہ ہے کارکنانِ تحریکات اسلامی کے لیے جو تحفظ وغلبۂ دین کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر چکے ہیں......

یہ کتاب ایک عرض داشت ہے انقلابی فکر رکھنے والے مجاہدینِ اسلام کی خدمت میں جن کے دم قدم سے حق وباطل کے مابین معرکوں کے میدان گرم ہیں......

اس خواہش کے ساتھ کہ:

آج جو فکر ونظر کا معرکہ بپا ہے اور کفر واسلام کی جنگ کا کٹھن مرحلہ آغاز ہو چکا ہے، اس میں عالمی سطح پر مسلط طاغوتی نظامِ سرمایہ داری کی گہری واقفیت حاصل کر کے اسے شکستِ فاش دے سکیں...... تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور خلافت اسلامیہ کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بھائیوں کی دینِ حق کی نصرت کے لیے کی گئی تمام مساعی کو قبولیت عطا فرمائیں (آمین)

پیش لفظ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہٖ واتباعہ اجمعین. اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ (الصف)

عالم اسلام مجموعی طور پر جس امتحان سے گذر رہا ہے اس سے کوئی بھی صاحب نظر غافل نہیں، سرمایہ دارانہ نظام وتہذیب نے مسلم معاشروں پر ہمہ جہت یلغار کر رکھی ہے۔ ہماری معاشرت، اقدار، نظریات اور افکار اس یلغار کی لپیٹ میں ہیں۔ فی الوقت مغربی تہذیب اور استعمار کی عسکری یلغار کے علاوہ ایک بڑا چیلنج جو عالم اسلام کو درپیش ہے وہ علم وفکر کا چیلنج ہے، مغرب کی نام نہاد علمیت ہمارے اہل دانش کو مرعوب کئے دے رہی ہے۔ مغرب کے پروپیگنڈے کے زیر اثر انہی افکار کو حق اور سچ جانا جا رہا ہے جو امریکا ویورپ سے درآمد شدہ ہیں۔ اس قسم کی صورت حال سے ہمیں ماضی میں بھی سابقہ رہا ہے لیکن ہمارے بیدار مغز اسلاف، اور گہری بصیرت رکھنے والے علماء امت نے لادین افکار کا قرآن وحدیث کی روشنی میں بھرپور رد کر کے الہامی علوم اور دینی معاشرت کا تحفظ کیا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، حجۃ الاسلام امام محمد الغزالی رحمہما اللہ انہی علماء کے سرخیل تھے۔ خصوصیت کے ساتھ امام غزالی رحمہ اللہ کا نام اس حوالے سے زیادہ معتبر ہے کہ آپ نے اوّلاً مقاصد الفلاسفہ اور پھر تہافۃ الفلاسفہ لکھ کر یونانی فلسفہ پر وہ کاری ضرب لگائی کہ ایک عرصے تک یونانی فلسفہ اس زوردار حملے سے جانبر نہ ہو سکا۔

حالیہ دور اس لحاظ سے مختلف ہے کہ پہلے اگر یونانی فلسفہ اسلامی معاشرے پر حملہ آور تھا تو اب سرمایہ دارانہ افکار وعلوم (جو درحقیقت جاہلیت خالصہ ہیں) نئے سے نئے پیرائے میں اسلامی معاشروں میں داخل ہو کر ہمارے عقائد ونظریات اور معاشرت کو منہدم کر رہے ہیں۔ نسل نو اس فکری یلغار کی وجہ سے اپنے دین کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو رہی ہے اور وہ برسر عام دینی اقدار کو فرسودہ و ناقابل عمل قرار دے رہی ہے۔ گو کہ عالمی سطح پر مجاہدین اسلام مغرب کی عسکری یلغار کو مکمل پامردی کے ساتھ چیلنج کر رہے ہیں مگر مغرب کا علمی تفوق بدستور ہماری تعلیم یافتہ نسلوں کو اپنی فسوں کاری میں نگل رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ فلسفہ و نظام کے مفاہیم، تعبیریں، علامتیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آدرشیں عنوانات اور اصطلاحات ہماری دنیا پر چھا گئی ہیں فکر و تعبیر اور علم و عمل کا ہر پہلو مغربیت میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ آج کے دور میں انسانی حقوق، آزادی رائے، آزادی اظہار، آزادی نسواں، گلوبلائزیشن، لبرل ازم، سیکولرازم اور ماڈرن ازم جیسے مغربی افکار ہی مقدس و معتبر ٹھہرائے جا رہے ہیں جو درحقیقت انکار خدا اور رسول، انکار وحی اور انسان کی الوہیت پر مبنی ہیں۔ انسانی حقوق، آزادی رائے اور آزادی اظہار کی آڑ میں انسان کو ہی معبود والہ بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت اہل مغرب کا ایک ہی نعرہ ہے لا الٰہ الا الانسان۔ دوسری طرف استعماری طاقتوں نے انسان کو سرمایہ داری کا سہارا لے کر عبد دینار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مادہ پرستی، عیش کوشی، زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کرنا اور لذتوں کو حاصل کرنا اصل مرکز فکر و نظر بنا دیا گیا ہے۔ اس صورت حال میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، آخرت پر یقین، جنت دوزخ، قیامت، قبر و حشر، عبادات، ان تمام سے اولاً تو ایمان ختم ہو جاتا ہے یا پھر غیر معمولی انداز میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ علوم کا مطالعہ کر کے قرآن وحدیث اور فقہ و کلام کی روشنی میں انکا محاکمہ کیا جائے۔ اس وقت مغربی تہذیب کے محاکمے کا کام مختلف حلقوں میں جاری ہے۔ مگر ہم بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کے خالص علمی کام کا صحیح حق علماءِ کرام ہی ادا کر سکتے ہیں کہ وہ مغربی علوم کی اصل حقیقت و ماہیت کو جانیں اور ان کا اسلامی علوم کے تناظر میں جائزہ لیں، ان علوم کو قرآن وحدیث اور فقہ و کلام کے اصولوں پر پرکھیں تا کہ حق اور باطل میں امتیاز ہو جائے اور ہر سطح پر غلبہ دین ممکن ہو سکے۔ ہمارے پیش نظر ہے کہ مدارس دینیہ کے اساتذہ کرام، طلبہ، دینی تحریکات کے کارکنان کے لئے ایک ڈپلومہ کورس کا نصاب تیار کیا جائے جس میں درج ذیل مباحث کا احاطہ کیا گیا ہو:

☆ سرمایہ داری کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟

☆ سرمایہ داری کی بنیادی اقدار کیا ہیں؟

☆ مسلم معاشروں میں سرمایہ داری مغربی تہذیب کو کس طرح پروان چڑھا رہی ہے؟

☆ سرمایہ دارانہ معاشرہ اور ریاست کی ماہیت،

☆ سرمایہ دارانہ نظام کی اسلام کاری کن کن طریقوں سے ہو رہی ہے؟

☆ عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکا کا کردار،

☆ جمہوریت و دستوریت کا جائزہ،

☆ وہ قابل عمل علمی طریقہ کیا ہے جسے اختیار کر کے سرمایہ داری اور مغربی تہذیب کو شکست دی جا سکتی ہے؟

الحمدللہ! اس حوالے سے محترم جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب زید مجدہم کی زیر نگرانی دو مرتبہ ڈپلومہ

کورس کا انعقاد بھی ہو چکا ہے۔ دونوں مرتبہ مدارسِ عربیہ کے علماء و فضلا اور دینی جماعتوں کے کارکنان نے بھرپور انداز میں شرکت کی۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی اولین کوشش ہے جس کا نقشِ ثانی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ نقشِ ثانی کو مزید بہتر انداز میں اور نئے اضافوں کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ پہلے یہ کتاب محض دو حصوں پر مشتمل تھی مگر اب اسے چھ ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر باب کو علیحدہ عنوان سے دے کر اس کے تحت مضامین دیے گئے ہیں۔ بعض مضامین پڑھتے ہوئے شاید آپ کو تکرار کا احساس ہو مگر چوں کہ ان مضامین کو ایک خاص پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے، اس لیے ایک حد تک تکرار لازمی امر تھا، امید ہے کہ ناگوارِ خاطر نہ ہوگا۔ باب ششم گویا اس پوری کتاب کا حاصل ہے، جو "خصوصی مطالعہ" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس حصے میں جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری زید مجدہم کا خصوصی مقالہ بعنوان "عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش ایک نئے تناظر میں" شامل ہے، اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے سرمایہ داری پر نہایت بصیرت افروز نقد کیا ہے اور آخر میں اس خبیث نظام کے انہدام کی حکمت عملی کی طرف اشارات بھی دیے ہیں جو نہایت قابل توجہ ہیں۔ دوسرا مقالہ جناب علی محمد رضوی صاحب کا ہے جو "فلسفۂ یونان کا ابطال: امام غزالی کا طریقہ کار" کے عنوان سے شامل ہے۔ دراصل یہ مقالہ انگریزی میں تھا جسے جناب ریحان احمد صاحب نے انگریزی سے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ مقالہ بایں طور خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ ہم اس کے ذریعے جان سکتے ہیں کہ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے یونانی فلسفے پر کاری ضرب لگانے کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا اور اس کی روشنی میں ہم کیونکر نہ صرف سرمایہ داری کو شکست فاش دے سکتے ہیں بلکہ علومِ اسلامیہ کے غلبہ و نفاذ کی حکمت عملی بھی مرتب کر سکتے ہیں۔

ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ حاضر و موجود نظام جو کہ سرمایہ دارانہ نظام ہے کا گہری دینی بصیرت کے ساتھ تجزیہ و محاکمہ کرنے کی ضرورت اس سے قبل محسوس نہیں کی گئی۔ اگر کہیں ایسا ہوا بھی تو نہایت سرسری انداز میں۔ مغربی تہذیب کے بعض ظاہری آثار پر گرفت تو کی گئی مگر مغربی تہذیب کس طرح وجود میں آئی، اس تہذیب کو کن ذرائع اور کس علمیت نے پروان چڑھایا اس پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی۔ آج الحمدللہ ہمارے لیے یہ بات آسان ہو گئی ہے کہ ہم مغربی تہذیب جمہوریت و دستوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کا نہ صرف محاکمہ کر سکیں بلکہ ان کا باہمی ربط و تعلق واضح کر کے اس پر کلی حیثیت سے شرعی حکم بھی لگا سکیں۔

اس کتاب میں شامل لوازمہ اسی خواہش کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ ہم سرمایہ داری کو کماحقہ جان لیں اور پھر شہادت حق کا فریضہ انجام دینے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخر میں اپنے مہربان بھائیوں کا شکریہ بھی لازم ہے جن کی رائے، مشورہ اور معاونت قدم قدم پر شامل حال رہی ہے، جناب جاوید اقبال تاب صاحب، جناب سید محمد یونس قادری صاحب، جناب ادریس اسماعیل صاحب اور جناب امین اشعر صاحب خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ خصوصاً جناب جاوید اقبال تاب صاحب کہ انہوں نے نہ صرف کتاب کی نئی ترتیب و تدوین میں معاونت فرمائی بلکہ اس کا پروف پڑھ کر بہت بڑا بوجھ ہلکا کیا، اللہ تعالیٰ ان تمام بھائیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ہم اپنی پیشکش میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں، یقیناً اس میں بہت سی کوتاہیاں بھی رہ گئی ہوں گی اس سلسلے میں اہل علم کی آراء کا انتظار رہے گا۔

محمد احمد حافظ

مقدمہ

تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے
سرمایہ دارانہ نظام سے واقفیت کیوں ضروری ہے؟

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

موجودہ دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی نظام اقتدار کلیتاً معطل ہو گیا ہے، جو نظام زندگی غالب ہے وہ اسلامی نہیں...... اس نظام زندگی میں جو فیصلے کیے جاتے ہیں وہ غیر اسلامی علیت (سائنس اور سوشل سائنس) پر مبنی ہوتے ہیں اسلامی علیت (فقہ، تفسیر، حدیث، کلام اور تصوف) پر مبنی نہیں ہوتے۔ آج سائنس اور سوشل سائنس معتبر علیت ہے اور اقتدار معاشرہ اور ریاست کی ہر سطح پر انہی خواص کے پاس ہے جو سائنس، سوشل سائنس اور فلسفہ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور سائنس سوشل سائنس کی تعلیمات کے مطابق کاروبار زندگی چلاتے ہیں۔

سائنس اور سوشل سائنس کو علمی غلبہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ میں حاصل ہوا۔ سائنس اور سوشل سائنس نے عیسائی علیت کو شکست دی۔ اس جدید علیت کی بنیاد کلمہ لا الٰہ الا الانسان! ہے۔ سائنسی علیت کے مطابق زندگی کا مقصد ارادۂ خداوندی کی بجائے ارادۂ انسانی کو کائنات پر غالب کرنا ہے، یعنی انسان خود رب العالمین، خالق اور قائم بالذات ہے، وہ کسی ماوراء العقل ذات کا محتاج اور عبد نہیں ہے۔ وہ آزاد اور خود مختار ہے...... یہ سائنس اور سوشل سائنسز کی کلیدی ایمانیات ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام زندگی انہی ایمانیات کو عملی جامہ پہنانے کی ایک سعی ہے۔ درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام شخصیت، معاشرت اور ریاست کی وہ تنظیم ہے جو انسانی آزادی کا حصول ممکن بناتی ہے...... کس سے آزادی؟؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ رب العالمین سے،

انبیاء ورسل سے،

آسمانی ہدایت اور شریعت سے،

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ داری تمام ابراہیمی مذاہب سے جامع ترین بغاوت کا نام ہے۔

تحریکات اسلامی کے وہ تمام کارکنان اور مجاہدین اسلام جو تحفظ دین اور غلبۂ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان کا کلمہ ہے لا الٰہ الا اللہ...... وہ لا الٰہ الا الانسان کے فاسد اور جاہلانہ کلمے پر تعمیر شدہ نظام زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت یا باہمی تعلق کے سرے سے قائل نہیں۔

تمام تحریکاتِ اسلامی خواہ وہ مدارسِ دینیہ ہوں، خواہ دعوتی ہوں، خواہ انقلابی اور جہادی ہوں، تجدید و احیائے دین کی جدوجہد میں شامل ہیں۔ اسلامی تحریکات اور ماڈرنسٹ (Modernist) تحریکات میں یہی کلیدی فرق ہے۔ ماڈرنسٹ کسی نہ کسی درجے میں لا الٰہ الا الانسان کا قائل ہے، وہ سرمایہ دارانہ اساسی تصورات "آزادی"، "مساوات" اور "ترقی" کی اسلامی تعبیرات کرتا ہے۔ وہ فقہ، کلام، تصوف اور اصول تفسیر کی بنیاد پر ریاستی اور معاشرتی صف بندی کا قائل نہیں، وہ سائنس اور سوشل سائنسز کو معتبر علمیت گردانتا ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ تنظیم معاشرت اور سیاست کو معقول گردانتا ہے۔ وہ اسلامی تاریخ بالخصوص تعلیمات اسلامی اور سلطنتِ اسلامی سے برأت کا اعلان کرتا ہے، وہ کفارِ مغرب کی فکری، معاشرتی اور سیاسی روایات کی بنیاد پر اسلامی دنیا کی تشکیلِ نو کا پیامبر ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں اسلامیات کو سمونے کی کوشش کر رہا ہے، ہر ماڈرنسٹ دانستہ یا نادانستہ تجدید و احیائے دین کی تحریکات کا کھلا دشمن ہے۔

تحریکاتِ اسلامی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انہدام کی اقدامی جدوجہد کر رہی ہیں۔ ضروری ہے کہ تحریکات اسلامی کا ہر رکن اس فاسد و باطل اور خبیث نظامِ زندگی کی علمیت (جو کہ جاہلیت خالصہ ہے) اور عملیت سے واقف ہو۔ اس کتاب میں ہم نے سرمایہ دارانہ نظام کے تاریخی ارتقاء کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کوشش مدارسِ عربیہ کے طلبہ و اساتذہ اور تمام تحریکات اسلامی کے کارکنوں کے لیے مفید ثابت ہو۔

باب اوّل

سرمایہ داری کا تاریخی پس منظر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسائیت اور جدید یورپ کی ابتداء

کاشف علی شیخ

بنی اسرائیل کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے سرفراز کیا اور اس قوم کو دنیا کی امانت کا مقدس فریضہ سونپا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے غیر اسلامی افکار و خیالات کو اپنے مذہب میں جگہ دینی شروع کی اور چھوٹی چھوٹی بے اصل ظاہری باتوں میں پڑ کر بڑے بڑے اعلیٰ روحانی مقاصد سے غافل ہو گئے، روحانی ترقی سے زیادہ مذہبی رسوم و شعائر کو اہمیت حاصل ہوئی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہوئے لیکن قانون کا مرتبہ افضل قرار دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت سیاسی لحاظ سے بھی یہودی قوم منتشر ہو چکی تھی۔ بحیرۂ روم کے آس پاس کے ممالک میں ان کی مختلف نو آبادیاں قائم تھیں اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک میں بھی کافی تعداد میں موجود تھے بابل کی جلاوطنی کے اختتام پر تھوڑے بہت یہودی فلسطین میں دوبارہ آبسے تھے لیکن جلاوطن افراد کی اکثریت بابل میں مستقل قیام پذیر تھی۔ یروشلم رومی حکومت کا ایک صوبہ تھا جہاں رومیوں کی طرف سے ایک حاکم مقرر تھا۔ مادی اسباب کے لحاظ سے اس امر کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہودی پھر کبھی آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے یا غیر ملکی فرماں رواؤں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

ان تمام حالات اور زبوں حالی کا یہودیوں کو شدت سے احساس تھا اس لیے ان کی امیدیں مستقبل پر مرتکز تھیں اور وہ خداوند تعالیٰ کی راست مداخلت کے منتظر رہتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ وقت قریب ہے جب ظالمانہ بیرونی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا اور خداوند تعالیٰ بنی اسرائیل کو پھر ایک مرتبہ آزادی اور بالادستی کی نعمت سے سرفراز کرے گا۔ اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو ایک ایسی عالمگیر قوت اور سلطنت حاصل ہوگی جو ہمیشہ قائم رہے گی اور یہ وہی سلطنت ہوگی جس کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا تھا۔

یہ وہ حالات تھے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام یروشلم کے قریب ایک مقام بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور اصلاح سے قبل حضرت یحییٰ علیہ السلام نے روحانی پیغام کی اشاعت شروع کی۔ انہوں نے لوگوں کو خبردار کیا کہ مسیح (نجات دہندہ) کی آمد قریب ہے اسی دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کی تعلیمات بھی وہی تھیں جو کہ بنی اسرائیل کی طرف وقتاً فوقتاً مختلف پیغمبر لائے تھے وہ کوئی نیا دین یا کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ بلکہ بنی اسرائیل کے غیر اسلامی افکار و خیالات کو صاف کر کے ان کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی کو بنانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے بہت سے بگڑے ہوئے اعمال اور اخلاق پر اعتراض کیے اور وہ غیر ضروری پابندیاں جو انہوں نے خود اپنے اوپر لگا رکھی تھیں انہیں ان سے آزاد کرانے کی جدوجہد کی۔ لیکن یہ تعلیمات ایسی نہ تھیں جن سے مذہبی طبقات اور سیاسی حکمرانوں کو اطمینان قلب حاصل ہوتا بلکہ انہوں نے ان تعلیمات کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے اپنے تئیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے ڈیڑھ یا تین سال بعد صلیب دے دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سحر انگیز شخصیت اور لوگوں کے بعض روحانی تجربات نے ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ان کے پیروؤں کے اندر اس یقین کو پیدا کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے اور آسمانی بادشاہت کا آغاز کریں گے حالانکہ یہ آسمانی بادشاہت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی نشان دہی تھی جس کی خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دی تھی۔ چنانچہ اس غلط فہمی کا شکار ہونے کے بعد یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور ثانی کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں جن لوگوں سے بھی بات چیت کا موقع ملتا انہیں آنے والے دور کی برکات سے آگاہ کرنے میں پس و پیش نہ کرتے۔ چونکہ یہ دعوت اپنے وقت کی جامع ترین دعوت تھی اس لیے اسے عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان مبلغوں کی دعوت کا اثر یہ ہوا کہ مقامی یہودیوں کے ساتھ ساتھ یونانی یہودی بھی اس دعوت سے متاثر ہونے لگے جن کی زبان یونانی تھی اور جن پر یونانی تہذیب اور خیالات کا اثر غالب تھا ان یونانی پیروان مسیح نے فلسطین سے باہر بھی اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی اور ایک علیحدہ مذہب کی حیثیت سے عیسائیت کی بنیاد ڈالی۔

عیسائیت کے پھیلاؤ کی دوسری وجہ پال (Paul) تھا اس نے روم میں عیسائیت کی باقاعدہ منظم تبلیغ کی جس کی وجہ سے وہاں عیسائیت کی مقبولیت توقع سے زیادہ ہوئی یہ عیسائی گروہ یہودیوں کی مذہبی اور فقہی پابندیوں کا قائل نہ تھا اور ان کو صرف عبرانی النسل یہودیوں کے قومی شعائر قرار دیتا تھا چنانچہ انہوں نے یہودیت کے رسم و رواج اور مذہبی قوانین کی پابندیوں کو تمام انسانوں کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔ بلکہ مقامی قوانین اور رسم و رواج کو قانونی جواز فراہم کر کے مذہب کو قومی شکل میں تبدیل کر دیا۔

قدیم یونانی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو طبیعیات، ریاضیات اور علوم و فلسفہ کا یہ وسیع ذخیرہ فراہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے والا ملک بیشتر حصے میں بت پرستی اور ستارہ پرستی واقع ہوا اور صدہا توہمات اور خرافات میں گھرا ہوا تھا اور ہر طرف دیوی دیوتاؤں اور ہیاکل کا جال بچھا ہوا تھا۔

ان حالات میں جب پال کے نظریات کا ٹکراؤ یونانی فکر و خیالات سے ہوا تو عیسائیت کے نام پر دین و شرک کا ایک ملغوبہ تیار ہوا۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

''عیسائیوں نے دو ادیان کو ملا کر ایک دین بنایا۔ ایک انبیاء موحدین کا دین اور ایک مشرکین کا دین۔ ان کے دین میں ایک حصہ تو انبیاء کی تعلیمات کا ہے اور ایک حصہ ان اقوال و افعال کا ہے جو انہوں نے مشرکوں کے دین سے لے کر شامل کیے ہیں اس طرح انہوں نے اقانیم (Trinity) کے الفاظ ایجاد کیے جن کا انبیاء کے کلام میں کوئی ذکر نہیں ملتا اس طرح انہوں نے مجسم اور سایہ دار بتوں کی جگہ وہ بت ایجاد کیے جن کا سایہ نہیں اس طرح آفتاب اور چاند کی طرف نماز پڑھنے، موسم بہار میں روزہ رکھنے کو دین میں داخل کیا تا کہ دین شرعی اور امر طبعی دونوں کو وہ جمع کر لیں۔''

ابتداء میں مسیح کے پیروں کا عقیدہ مسیح کا ظہور ثانی اور آسمانی فرمانروائی تھا اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ نہیں دیتے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا چلا گیا ان کی امیدیں مایوسیوں میں بدلتی گئیں اور عیسائیوں میں یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی موت سے انسانیت کا کفارہ ادا کر کے اس کی روحانی نجات کا راستہ ہموار کر دیا اور ان کو ماننے کے ساتھ ہی انسان گناہوں کی آلائش سے پاک ہو کر آسمانی بادشاہت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے لیے باپ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو خدا سے قریب سمجھے اور مشکل میں اس سے نصرت کی توقع رکھے لیکن مسیح کی غیر معمولی شخصیت کے زیر اثر ایک نجات دہندہ اور مسیح کے ظہور ثانی، مسیح کے ساتھ یہودیوں نے جو ظالمانہ برتاؤ کیا اس کا ردعمل اور سب سے بڑھ کر یونانی مذہب کے ان تصورات نے کہ دیوتا انسانی جسم میں حلول کر سکتا ہے نے آسمانی باپ کے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ مسیح واقعتاً اللہ کے بیٹے ہیں۔ چونکہ اللہ نے اپنی مقدس روح کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم میں داخل کر کے نجات انسانی کے لیے دنیا میں بھیجا۔ اس لیے یہیں سے نظریہ تثلیث نے جنم لیا یعنی باپ، بیٹا اور روح قدس جو تینوں خدائی میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ روح قدس کا فلسفہ بھی یونانی تصور (LOGOS) سے عیسائیت میں داخل ہوا۔

عیسائی اعتقادات کے مطابق چونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اور اس کی بدولت جنت بدر ہوئے تھے لہٰذا ہر انسان کو

آدم علیہ السلام کا گناہ وراثت میں ملتا ہے اور اس کی روح خبیث ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ نے اپنے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو جو خود خدا بھی ہے دنیا میں بھیجا اور انہوں نے صلیب پر جان دے کر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ چنانچہ جو کوئی عیسائیت قبول کرے گا نجات پائے گا۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''اس مذہبی سمجھوتے میں عیسائیوں نے حضرت مسیح اور انبیاء کی پیروی نہیں کی بلکہ ایک نیا عقائد نامہ تیار کیا جس کا انبیاء کے کلام میں کوئی سراغ نہیں ملتا نیز حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے کلام میں کہیں اللہ کے اقانیم کا ذکر نہیں ملتا اور نہ کہیں صفات ثلاثہ کا ثبوت ہے اور نہ کہیں صفت الٰہی کو ابن اللہ یا رب کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور نہ اللہ کی حیات کو روح کہا گیا ہے اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک فرزند ہے۔ وہ اپنے باپ کے جوہر سے ہے اور وہ بھی اسی طرح خالق ہے جیسے کہ اللہ خالق ہے۔

اسی طرح سے اور وہ دوسرے اقوام جو مختلف اقسام کفر پر مشتمل ہیں کسی پیغمبر سے منقول نہیں۔'' اس طرح جو تعلیمات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہدایت و نجات کے لیے لائے تھے وہ ان یونانی اور رومی افکار و خیالات اور پاپاؤں کے مفادات کے درمیان گم ہو گئیں۔

اس طرح عیسائیت کے دو نظریات نے یورپ میں لادینی تہذیب کے ارتقاء میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انسانیت میں خدا کی ذات اور صفات کے حلول کا عقیدہ آگے چل کر انسان پرستی (HUMANISM) کی بنیاد بنا ہیومنزم اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ انسان خدا کی صفات اپنا کر خدائی اختیارات (Powers) حاصل کر سکتا ہے۔ خدا کوئی ماورائے کائنات ہستی نہیں بلکہ محض چند ایسی صفات کا مجموعہ ہے جو انسان اور کائنات کی دیگر اجسام میں حلول کر سکتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان خدا بن سکتا ہے تو پھر انسان کا یہ اختیار کہ خیر و شر کے معیارات اور زندگی گزارنے کے طریقے خود مروج کرے تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یورپی عیسائیوں نے ہیومنزم کے اس دعوے کو پہلے جزوی طور پر اور بالآخر کلی طور پر قبول کر لیا Saint Augestine نے خدائی بادشاہت (City of God) کی ناگزیر ہم آہنگی (neccasary coexistance) پر زور دے کر سیکولرازم کی راہ ہموار کی خدا کی بادشاہت فطری قوانین (Natural Laws) کے ماتحت ہے اور نیت اور عقیدہ کی دنیا پر نافذ ہے انسانی بادشاہت کا تعلق اعمال اور ظواہر سے پہلے ہے اور یہاں انسانی قانون (Human law) دراصل رومن قانون کی حکمرانی ہے چونکہ ایک مضبوط سلطنت ایک مضبوط کلیسائی نظام کے لیے ناگزیر ہے لہٰذا خدائی بادشاہت اور انسانی بادشاہت لازم و ملزوم ہیں اور شہنشاہ (Holy Roman Empirer) کی سیکولر حکمرانی (Soverignity) کو پوپ کی تصدیق حاصل ہونا چاہیے اس فلسفے کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ خدائی بادشاہت کا دائرہ محدود اور انسانی بادشاہت کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا حتیٰ کہ (Augestine) تقریباً ایک ہزار سال بعد Saint Aequnas نے خدائی بادشاہت کے دائرہ کار کی تجدید کو لادینی عقلیت (Rationality bounded by desire) کی بالادستی کو تسلیم کرکے جواز فراہم کیا۔

سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح سے پہلے پوپ کی مرکزی حیثیت تھی جو عیسائی دنیا کا روحانی پیشوا تھا اور پوری رومن امپائر اس کے ماتحت تھی بائبل کی تشریح کا حق بھی صرف چرچ کو حاصل تھا اور آخرت سنوارنے کا اگر کوئی سامان کرسکتا تھا تو وہ بھی چرچ ہی تھا۔

دوسرے نمبر پر رومن فرمانروا تھا جو حکومتی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا اور تیسرے نمبر پر وہ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے نواب تھے جو پوری رومن سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے یہ وہ پس منظر تھا جس میں لوتھر نے تحریک اصلاح شروع کی۔ یہ تحریک مکمل طور پر مذہبی جذبے سے سرشار ہوکر شروع کی گئی تھی اور اس وقت کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ یہ تحریک آگے چل کر لبرل ازم کے ارتقاء کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوگی۔ ابتداء میں یہ تحریک ایک سیاسی جدوجہد تھی لیکن اس کے نتیجے میں صدیوں کے تعمیر شدہ سیاسی معاشی اور معاشرتی افکار وخیالات تبدیل ہوکر رہ گئے۔

نیشنلزم:

نیشنلزم کے لیے بنیادی جواز تحریک اصلاح نے فراہم کیا چونکہ یہ تحریک بنیادی طور پر پوپ اور چرچ کے ادارے کے خلاف برپا کی گئی تھی چنانچہ اس کے نتیجے میں ہر فرد کو بائبل کی تشریح کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا اس کے علاوہ حکومت کے تیسرے ستون یعنی نواب اتنے طاقتور ہوگئے کہ رومن ریاست اور چرچ دونوں کے لیے خطرہ بن گئے لہٰذا ان دونوں کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی۔ اور مذہب قوموں کے لحاظ سے تقسیم ہوگیا۔ نتیجتاً قومی روایات کو تقدس فراہم ہوا اور مذہبی رسوم اور رواج پامال ہوئے اور پورے یورپ میں آزادی اور مساوات کی لہر دوڑ گئی اور مختلف ریاستوں نے جنم لیا۔

سیکیولرازم:

تحریک اصلاح کے نتیجے میں آزادی اور مساوات کے جذبے کو عام لوگوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ آگے چل کر اسی جذبے نے پورے عیسائی معاشرے پر ضرب لگائی ہر چیز کو عقل کے پیمانے پر رکھ کر ناپا اور سمجھا جانے لگا۔ اگر ہر شخص اور گروہ کا یہ حق تسلیم کرلیا جائے کہ وہ خدائی احکامات بائبل کی جو چاہے تشریح کرسکتا ہے تو یہ دراصل اس بات کا اقرار ہے کہ وہ تمام معیارات اور پیمانے جن کی بنیاد پر یہ تشریح کی جارہی ہے یکساں ہیں اور مساوی

قدر (Equal Value) رکھتے ہیں۔ آزادی اور مساوات کی بالادستی دراصل تمام خواہشات کی یکساں اہمیت کا اقرار ہیں۔ جب کوئی معاشرتی آزادی اور مساوات کو اپنے اخلاق کی بنیاد قرار دیتا ہے تو وہ دراصل معاشرتی عمل کا مقصد زیادہ سے زیادہ ایسی خواہشات کا حصول قرار دیتا ہے جو یکساں قدر کی گردانی جاتی ہیں۔ اس معاشرہ پر ایسی عقلیت غالب ہوتی ہے کہ خواہشات کے حصول کو مقدم رکھتی ہے۔ اور خواہشات کی اصل قدر کا تعین کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اسی کو Rationality bounded by desire کہتے ہیں۔ عیسائیت نے اسی قسم کی عقلیت کے یورپ میں غلبہ کی راہ ہموار کی۔ لیکن انسانی تاریخ نے یہ بات ثابت کی کہ عقل سے اقدار کے تعین اور ترتیب میں بہت کم مدد ملتی ہے مثلاً عقل سے ہم اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکتے کہ عورتوں اور مردوں کا بے تکلف میل جول مناسب بات ہے یا نہیں یا انسان کو اس دنیا میں لذت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے یا نہیں۔ مختصراً یہ کہ عقل کو اہداف کے حصول کا ذریعہ تو بنایا جاسکتا ہے لیکن عقل کی بنیاد پر اچھائی یا برائی کے معیارات قائم نہیں کیے جاسکتے۔ عقلیت کی اس کمزوری کا ادراک موجودہ دور کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تھا۔ اس دور میں عقلیت اور Reformed عیسائیت نے اس کا علاج سیکولرازم کو قائم رکھ کر کیا۔

سیکولرازم نے مجموعی طور پر انسانی زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک سماجی زندگی اور دوسری ذاتی زندگی۔ سماجی زندگی سے اس نے مذہب کو بالکل علیحدہ کردیا تھا اور اس کی جگہ عقلیت کی بالادستی تسلیم کرلی تھی۔ دوسرا حصہ جو انہوں نے ذاتی زندگی کے نام سے رکھا تھا اس میں عقلیت اور ریاستی نظام کو بے دخل کردیا تھا اور اس کی جگہ مذہب کو دے رکھی تھی۔ اس پورے نظام کے تحت مطلق العنان بادشاہت دو ڈھائی صدیوں تک قائم رہی۔

لبرل ازم: ۔

لبرل ازم سیکولرازم کتنا ہی مذہب بیزار نظام سہی پھر بھی اس نے زندگی کے ایک حصے میں مذہب کی گنجائش رکھی تھی۔ لبرل ازم درحقیقت اس سیکولر تقسیم کار کے خلاف بغاوت بن کر ابھری۔ لبرل ازم نے بھی اپنی بنیاد عیسائیت سے لی۔ چونکہ عیسائی مسیح کی الوہیت کے قائل تھے اسی عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام بیک وقت خالق ومخلوق، بندہ وخدا، محدود ولامحدود تھے۔ آگے چل کر اسی عقیدے کی بنیاد پر لبرل ازم نے ایک تہذیب کا روپ دھارا جس میں فرد بحیثیت فرد اپنا نظام زندگی خود طے کرنے کی آزادی رکھتا ہے نیکی اور بدی کے معیارات خود متعین کرسکتا ہے کسی اور کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ کسی فرد کو کوئی خاص طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرے یعنی وہ خود خدا بن سکتا ہے دوسرا نجات کا جو تصور عیسائیت میں پایا جاتا ہے اس کے تحت تو عیسیٰ علیہ السلام نے مصلوب ہوکر تمام انسانوں کے گناہ کا کفارہ ادا کردیا۔

چنانچہ ہر فرد کی اخلاقی حیثیت برابر ہوگئی پھر لبرل ازم نے نجات کو ان معنوں میں بھی لیا کہ جب انسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تسخیر کائنات کرے گا تو سارے دکھ درد، رنج والم، مصائب ومشکلات وغیرہ سب مٹ جائیں گے اور دنیا میں انسان کو نجات مل جائے گی اور تسخیر کائنات کا مطلب قانون فطرت پر بھی مکمل قبضہ ہے یعنی دن رات، بارش، ہوا حتیٰ کہ ایک مغربی فلسفی کے مطابق ترقی کا وہ دور بھی آنے والا ہے جب انسان موت پر بھی قابو پالے گا۔

اس پورے عقیدے کو بنیاد بنا کر Kant نے انسانیت کا ایک تصور پیش کیا جو لبرل ازم کے بنیادی تصورات میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ Kant فرد کو بحیثیت فرد اس بات کا مجاز سمجھتا ہے کہ وہ اپنے لیے خود نظام زندگی تجویز کرے اور ہر فرد جو نظام زندگی اپنے لیے منتخب کرتا ہے وہ اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا وہ نظام زندگی جو دوسرا کوئی فرد اپنے لیے منتخب کرے مثلاً ایک شخص جو اپنا مقصد یہ ٹھہراتا ہے کہ وہ ایک مربع میل کے علاقے میں موجود گھاس کے پتوں کو گنے گا اور دوسرا شخص اپنا مقصد یہ ٹھہراتا ہے کہ اتنے علاقے میں وہ کوئی منشیات کا کاروبار نہیں ہونے دے گا سوسائٹی کے لیے دونوں کے مقاصد یکساں طور پر قابل احترام ہے۔

بنیادی طور پر لبرل ازم کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کا جو جی چاہے وہ کرے لیکن اس حد تک کہ جہاں آپ دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہوں یعنی آپ اپنا مکا وہاں تک گھما سکتے ہیں جہاں دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے غرض عیسائیت نے موجودہ لبرل تہذیب کی تعمیر اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔

سول سوسائٹی کا تاریخی پس منظر

علی محمد رضوی

پاکستان میں سول معاشرے کا قیام استعماری حکمت عملی کا اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق سنٹر کی سالانہ رپورٹ برائے 1999ء میں اس حکمت عملی کی تفصیل بتائی گئی تھی جس کے ذریعہ پاکستانی معاشرہ کو سول معاشرہ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ پاکستان میں سول معاشرہ کے قیام کا مقصد دراصل اسلام کا خاتمہ ہے۔ اسلام کو ختم کرنے کے دو طریقے ہیں:

ا۔ اسلام کو یکسر رد کر دیا جائے۔

ب۔ اسلام کی اس تعبیر کو نہ مانا جائے جس پر امت کا اجماع ہے بلکہ اسلام کی لبرل تعبیر کی جائے جس کے نتیجہ میں اسلام خدا کی منشا اور مرضی کے حصول کا ذریعہ نہ رہ جائے بلکہ افراد، یا قوموں کی خواہشات کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔

جدیدیت میں پہلے اجماع کو رد کیا جاتا ہے:

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس سلسلہ میں دوسرا راستہ پہلے استعمال کیا جائے گا جدیدیت کو مقبول بنانے کا طریقہ اجماع کا انکار ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک عرصہ گزرنے کے بعد اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ مذہب کو یکسر طور پر رد کیا جاسکے۔ یورپ میں رد عیسائیت کی تحریکوں میں شروع شروع میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ عیسائیت کا براہ راست انکار کرسکیں۔ ان تحریکوں نے اوّل اوّل جس چیز کا رد کیا وہ عیسائیت نہیں تھی بلکہ عیسائیت کی اجتماعی تعبیر تھی۔ عیسائیت کی اجتماعی تعبیر کو رد کرنے کے لیے عیسائیت کی لبرل تعبیر کی گئی جس کے نتیجہ میں عیسائیت خدا کی مرضی اور منشا معلوم کرنے کا ذریعہ نہ رہی بلکہ افراد اور قوموں کی خواہشات کے حصول کا ذریعہ بن گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک اصلاح عیسائیت کی لبرل تحریک:

عیسائیت کی اس لبرل تعبیر کو تحریک اصلاح کا نام دیا گیا ہے۔ عیسائیت کی اس لبرل تعبیر کے نتیجہ میں دو سو سال کے اندر اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے کہ عیسائیت کو یکسر رد کیا جا سکے۔ تحریک اصلاح کے بانی مارٹن لوتھر نے 16 ویں صدی کے وسط میں عیسائیت کی اجتماعی تعبیر کو رد کرنے کی بات شروع کی۔ اس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ انجیل مقدس کو سمجھنے کے لیے کلیسا کا اجماع، روایات اور ادارے ضروری نہیں ہیں بلکہ ہر شخص اور ہر گروہ اور قوم اپنے ضمیر، خواہش اور عقل کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ 19 ویں صدی کے وسط میں یورپی مفکرین خدا کا کھل کر انکار کر سکیں۔ اس کی ایک مثال ''نطشے'' کا یہ اعلان ہے کہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ خدا مر چکا ہے۔ لوگوں نے کہا ہے اور سچ کہا ہے کہ نطشے اس سلسلہ کا منطقی انجام تھا جس کا آغاز لوتھر نے کیا تھا۔ اسی نطشے کے بارے میں اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

سول معاشرہ مذہبی معاشرے کے ملبے پر قائم ہوتا ہے:

سول معاشرہ کا تصور مغرب سے ہمارے یہاں آیا ہے۔ یورپ میں مذہبی معاشرے کو تباہ و برباد کر کے سول معاشرہ قائم کیا گیا۔ ان معنوں میں سول معاشرہ کا تصور مذہبی معاشرہ کی عین ضد ہے۔ سول معاشرہ ایک بے دین معاشرہ ہوتا ہے۔ جس طرح مغربی فکر مذہبیت سے بے دینی کی طرف ایک تدریج کے ساتھ گامزن ہوئی کہ پہلے تو مذہب کا ایک لبرل تصور پیش کیا گیا اور اس کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ خدا کا براہ راست رد کیا جا سکے اسی طرح مذہبی معاشرے سے سول معاشرہ کی طرف سفر ایک تدریج کے ساتھ طے ہوا ہے۔ اسی طرح سول معاشروں کے لیے جو فکری اور فلسفیانہ جواز فراہم کیے گئے ان میں بھی ہمیں تدریج کا یہ عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ زیر نظر سلسلہ مضمون میں ہم یورپ میں مذہبی معاشروں کی تباہی اور سول معاشرہ کے مقام اور سول معاشروں کے لیے پیش کیے گئے جوازات کا تاریخی اور فکری جائزہ پیش کریں گے۔ اس جائزہ کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں سول معاشرہ کو قائم کرنے کے لیے کی جانے والی مختلف کوششوں کو ان کے صحیح تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ کے آخری مضمون میں پاکستان میں سول معاشرہ کے قیام کی کوششوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور ان کے سدباب کے لیے ابتدائی تجاویز کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ازمنہ وسطیٰ کے مذہبی معاشروں کا قیام کے دو اصول:

قرون وسطیٰ کے مذہبی معاشرے جن اصولوں پر قائم تھے وہ بنیادی طور پر دو تھے۔

ا۔ حاکمیت کی سند اور جواز مذہبی تھی۔ اس جواز کا ابتدائی خاکہ سینٹ آگسٹائن Saint Augustine نے پیش کیا۔ اس نے اپنی کتاب City of God میں خدا کے شہر اور آدمی کے شہر کی ہم موجودیت کی دلیل پیش کی۔ خدا کے شہر پر پوپ اور چرچ کی حکمرانی ہو گی جب کہ آدمی کے شہر پر بادشاہ کی حکمرانی ہو گی۔ دنیاوی اور دینی قیادت کی یہ تفریق اس لحاظ سے مذہبی تھی کہ اس تقسیم کا جواز مذہبی تھا اور ایک مذہبی سند نے تجویز کیا تھا۔ اس کا مماثل نظام ہمارے زمانے میں سلطنت سعودیہ کے قیام کے وقت آل شیخ اور آل سعود کے درمیان مذہبی اور دنیوی اقتدار کے درمیان تقسیم کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ موخر الذکر ایک سیاسی معاہدہ ہے جس کا مذہبی جواز کبھی بیان نہیں کیا گیا جب کہ اول الذکر کا مذہبی جواز تفصیلاً فراہم کیا گیا تھا۔ اس نظام کو عموماً سیکولرازم کی ایک شکل سمجھا گیا ہے لیکن یہ نظام ان معنوں میں سیکولرازم نہیں تھا کہ اس میں زندگی کے کسی شعبہ کو مذہب کی دسترس سے باہر نہیں رکھا گیا تھا۔ مذہبی اور دنیاوی امور کی نظری تفریق اور بعد میں بڑھتی ہوئی عملی تفریق کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کے پاس اپنا قانون یعنی فقہ نہیں تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو رد کر کے دوسری صدی کی عیسائیت نے اپنی موت کا پروانہ اپنے آغاز میں ہی لکھ دیا تھا۔]

عیسائیت کی تباہی کا سبب: علم فقہ سے محرومی:

عیسائیت کی تباہی اور گمراہی کی بنیادی وجہ شریعت موسوی کا انکار تھا۔ شروع میں کچھ عرصہ تک عیسائیت کے ایک فرقہ جسے ''ناصریہ'' کہا گیا ہے [قرآن مجید میں انہیں کو نصاریٰ کہا گیا ہے] شریعت موسوی کو ترک کرنے سے انکار کیے رکھا اور ایک عرصہ تک تعذیب و تضحیک کا شکار رہے۔ لیکن بالآخر اس گروہ کے زیادہ تر افراد کو عیسائی اکثریت نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس ناصریہ [Nazarenes] فرقہ کی وہ باقیات جنہوں نے عیسائی اکثریت کے اندر ضم ہونے اور شریعت موسوی کو ترک کرنے سے انکار کیا۔ یہ فرقہ عیسائی تاریخ میں [Ebionitrs] کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے گروہ نے تقریباً تین سو سال تک استقامت کے جادہ پر اپنے آپ کو گامزن رکھا اور اس دوران عیسائی اکثریت اور یہودیوں کے ظلم و ستم کا یکساں شکار رہے۔ [دوسروں کے علاوہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب The Dicline and Fall of the Roman Empir میں ان دونوں فرقوں کا مختصراً ذکر کیا ہے]۔ بادشاہ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا جواز مذہب میں ہی تلاش کرتے تھے۔ قرون وسطیٰ کے بادشاہ عمومی طور پر یورپ کے مذہبی قائد ''پوپ'' کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ بادشاہوں کے الوہی اختیارات کے عقیدے کا تصور عام خیال کے برعکس قرون وسطیٰ کی تہذیب میں موجود نہیں تھا۔ یہ خیال سب سے پہلے تحریک اصلاح نے پیش کیا تھا اور یہ خیال بھی بعد میں موجودہ قوم پرستانہ ریاستوں کی بنیاد بنا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چرچ کے مقابلے میں انسان کی خودمختاری:

لوتھر اور پروٹیسٹنٹ تحریک نے ایک طرف تو چرچ کے مقابلہ میں انسان کی خودمختاری کا پرچار کیا لیکن دوسری طرف اس نے دنیاوی حکومتوں اور حکمرانوں کی مکمل تابعداری کے عقیدہ کو فروغ دیا۔ لوتھر کے خیال میں دنیاوی حکومتوں اور قوانین کی پیروی اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر نظام دنیوی کا قیام اور تسلسل ناممکن ہو جائے گا۔ کیوں کہ بصورت دیگر:

"every one would become a judge against the other, no power no authority, no law or order would remain in the world; there would be nothing but murder and bloodshed" [Admonition to peace]

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس دلیل کی بنیاد پر دنیاوی سند کو قبول کرنا لازمی ٹھہرتا ہے اسی سند کی بنیاد پر دینی سند کو قبول کرنا کیوں لازمی نہیں ٹھہرتا؟ ظاہر ہے کہ لوتھر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

لوتھر نے دنیا کو دین کی میزان سے خارج کر دیا:

کیتھولک چرچ نظری طور پر بھی عملاً بھی دنیاوی سند کا محاسبہ کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتا تھا لیکن لوتھر اس کو رد کرتا تھا۔ لوتھر کے خیال میں اس کا فیصلہ کرنا کہ دنیاوی نظام، نظام عدل ہے یا غیر عدل ہے خدا کا کام ہے اور ظاہر ہے کہ خدا زمین پر اتر کر اس کا فیصلہ نہیں کیا کرتا اس لیے دنیاوی نظام کو جانچنے کا کوئی پیمانہ اس نظام کے اپنے پیمانوں کے سوا نہیں ہو سکتا ہے۔ لوتھر لکھتا ہے۔

"What is the justice of the world other than every one does what he owes in his estate, which is the law of his own estate; the law of man or woman, child, servant or maid in the house, the law of the citizen or of the city in the land" [Werke]

پوچھنے والا لوتھر سے یہ پوچھنے کی تمنا کر سکتا ہے کہ اس کی اپنی دلیل ہی کی بنیاد پر کیتھولک چرچ کے نظام کو جانچنے کا پیمانہ پروٹیسٹنٹ تعلیمات نہیں ہو سکتیں سو وہ کس بنیاد پر کیتھولک چرچ کے خلاف اپنی تیشہ زنیوں کو جائز قرار دیتا ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب کی توقع لوتھر سے رکھنے والا شاید تہذیبوں کی حرکیات سے بالکل بے خبر ہے۔

بادشاہ اس زمین پر خدا ہے اس کی اطاعت فرض ہے: لوتھر

اسی دلیل کی بنیاد پر لوتھر دنیاوی سند کے خلاف بغاوت کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

"the fact that the authority is wicked and unjust does not excuse tumult and rebellion. For it is everyone who is competent to punish wickedness, but only the wordly authority which wields the authourity" [Admonition to peace]

لیکن خود اس سند کو پرکھنے اور جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کیوں کہ سند کو جانچنے کا پیمانہ خود سند کے اندر ہی مضمر ہے اس کے باہر نہیں ہے۔ سند خود اپنے آپ کو کیوں کر مورد الزام ٹھہرائے گی؟ پھر لوتھر اس دلیل کو صرف دنیاوی سند کے حوالے سے ہی برتتا ہے دینی سند کے لیے اس کی اپنی سند موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوتھر کے خیال میں خدا کی مرضی یہی ہے کہ دنیاوی سند کی ہر حال میں مکمل تابعداری کی جائے۔ بادشاہ کے باغیوں کے لیے نہ اس دنیا میں کوئی رحم ہے نہ آخرت میں ان پر کوئی رحم کیا جائے گا۔

"Mercy is neither here nor there; we are now speaking of the word of God, whose will is that the king be honoured and rebels ruined, and who is jet surely as merciful as we are... if you desire mercy do not become mixed with rebels, but fear authourity and good" [An open letter on the harsh book against the Peasent]

پروٹسٹنٹ ازم یوروپ میں قوم پرستی کی بنیاد ٹھہرا:

لوتھر نے اس طرح بادشاہوں کے الوہی اختیارات کا تصور پیش کیا اور یہی یورپ میں قوم پرستی کی بنیاد بنا۔ یہ نظریہ جدیدیت کی بنیاد ہے اس کا تعلق نہ تو عیسائیت سے ہے نہ اسلام سے اور نہ ہی مشرق و مغرب کی پرانی تہذیبوں سے ہے۔ یہ صرف لوتھر کا کارنامہ ہے اور اس پر مارکس سے بہتر تبصرہ کسی نے نہیں کیا ہے۔

لوتھر کی دین دشمنی پر مارکس کا تبصرہ:

"Luther, without question, defeated servitude through devotion, but only by substituting servitude through conviction. He shattered the faith in autourity, by restoring the authourity of faith... He freed man from external religousity by making religousity the innermost essence of the man" [Introduction to the critique of hegel's Philosophy of Right].

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشی اور پیداواری عمل کا مقصد صرف ضرورت پورا کرنا تھا:

لوتھر کے بعد اس کا مقصد بڑھوتری برائے بڑھوتری ہو گیا:

الف۔ مذہبی زندگی کو انسان کی اندرونی زندگی تک محدود کر کے لوتھر نے اسے تاملات اور تفکرات کا بے ضرر کھیل بنا دیا۔ مذہب کے خارجی مظاہر، اس کے نظام کو منہدم کرنے کے بعد دنیاوی سند کی مطلق العنانیت کا نظریہ ایک منطقی اور واحد موجود حل کے طور پر باقی بچ رہا تھا۔

ب۔ معاشی اور پیداواری عمل کی بنیاد ضرورت تھی۔

زہد و فقر کی معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت کا فرق؟

معاشی عمل میں شرکت اس لیے کی جاتی تھی، اور پیداواری عمل کو اس لیے روبہ عمل لایا جاتا ہے کہ اس کی مدد سے انسان کی ضرورت اور استعمال کی اشیاء پیدا کی جا سکیں اور انہیں بہم پہنچائی جا سکیں۔ معاشی عمل اور پیداواری عمل خود مقصود نہیں تھا بلکہ مقصود حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ منافع بھی صرف اس حد تک حاصل کیا جا سکتا تھا اور جائز سمجھا جاتا تھا جہاں تک وہ ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ منافع برائے منافع یا غیر محدود منافع جو بعد میں جا کر بڑھوتری برائے بڑھوتری [Accumulation for The sake of accumulation] شکل اختیار کرتا ہے، قرون وسطیٰ معیشت کے لیے اجنبی تصور تھا۔ جس معیشت کی بنیاد ضرورت اور استعمال کی بنیاد پر رکھی جاتی ہے اس معیشت کو ہم زہد، قناعت اور فقر کی معیشت کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جس معیشت کی بنیاد بڑھوتری برائے بڑھوتری کی بنیاد پر رکھی جاتی ہے ایسی معیشت کو ہم سرمایہ دارانہ معیشت کا نام دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کسی بھی معاشرے میں اس وقت قائم ہوتی ہے جب اس معاشرے میں زہد، قناعت اور فقر ختم ہو جائے اور اس کی جگہ حرص وحسد عام ہو جائے۔ کسی بھی معاشرے میں حرص وحسد کی عمومیت کا نام ہی سرمایہ داری ہے۔ قرون وسطیٰ میں عیسائیت نے معاشرے میں زہد وقناعت اور فقر کو فروغ دینے اور حرص وحسد کو روکنے کے لیے جو نظام تشکیل دیا تھا اس کے تین اہم ستون تھے۔ [اس مضمون میں ہم انگلستان کو بطور حوالہ لیں گے۔]

ا۔ حرص وحسد کو روکنے کے لئے شہروں اور قصبوں میں گلڈز کا نظام:

یہ گلڈز پیشہ ور انجمنوں کے طرز پر بنائی گئی تھیں اور ان کا بنیادی مقصد قیمتوں پر قابو رکھنا تھا۔ یہ گلڈز پیشہ ور لوگوں اور کاروباری حضرات کے درمیان عیسائی معاشی تعلیمات اور کلیسا کے کاروباری قوانین کے عمل کو یقینی بناتی تھیں۔ ان گلڈز کا سربراہ عمومی طور پر کوئی عیسائی بزرگ [Saint] ہوتا تھا۔

برعظیم پاک و ہند اور انگلستان کا جاگیردارانہ نظام: تقابلی مطالعہ:

ب۔ دیہی سطح پر قرون وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام تھا۔ عام خیال کے برعکس مجموعی طور پر یہ نظام، نظام عدل تھا اور عیسائی اخلاقی تعلیمات اور کلیسا کے قوانین کا پابند تھا۔ ہمارے ہاں جس جاگیردارانہ نظام سے لوگ واقف ہیں وہ قرون وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام نہیں ہے بلکہ وہ اس جاگیردانہ نظام سے واقف ہیں جو اس عیسائی نظام کے کھنڈرات پر تعمیر ہوا تھا۔ ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کے بارے میں لوگ علمی حقائق کا بہت کم ادراک رکھتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کے بارے میں ہمارے ہاں تحریریں عموماً Polemical اور حقائق سے دور ہیں۔ مثلاً عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغل دور کا نظام جاگیردارانہ نظام تھا حالانکہ اس کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو جاگیردارانہ نظام کے تاریخی تصور سے بالکل نابلد ہو۔ برصغیر پاک و ہند میں جاگیردارانہ نظام انگریزوں نے اپنے استعماری مقاصد کے حصول کے لیے مسلط کیا تھا اور اسے لبرل اور جدیدی انقلاب سے ماقبل کے عیسائی جاگیرداری نظام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ [جاگیرداری نظام کی بدلتی ہوئی تاریخی شکلوں کے بارے میں دیکھئے (Helen M.Cam, The Decline and Fall of English Feudalism)

② قرون وسطیٰ کے عیسائی جاگیردانہ نظام کی دو اہم خصوصیات تھیں:

ا۔ جاگیردار کے لیے زمین بنیادی طور پر منافع کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی۔ زمین بنیادی طور پر سیاسی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی علامت تھی۔ اور یہ صرف انگلستان تک محدود نہیں تھا بلکہ جہاں جہاں جاگیردارانہ نظام موجود رہا ہے وہاں وہاں زمین کو بنیادی طور پر معاشرتی، سیاسی ذمہ داری کی علامت سمجھا گیا ہے۔ زمین کو بنیادی طور پر منافع کا ذریعہ قرار دینا جاگیردارانہ نظام کے لیے ایک اجنبی چیز تھی۔ ''بیرانگٹن موز'' کے الفاظ میں دنیا کے ہر حصے میں جہاں جاگیرداری نے فروغ پایا ملکیت زمین و جاگیر مجرد ملکیت نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ بے شمار ذمہ داریوں کا بوجھ تھا جس کا شمار ممکن نہیں:

"In all parts of the world where feudelism grew up, the ownership of land was always burdened with a great variety of obligation to other persons."

ا۔ عزت واحترام کا معیار پیسہ و دولت نہیں تھی۔

۲۔ سخاوت، حسن سلوک عدل معیار عزت تھے۔

۲۔ معاشرتی قدر اور عزت کا معیار پیسہ اور دولت نہیں تھی۔ عزت کا معیار عدل کا نفاذ، سخاوت، ماتحت افراد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بہتر سلوک کرنا وغیرہ سمجھے جاتے تھے۔ معاشرتی اقدار اور ان کے درمیان ترجیحات کا تعین عیسائی تعلیمات کرتی تھیں۔ پیسہ دولت یا دھن اقدار کی ترجیحات کا پیمانہ نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ Tonney کے مطابق جاگیردارانہ نظام میں "متعدد قطعات زمین کا حاصل ہونا اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم تھا کہ ان سے منافع کس قدر حاصل ہوتا تھا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی کثرت معاشرتی اور سیاسی ذمہ داری میں اضافہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

قرون وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام عدل پر مبنی تھا:

کسان جاگیردار کی زمین پر کام کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے میسر ہوتے تھے جہاں نہ صرف وہ کاشت کرتا تھا بلکہ اس کاشت کا تنہا وارث بھی ہوتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے قطعات پر مشتمل زمین کو مشترک زمین کہا جاتا تھا۔ کسان اس زمین کے قانونی مالک نہیں تھے لیکن وہ اس بات کے حقدار تھے کہ اس پر فصل کاشت کریں، فصل کاشت کرنے کے بعد وہاں اپنے مویشیوں کو چرائیں، اور جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹ سکیں وغیرہ۔ تمام بڑے بڑے مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ قرون وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام، نظام عدل تھا۔ کسانوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات میسر تھیں اور وہ معاشی طور پر خوشحال تھے۔

عیسائی خانقاہیں غرباء کی مددگار و معاون تھیں:

ج۔ قرون وسطیٰ کے عیسائی نظام کا تیسرا ستون خانقاہوں اور چرچوں کا نظام تھا۔ چرچ عیسائیت کی علمیاتی برتری کا محافظ اور فروغ دہندہ تھا۔ وہ اس سارے نظام کا نگراں بھی تھا۔ خانقاہی نظام وہ روحانی ماحول قائم رکھنے اور قائم کرنے کا ذمہ دار تھا جس میں زہد و قناعت پرورش پاتے تھے جب کہ حرص و حسد کا قلع قمع ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے معاشروں میں عمومی طور پر آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جاتی تھی۔ خانقاہوں نے غریبوں کی امداد کے لیے پورا نظام قائم کیا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں بے سہارا اور بے آسرا لوگوں کو مدد فراہم کی جاتی تھی۔ عیسائی بادشاہوں نے اس نظام امداد کو جاری وساری رکھنے کے لیے خانقاہوں کے نام بڑی بڑی جاگیریں وقف کی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے لیے عیسائیت اور چرچ کو شکست دینا انتہائی اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ سرمایہ دارانہ علمیت اور سرمایہ دارانہ اقدار کی فتح عیسائی علمیت اور عیسائی اقدار کی شکست کے بغیر ناممکن تھی۔

یورپ میں سول معاشرہ مذہبی معاشرے کے ملبے پر قائم کیا گیا:

یہ تھا قرون وسطیٰ کا مذہبی معاشرہ جس کو تباہ کرکے یورپ میں سول معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے پہلے کہ

بالترتیب ہم یہ دیکھیں کہ کس طرح اس مذہبی معاشرے کو بے دین [سول] قوتوں نے شکست دی، یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ عیسائیت کو یورپ میں اس تمام نظام عدل کے باوجود کیوں شکست ہوئی؟ اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔

عیسائیت نے بت پرستی اور جدید فکر سے سمجھوتہ کیا:

ا۔ اوّل خود عیسائیت اس کی ذمہ دار تھی۔ اس نے یورپ میں اپنے آپ کو قابل قبول بنانے کے لیے عقائد کے میدان میں بت پرستی اور یورپی فکر سے بنیادی مفاہمت اور سمجھوتا کرلیا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر مذہب کی بنیادوں کو کفر و شرک سے آلودہ کردیا۔ ظاہر ہے کہ عیسائیت کے تمام اچھے کاموں کے باوجود اس کا شرک اس کے زوال کا سبب بنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صرف اسلام ہی مغرب کی بت پرستانہ تہذیب کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس لیے مغرب کے مادہ پرستی سے بیزار تمام غیر مسلموں [بشمول عیسائیوں کے] کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

روم و یونان کی بت پرستی کے مداح عیسائیت کے قاتل تھے:

ب۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کے غلبہ کے باوجود یورپ میں ایسے لوگ ہمیشہ اچھی خاصی تعداد میں موجود رہے جو عیسائیت کے مقابلے میں یورپ کی پرانی بت پرستانہ تہذیب اور روم و یونان کے عظمت کے دور کی بازیابی کے لیے کوشاں رہے۔ یہ لوگ عیسائیت کو مشرق کا مذہب اور دین کا غاصب سمجھتے تھے۔ یہ لوگ عیسائیت کو روم کی عظیم بت پرست سلطنت کے زوال کا باعث سمجھتے تھے۔ یہ ہمیشہ عیسائیت کو تباہ کرنے کے لیے کوشاں رہے اور بالآخر اس میں کامیاب ہوگئے۔ عیسائیت کے خلاف اس نفرت کا اظہار موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مشہور جرمن مفکر "ہائیڈیگر" کے تصورات میں ہوتا ہے جس کی فکر معاصر جدیدی فکر کا اہم ترین سرچشمہ ہے۔ "ہائیڈیگر" کی لاطینیت کی ہر شکل سے نفرت اور اصلی یونانیت کی طرف رجوع کی دعوت اس کی عیسائیت کے خلاف نفرت کے اظہار کی شکل ہے۔ لوتھر کی تحریک اصلاح کو وہ یونانی عیسائیت کہتا ہے اور اس کا وہ مداح ہے حالانکہ "ہائیڈیگر" ایک کیتھولک گھرانے کا چشم و چراغ تھا لیکن وہ کیتھولک عیسائیت سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ کیتھولک اور لاطینی عیسائیت کو یورپی فکر کی کجی کا ذمہ دار گردانتا ہے۔

انگلستان میں سب سے پہلے مذہبی معاشرے کا خاتمہ ہوا:

اب آیئے اس بات کا مختصراً جائزہ لیں کہ کس طرح مذہبی معاشرہ کو یورپ میں تباہ کیا گیا اور کس طرح اس کی جگہ سول معاشرہ نے لے لی۔ ہم اس سلسلہ میں انگلستان کی مثال کو لیں کیونکہ انگلستان میں ہی سب سے پہلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب کو انقلاب عظیم [Glorious revolution] کی شکل میں 1689ء کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور سب سے پہلے یہیں سول سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔

عیسائیت کی پہلی شکست علمیاتی میدان میں:

ا۔ سب سے پہلے جس میدان میں عیسائیت کو شکست ہوئی وہ علمیاتی میدان تھا۔ عیسائیت کی علمی برتری ختم ہوگئی۔ اس کا فیصلہ کن اظہار ''تحریک اصلاح'' کی صورت میں ہوا جس کے ذریعہ ہر فرد اور ہر قوم کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ کلیسا کی ہر تعبیر، تشریح اور تفسیر کو رد کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہوں نے آہستہ آہستہ پاپائے روم کی سلطنت سے نکلنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں عالمگیر عیسائی ریاست تباہ ہونے لگی اور اس کے نتیجہ میں قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ انگلستان نے ہنری ہشتم کی بادشاہت کے دوران روم سے علیحدگی اختیار کی [گو کہ اس میں ہنری ہشتم کی ذاتی اغراض کا دخل کسی علمیاتی دلیل کے مقابلے میں زیادہ تھا]۔ ہنری ہشتم کے دور میں ہی 1536ء سے لے کر 1539ء کے درمیان بڑی بڑی عیسائی خانقاہیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جاگیریں بادشاہ نواز جاگیرداروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ ہنری ہشتم کے جانشینوں نے انگلستان میں تحریک اصلاح کی اس یلغار کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ عیسائیت کی علمی شکست کا یہ حال تھا کہ جامعہ کیمبرج جو عیسائیت کا گڑھ تھی، تحریک اصلاح کا گڑھ بن چکی اور صرف تین صدیوں کے عرصے میں یہ ممکن ہو سکا کہ اس جامعہ میں رسل اور وٹگنسٹائن نے درس دیے۔ چودہویں اور پندرہویں صدی میں یہ سوچنا بھی شاید محال تھا۔

۲۔ اس علمیاتی تبدیلی کے نتیجہ میں زہد، قناعت اور فقر کی معاشرتی برتری ختم ہونے لگی اور لوگوں میں حرص و حسد عام ہونا شروع ہوا۔ حرص و حسد کے جواز کے لیے مذہبی جواز اور دلیلیں فراہم کی جانے لگیں۔ جس طبقے میں انگلستان میں سب سے پہلے حرص و حسد عام ہونا شروع ہوا وہ بڑے زمینداروں کا طبقہ تھا جس میں مختصر تعداد میں کچھ چھوٹے زمیندار اور بہت ہی قلیل مقدار میں کچھ کسان بھی شامل تھے۔ زمینداروں میں حرص و حسد عام ہونے کے نتیجہ میں دو تبدیلیاں آئیں:

زیادہ سے زیادہ نفع کمانا مقصد زندگی بن گیا:

الف: عیسائی معاشرہ میں زمین منافع کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی لیکن اس تبدیلی کے نتیجہ میں زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ان کا مقصد زندگی بن گیا تھا۔ پرانے نظام میں لوگوں کا بنیادی زرعی مسئلہ یہ تھا کہ وہ کون سے طریقے اپنائے جائیں جس کے نتیجہ میں زمین پر آباد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مدد بہم پہنچائی جا سکے جب کہ نئے نظام میں بنیادی مسئلہ یہ ہو گیا کہ زمین میں سرمایہ کاری کا بہترین طریقہ کیا ہو گا۔ زمین سیاسی و سماجی ذمہ داری کی

علامت کے بجائے موجودہ سرمایہ دارانہ انداز میں نجی ملکیت بن گئی جس کو بیچا، خریدا جا سکتا تھا اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

TOWNEY لکھتا ہے۔

"In the turbulent days of the fifteenth century land had still a military and social significance apart from its economic value; lords had ridden out at the head of their retainers to convince a bad neighbours with bows and bills and a numerous tenantry had been important than a high pecunniary retrun from the soil".

لیکن حرص و حسد کے عمومی فروغ کے نتیجے میں دو صدیوں کے اندر یہ تمام تصورات یکسر طور پر تبدیل ہو گئے۔ تبدیلی کے نتائج بھی ''ٹونی'' کی زبانی سنئے:

"[This change] marks the transition from the mediavel conception of land as the basis of political functions and obligations to the modern view of it as an income yielding investment. Landholding tend, in short, to become commercialised:.

ب۔ عزت اور معاشرتی قدر کا معیار عدل نہیں رہا بلکہ دولت اور پیسہ بن گئے۔ ''زاگورن'' کے الفاظ میں:

"The aristocratic order survived but in a new shape, for money more than birth was now its basis. And parliment itself became the instrument of landed capitalists, whig and Tory both, and their connections and allies..." [English revolution.]

جاگیردار سرمایہ دار بنے تو کسان بے روزگار ہو گئے:

صحیح معنوں میں جاگیردار سرمایہ دار بن گئے تھے۔ ہمارے یہاں لوگ اسی سرمایہ دارانہ جاگیرداری نظام کو جاگیرداری نظام کی واحد شکل سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب جاگیردار سرمایہ دار ہو گئے تو عدل کے بجائے ظلم کرنے لگے۔ اور اس ظلم کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ قرون وسطیٰ میں جو کھلی زمینیں کاشتکاروں کو کاشت کے لیے اور مویشی چرانے کے لیے اور لکڑیاں اور دوسرا سامان زیست حاصل کرنے کے لیے دے رکھی تھیں وہ ان سرمایہ دار جاگیرداروں نے واپس لینا شروع کر دیں جس کے نتیجہ میں لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے اور ان میں سے کچھ تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہروں کا رخ کر گئے، کچھ ان ہی سرمایہ دار جاگیرداروں کے ہاں مزدور لگ گئے جب کہ بیشتر فقر و فاقہ پر مجبور ہوئے۔ ہزاروں عورتیں عصمت فروشی پر مجبور ہوئیں۔ ایک سو سال کے اندر خود کفیل اور نظام عدل کا بہترین نمونہ انگلستان کے گاؤں اور کھاتے پیتے کسان تباہ برباد ہو گئے اب حرص وحسد اور ظلم وستم کا یہ سارا کھیل قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کھیلا گیا تھا۔ سارے عمل کا جواز پارلیمنٹ سے حاصل کیا گیا۔

پارلیمنٹ سرمایہ داری جمہوریت کا گٹھ جوڑ: غرباء کے خلاف:

پارلیمنٹ نے ان سرمایہ دار جاگیرداروں کے مفادات اور حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے ان غریب کسانوں کو ان کے رزق سے محروم کرنے کے لیے نجی ملکیت کے تحفظ کے نام پر قوانین بنائے اس کی وجہ یہ تھی کہ پارلیمنٹ پر سرمایہ دار جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ پارلیمنٹ اور سرمایہ داری، جمہوریت اور سرمایہ داری کے درمیان گٹھ جوڑ آج تک جاری ہے۔ جو عمل دیہی علاقوں میں ہوا وہی عمل چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی دہرایا گیا۔ جاگیردار جو اب سرمایہ دار بن چکے تھے شہروں میں صنعتیں لگانے لگے۔ انہوں نے شہر کے چھوٹے سرمایہ داروں کو اس سارے عمل میں اپنا شریک بنالیا۔ جاگیردار، سرمایہ داروں اور شہر کے بورژوا طبقے کے گٹھ جوڑ اور اس کے نتیجہ میں کسانوں کی تباہی کے کھنڈرات پر موجودہ جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔ آہستہ آہستہ دوسرے طبقوں کو بھی اس عمل میں شریک کیا جاتا رہا لیکن اس کا واحد معیار یہی تھا کہ وہ طبقات حرص وحسد کو قبول کرلیں اور بے دینی کے آلہ کار بن جائیں۔ جن طبقات کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ حرص وحسد کی حکومت قبول نہیں کریں گے انہیں سرے سے ہی تباہ برباد کردیا گیا جیسے کسان، جیسے عیسائی راہب وغیرہ۔

کسانوں سے زمین چھیننے کی تحریک: انکلوژر موومنٹ:

۳۔ کسانوں سے زمینیں چھیننے کی اس تحریک کا نام "انکلوژر موومنٹ" ہے۔ اس تحریک کی جس واحد ادارے نے مخالفت کی وہ عیسائی بادشاہت تھا۔ وہ عیسائی بادشاہ ان معنوں میں تھا کہ اس کی بادشاہت کا جواز مذہب تھا۔ پارلیمانی قوتوں نے کرامویل کی قیادت میں سرمایہ داری کی راہ میں حائل اس آخری ادارے کو بھی ختم کردیا۔ چارلس اول کو پھانسی دے دی گئی اور عیسائی بادشاہت کو ختم کر کے اس کی جگہ دستوری بادشاہت قائم کردی گئی۔ دستوری بادشاہت میں اصل حکومت پارلیمنٹ کی ہے۔ اور پارلیمنٹ میں حکومت کا جواز عوام ہوتے ہیں مذہب یا خدا نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ "عوام" کی تعریف وقت گزرنے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ پہلے صرف سرمایہ دار جاگیردار اور ان کے حلیف "عوام" تھے۔ بعد میں دوسرے طبقے بھی شامل ہوتے گئے۔ "عوام" میں شامل ہونے کے لیے بس ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ آپ سرمایہ داری کے رنگ میں رنگ جائیں۔ آپ حرص وحسد کو اپنا خدا مان

لیں۔

اس مختصر سے تاریخی جائزے سے سول معاشرے کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پتہ چلتا ہے:

[۱] مذہبی علمیات اور مذہبی اجماع کی شکست و ریخت اور اس کے نتیجہ میں غیر مذہبی علمیات اور اجماع کا فروغ۔

[۲] حرص وحسد کو معاشی جدوجہد اور نظام کی بنیاد بنا کر ان کا معاشرے میں عام فروغ۔

[۳] ایسے اداروں کی تباہی و بربادی [مثلاً خانقاہ مدرسہ] جو حرص وحسد اور ان کی علمی برتری کی راہ میں حائل ہیں۔

[۴] ایک ایسے نظام حاکمیت کا قیام جس کا جواز مذہب فراہم نہ کرتا ہو بلکہ اس کا جواز "عوام" فراہم کرتے ہوں۔ دوسرے معنوں میں خدا کی حاکمیت کی جگہ انسان کی حاکمیت کا قیام۔

ان شرائط کے پورا ہونے کے نتیجے میں کسی بھی جگہ مذہبی معاشرہ تباہ ہوتا ہے اور ان کی جگہ سول معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول معاشرہ اور سرمایہ داری

ریحان عزیز

کوئی دن گذرتا ہوگا جو پاکستان کے اخبارات ورسائل میں سول معاشرہ' روشن خیالی اور وسیع نقطہ نظر جیسے خیالات ونظریات اور ان کے امکانات سے متعلق گفتگو نہ ہوتی ہو۔ بیسویں صدی کے اواخر سے جس کوشش کا شدت سے آغاز ہوا وہ اس صدی میں بھی جاری وساری ہے۔ ایک جانب اگر ارباب اقتدار ریاستی جبر کے ذریعے عوام کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانان عالم اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کے لیے تنگ نظری (تشریحی طریقہ فکر) کو ترک کر دینا بہتر ہے اور بجائے اس کے دنیا میں ترقی وخوشحالی کو مقصود حیات قرار دیتے ہوئے فقط اسی کے لیے کوشش کی جائے اور مذہب کو ایک روایت کے طور پر برقرار رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن جہادی فکر کے تابع کسی نظام کی تبدیلی یا اسلامی انقلاب کی فکر کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا' دوسری جانب ہمارے دانشور وفلسفی اور اعتدال پسند مفکرین بھی فکری بنیادوں پر مذکورہ نتائج کے حصول کے لیے کوشاں ہیں (اخبارات ورسائل اور فکری وعلمی جریدے اس امر کے گواہ ہیں)۔ یقیناً یہ تاریخ کا کوئی نیا حادثہ یا واقعہ نہیں ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد جس کے لیے دین وشریعت زندگی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو اور دنیا کے بجائے آخرت کو اہم سمجھتی ہو اسے اس کے برعکس طریق زندگی پر قائل وراضی کر لیا جائے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ تبدیلی چند ماہ وسال کا کام نہیں ہے بلکہ صدیاں صرف ہوتی ہیں تب کہیں جا کر اقوام وتہذیب کے قبلے تبدیل ہوا کرتے ہیں۔

تاریخ اقوام وتہذیب کے اوراق پلٹ کر دیکھئے تو ہمیں عیسائیت کی ایک واضح مثال نظر آتی ہے۔ آپ

بخوبی واقف ہیں کہ عیسائیت آج جس حالت میں موجود ہے وہ فقط چند رسوم اور عقائد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ سیاست ومعیشت کے میدان میں اس کے پاس کچھ علیحدہ بات کہنے کے لیے نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ رائج و موجودہ افکار کو چند ثانوی وغیر اہم تبدیلیوں کے ساتھ قبول کرتے چلے جائیں۔ عیسائی اقدار کے معاملہ میں بھی نئی تہذیب کی برتری بالکل واضح ہے شرم وحیا' تقویٰ واحسان' ایثار وقربانی' آخرت سے محبت' دنیا پرستی وامارت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اور اس نوع کے دیگر اوصاف تمام معاشروں سے بتدریج فارغ ہوتے چلے گئے، نتیجتاً ایک نئے طرز کے معاشرے وجود میں آ گئے جو قرون وسطیٰ کے مذہبی معاشروں کی بالکل ضد تھے جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ تبدیلی آناً فاناً نہیں بلکہ صدیوں میں وقوع پذیر ہوئی۔

یورپ میں رد عیسائیت کی تحریکوں میں شروع شروع میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ عیسائیت کا براہ راست انکار کر سکیں' ان تحریکوں نے ابتدا جس چیز کا انکار کیا وہ عیسائیت کی اجتماعی تعبیر تھی اور اس کے علی الرغم ایسی لبرل تعبیر پیش کی گئی جس کے نتیجے میں عیسائیت خدا کی مرضی اور منشا معلوم کرنے کا ذریعہ نہ رہی بلکہ افراد اور اقوام کی خواہشات کے حصول کے ذریعہ بن گئی عیسائیت کی اس لبرل تعلیم کو تحریک اصلاح کا نام دیا گیا۔

تحریک اصلاح جو بظاہر کلیسا کو خرابیوں سے پاک کرنے کی ایک تحریک تھی جس نے عام عیسائی کو کلیسائی پادریوں کے تسلط سے آزاد کرایا تھا لیکن جو صورتحال سامنے آئی وہ کچھ اس نوعیت کی تھی کہ عام فرد کے لیے بھی مذہبی قوانین پر کلام کرنا اور اس کو رد کرنا ممکن ہو گیا۔ لوتھر' کیلون' ژونگلی اور دیگر اصلاحی مفکرین نے اس نکتہ کو پیش کیا تھا کہ انجیل مقدس کو سمجھنے کے لیے کلیسا کا اجماع' روایات اور ادارے ضروری نہیں ہیں بلکہ ہر شخص اور ہر گروہ اور قوم اپنے ضمیر' خواہش اور عقل کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور پھر یوں ہوا کہ دو سو سال کے اندر اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے کہ عیسائیت کا رد کیا جا سکے۔ اس تابوت میں ایک واضح اور بڑی کیل فلسفیوں نے پیوست کر دی۔ ڈیکارٹ جس سے فلسفہ کی ایک نئی کہانی کا آغاز ہوتا ہے اس نے انسان کو عقل پرستی کی راہ سجھائی' ایک ایسی عقل جو اپنی زندگی کی اقدار خود متعین کر سکتی ہے' خیر وشر کی حدود کا تعین کر سکتی ہے۔' درحقیقت عقل نے جس چیز کی جگہ لی وہ انجیل مقدس تھی جسے وحی الٰہی ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ روزمرہ سے لے کر معیشت وسیاست تک جن معاملات میں کلام الٰہی سے مشاورت کا طریقہ رائج تھا اب عقل انسانی نے یہ ذمہ داری خود سنبھال لی۔ چند سو سالوں میں اس کا لازمی نتیجہ بھی سامنے آ گیا جب نطشے نے مذہب کی ہر علامت سے بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ (نعوذ باللہ) خدا مر چکا ہے۔

اس واضح اور بڑی مثال سے ہم درج ذیل نتائج برآمد کر سکتے ہیں۔

1۔ سول معاشرہ مذہبی معاشرہ کی ضد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول معاشرہ اور سرمایہ داری

ریحان عزیز

کوئی دن گذرتا ہوگا جو پاکستان کے اخبارات و رسائل میں سول معاشرہ' روشن خیالی اور وسیع نقطۂ نظر جیسے خیالات و نظریات اور ان کے امکانات سے متعلق گفتگو نہ ہوتی ہو۔ بیسویں صدی کے اواخر سے جس کوشش کا شدت سے آغاز ہوا وہ اس صدی میں بھی جاری و ساری ہے۔ ایک جانب اگر ارباب اقتدار ریاستی جبر کے ذریعے عوام کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانان عالم اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کے لیے تنگ نظری (شرعی طریقۂ فکر) کو ترک کر دینا بہتر ہے اور بجائے اس کے دنیا میں ترقی و خوشحالی کو مقصود حیات قرار دیتے ہوئے فقط اسی کے لیے کوشش کی جائے اور مذہب کو ایک روایت کے طور پر برقرار رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن جہادی فکر کے تابع کسی نظام کی تبدیلی یا اسلامی انقلاب کی فکر کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا' دوسری جانب ہمارے دانشور و فلسفی اور اعتدال پسند مفکرین بھی فکری بنیادوں پر مذکورہ نتائج کے حصول کے لیے کوشاں ہیں (اخبارات و رسائل اور فکری و علمی جریدے اس امر کے گواہ ہیں)۔ یقیناً یہ تاریخ کا کوئی نیا حادثہ یا واقعہ نہیں ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد جس کے لیے دین و شریعت زندگی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو اور دنیا کے بجائے آخرت کو اہم سمجھتی ہو اسے اس کے برعکس طریق زندگی پر قائل و راضی کر لیا جائے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ تبدیلی چند ماہ و سال کا کام نہیں ہے بلکہ صدیاں صرف ہوتی ہیں تب کہیں جا کر اقوام و تہذیب کے قبلے تبدیل ہوا کرتے ہیں۔

تاریخ اقوام و تہذیب کے اوراق پلٹ کر دیکھئے تو ہمیں عیسائیت کی ایک واضح مثال نظر آتی ہے۔ آپ

بخوبی واقف ہیں کہ عیسائیت آج جس حالت میں موجود ہے وہ فقط چند رسوم اور عقائد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ سیاست و معیشت کے میدان میں اس کے پاس کچھ علیحدہ بات کہنے کے لیے نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ رائج و موجودہ افکار کو چند ثانوی و غیر اہم تبدیلیوں کے ساتھ قبول کرتے چلے جائیں۔ عیسائی اقدار کے معاملہ میں بھی نئی تہذیب کی برتری بالکل واضح ہے شرم و حیا' تقویٰ و احسان' ایثار و قربانی' آخرت سے محبت' دنیا پرستی و امارت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اور اس نوع کے دیگر اوصاف تمام معاشروں سے بتدریج فارغ ہوتے چلے گئے، نتیجتاً ایک نئے طرز کے معاشرے وجود میں آ گئے جو قرون وسطیٰ کے مذہبی معاشروں کی بالکل ضد تھے جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ تبدیلی آناً فاناً نہیں بلکہ صدیوں میں وقوع پذیر ہوئی۔

یورپ میں رد عیسائیت کی تحریکوں میں شروع شروع میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ عیسائیت کا براہ راست انکار کر سکیں۔ ان تحریکوں نے ابتداً جس چیز کا انکار کیا وہ عیسائیت کی اجتماعی تعبیر تھی اور اس کے علی الرغم ایسی لبرل تعبیر پیش کی گئی جس کے نتیجے میں عیسائیت خدا کی مرضی اور منشا معلوم کرنے کا ذریعہ نہ رہی بلکہ افراد اور اقوام کی خواہشات کے حصول کے ذریعہ بن گئی عیسائیت کی اس لبرل تعلیم کو تحریک اصلاح کا نام دیا گیا۔

تحریک اصلاح جو بظاہر کلیسا کو خرابیوں سے پاک کرنے کی ایک تحریک تھی جس نے عام عیسائی کو کلیسائی پادریوں کے تسلط سے آزاد کرایا تھا لیکن جو صورتحال سامنے آئی وہ کچھ اس نوعیت کی تھی کہ عام فرد کے لیے بھی مذہبی قوانین پر کلام کرنا اور اس کو رد کرنا ممکن ہو گیا۔ لوتھر' کیلون' ژونگلی اور دیگر اصلاحی مفکرین نے اس نکتہ کو پیش کیا تھا کہ انجیل مقدس کو سمجھنے کے لیے کلیسا کا اجماع' روایات اور ادارے ضروری نہیں ہیں بلکہ ہر شخص اور ہر گروہ اور قوم اپنے ضمیر' خواہش اور عقل کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور پھر یوں ہوا کہ دو سو سال کے اندر اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے کہ عیسائیت کا رد کیا جا سکے۔ اس تابوت میں ایک واضح اور بڑی کیل فلسفیوں نے پیوست کر دی۔ ڈیکارٹ جس سے فلسفہ کی ایک نئی کہانی کا آغاز ہوتا ہے اس نے انسان کو عقل پرستی کی راہ سجھائی' ایک ایسی عقل جو اپنی زندگی کی اقدار خود متعین کر سکتی ہے' خیر و شر کی حدود کا تعین کر سکتی ہے۔' درحقیقت عقل نے جس چیز کی جگہ لی وہ انجیل مقدس تھی جسے وحی الٰہی ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ روزمرہ سے لے کر معیشت و سیاست تک جن معاملات میں کلام الٰہی سے مشاورت کا طریقہ رائج تھا اب عقل انسانی نے یہ ذمہ داری خود سنبھال لی۔ چند سو سالوں میں اس کا لازمی نتیجہ بھی سامنے آ گیا جب نطشے نے مذہب کی ہر علامت سے بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ (نعوذ باللہ) خدا مر چکا ہے۔

اس واضح اور بڑی مثال سے ہم درج ذیل نتائج برآمد کر سکتے ہیں۔

1۔ سول معاشرہ مذہبی معاشرہ کی ضد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول معاشرہ اور سرمایہ داری

ریحان عزیز

کوئی دن گذرتا ہوگا جو پاکستان کے اخبارات و رسائل میں سول معاشرہ، روشن خیالی اور وسیع نقطۂ نظر جیسے خیالات و نظریات اور ان کے امکانات سے متعلق گفتگو نہ ہوتی ہو۔ بیسویں صدی کے اواخر سے جس کوشش کا شدت سے آغاز ہوا وہ اس صدی میں بھی جاری و ساری ہے۔ ایک جانب اگر ارباب اقتدار ریاستی جبر کے ذریعے عوام کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانان عالم اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کے لیے تنگ نظری (ترقی طریقۂ فکر) کو ترک کر دینا بہتر ہے اور بجائے اس کے دنیا میں ترقی و خوشحالی کو مقصود حیات قرار دیتے ہوئے فقط اسی کے لیے کوشش کی جائے اور مذہب کو ایک روایت کے طور پر برقرار رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن جہادی فکر کے تابع کسی نظام کی تبدیلی یا اسلامی انقلاب کی فکر کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا' دوسری جانب ہمارے دانشور و فلسفی اور اعتدال پسند مفکرین بھی فکری بنیادوں پر مذکورہ نتائج کے حصول کے لیے کوشاں ہیں (اخبارات و رسائل اور فکری و علمی جریدے اس امر کے گواہ ہیں)۔ یقیناً یہ تاریخ کا کوئی نیا حادثہ یا واقعہ نہیں ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد جس کے لیے دین و شریعت زندگی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو اور دنیا کے بجائے آخرت کو اہم سمجھتی ہو اسے اس کے برعکس طریق زندگی پر قائل و راضی کر لیا جائے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ تبدیلی چند ماہ و سال کا کام نہیں ہے بلکہ صدیاں صرف ہوتی ہیں تب کہیں جا کر اقوام و تہذیب کے قبلے تبدیل ہوا کرتے ہیں۔

تاریخ اقوام و تہذیب کے اوراق پلٹ کر دیکھئے تو ہمیں عیسائیت کی ایک واضح مثال نظر آتی ہے۔ آپ

بخوبی واقف ہیں کہ عیسائیت آج جس حالت میں موجود ہے وہ فقط چند رسوم اور عقائد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ سیاست و معیشت کے میدان میں اس کے پاس کچھ علیحدہ بات کہنے کے لیے نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ رائج و موجودہ افکار کو چند ثانوی و غیر اہم تبدیلیوں کے ساتھ قبول کرتے چلے جائیں۔ عیسائی اقدار کے معاملہ میں بھی نئی تہذیب کی برتری بالکل واضح ہے شرم و حیا' تقویٰ و احسان' ایثار و قربانی' آخرت سے محبت' دنیا پرستی و امارت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اور اس نوع کے دیگر اوصاف تمام معاشروں سے بتدریج فارغ ہوتے چلے گئے، نتیجتاً ایک نئے طرز کے معاشرے وجود میں آ گئے جو قرون وسطیٰ کے مذہبی معاشروں کی بالکل ضد تھے جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ تبدیلی آناً فاناً نہیں بلکہ صدیوں میں وقوع پذیر ہوئی۔

یورپ میں رد عیسائیت کی تحریکوں میں شروع شروع میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ عیسائیت کا براہ راست انکار کر سکیں۔ ان تحریکوں نے ابتداً جس چیز کا انکار کیا وہ عیسائیت کی اجتماعی تعبیر تھی اور اس کے علی الرغم ایسی لبرل تعبیر پیش کی گئی جس کے نتیجے میں عیسائیت خدا کی مرضی اور منشا معلوم کرنے کا ذریعہ نہ رہی بلکہ افراد اور اقوام کی خواہشات کے حصول کے ذریعہ بن گئی عیسائیت کی اس لبرل تعلیم کو تحریک اصلاح کا نام دیا گیا۔

تحریک اصلاح جو بظاہر کلیسا کو خرابیوں سے پاک کرنے کی ایک تحریک تھی جس نے عام عیسائی کو کلیسائی پادریوں کے تسلط سے آزاد کرایا تھا لیکن جو صورتحال سامنے آئی وہ کچھ اس نوعیت کی تھی کہ عام فرد کے لیے بھی مذہبی قوانین پر کلام کرنا اور اس کو رد کرنا ممکن ہو گیا۔ لوتھر' کیلون' ژونگلی اور دیگر اصلاحی مفکرین نے اس نکتہ کو پیش کیا تھا کہ انجیل مقدس کو سمجھنے کے لیے کلیسا کا اجماع' روایات اور ادارے ضروری نہیں ہیں بلکہ ہر شخص اور ہر گروہ اور قوم اپنے ضمیر' خواہش اور عقل کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور پھر یوں ہوا کہ دو سو سال کے اندر اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے کہ عیسائیت کا رد کیا جا سکے۔ اس تابوت میں ایک واضح اور بڑی کیل فلسفیوں نے پیوست کر دی۔ ڈیکارٹ جس سے فلسفہ کی ایک نئی کہانی کا آغاز ہوتا ہے اس نے انسان کو عقل پرستی کی راہ سجھائی' ایک ایسی عقل جو اپنی زندگی کی اقدار خود متعین کر سکتی ہے' خیر و شر کی حدود کا تعین کر سکتی ہے۔' درحقیقت عقل نے جس چیز کی جگہ لی وہ انجیل مقدس تھی جسے وحی الٰہی ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ روزمرہ سے لے کر معیشت و سیاست تک جن معاملات میں کلام الٰہی سے مشاورت کا طریقہ رائج تھا اب عقل انسانی نے یہ ذمہ داری خود سنبھال لی۔ چند سو سالوں میں اس کا لازمی نتیجہ بھی سامنے آ گیا جب نطشے نے مذہب کی ہر علامت سے بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ (نعوذ باللہ) خدا مر چکا ہے۔

اس واضح اور بڑی مثال سے ہم درج ذیل نتائج برآمد کر سکتے ہیں۔

1۔ سول معاشرہ مذہبی معاشرہ کی ضد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2۔سول معاشرہ کا قیام آناً فاناً نہیں بلکہ بتدریج عمل میں آتا ہے۔

3۔سول معاشرہ کے قیام کے لیے ابتدا اجماع امت سے انکار کر کے جاتی ہے۔

ہم کوشش کریں گے کہ قرون وسطٰی کے مذہبی معاشروں کا حال، ریاستوں کی حاکمیت اور اصلاح پسندی کے ان پر اثرات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کردیں۔

قرون وسطٰی کے مذہبی معاشرے:

اجمال کے ساتھ عرض یہ ہے کہ قرون وسطٰی کے معاشرے ان اخلاقی اقدار سے متصف تھے جنہیں الہیاتی اخلاقیات کہا جاسکتا ہے۔ شرم وحیا ایثار واحسان، تقویٰ و پرہیزگاری کسی نہ کسی طور پر ان معاشروں میں رائج تھے۔ ایسے افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا جو ان اوصاف کے زیادہ حامل ہوا کرتے تھے۔ اگر غور فرمائیں تو تحریک اصلاح کے جن مفکرین کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ بھی اپنی ذاتی زندگی میں گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے اور عیسائی روایات کے مطابق راہبانہ زندگی کو نہایت سنجیدگی سے اختیار کرتے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اسلامی معاشروں میں فقر وسادگی اختیار کرنے والے بزرگوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح عیسائی معاشروں میں ایسے افراد نہایت اہمیت کے حامل تھے اور اس نوع کی اقدار نہایت درجہ عمدہ تصور کی جاتی تھیں۔

دیہی سطح پر قرون وسطٰی کا نظام جاگیردارانہ تھا۔ عام خیال کے برعکس یہ نظام، نظام عدل تھا اور عیسائی اخلاقی تعلیمات اور کلیسا کے قوانین کا پابند تھا۔ وہ اس جاگیردارانہ نظام سے قطعاً مختلف تھا جس کو آج ہمارے ہاں طعن و تشنیع سے نوازا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیادی طور پر دو اہم خصوصیات تھیں۔

I۔ جاگیردار کے لیے زمین بنیادی طور پر منافع کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ سیاسی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی علامت تھی۔ زمین کو بنیادی طور پر منافع کا ذریعہ قرار دینا جاگیردارانہ نظام کے لیے ایک اجنبی چیز تھی لہٰذا یہ سمجھنا مشکل نہیں ہونا چاہئے کہ استحصال، جبر اور ظلم جیسی جتنی اصطلاحیں آج ہم جاگیرداری کے ساتھ منسلک کرتے ہیں وہ اس وقت غیر متعلق تھیں۔ معاشرتی اقدار اور عزت کا معیار پیسہ اور دولت نہیں تھی۔ عزت کا معیار، عمل کا نفاذ، سخاوت، ماتحت افراد سے حسنِ سلوک کرنا وغیرہ سمجھے جاتے تھے۔ معاشرتی اقدار اور ان کے درمیان ترجیحات کا تعین عیسائی تعلیمات کرتی تھیں۔ پیسہ دولت یا حسن اقدار کی ترجیحات کا پیمانہ نہیں تھے۔ ٹونی Twney کے بقول "جاگیردارانہ نظام میں متعدد قطعات زمین کا حاصل ہونا اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم تھا کہ ان سے منافع کس قدر حاصل ہوتا تھا؟ کئی بڑے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ قرون وسطٰی کا جاگیردرانہ نظام، نظام عدل تھا، کسانوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات میسر تھیں اور وہ معاشی طور پر خوشحال تھے۔

2۔قرون وسطٰی کے معاشروں کا ایک اہم ستون عیسائی خانقاہیں اور چرچوں کا نظام تھا۔ چرچ عیسائیت کی علمی برتری کا محافظ اور فروغ دہندہ تھا۔ وہ اس سارے نظام کا نگران بھی تھا۔ رہبانیت پر مبنی نظام دور روحانی ماحول قائم رکھنے اور قائم کرنے کا ذمہ دار تھا اس نظام میں زہد وقناعت پرورش پاتے تھے جبکہ حرص وحسد کا قلع قمع ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرون وسطٰی کے معاشروں میں عمومی طور پر آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جاتی تھی۔ عبادت خانوں میں غریبوں کی امداد کے لیے پورا نظام قائم کیا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں بے سہارا اور بے آسرا لوگوں کو مدد فراہم کی جاتی تھی۔ عیسائی بادشاہوں نے اس نظام امداد کو جاری وساری رکھنے کے لیے عبادت گاہوں کے نام پر بڑی بڑی جاگیریں وقف کی ہوئی تھیں، اس طرح اس معاشرہ میں وہ مخیر حضرات بھی موجود تھے جو خدا ترسی کے جذبہ کے ماتحت دیگر افراد کی مدد کیا کرتے تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہاں پیداواری عمل کو اس لیے روبہ عمل لایا جاتا تھا کہ اس کی مدد سے انسان کی ضرورت اور استعمال کی اشیاء پیدا کی جاسکیں اور انہیں بہم پہنچائی جاسکیں خود معاشی عمل بذات مقصود نہیں تھا، منافع برائے منافع یا بڑھوتری برائے بڑھوتری ایک اجنبی تصور تھا جسے سرمایہ دارانہ طرز معیشت نے عام کیا۔

عیسائی طرز حاکمیت:

جو لوگ عیسائیت اور تاریخ عیسائیت سے کسی قدر واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عیسائی فکر میں اپنی فقہ نہ ہونے کے باعث سیاسی حوالے سے ذاتی احکام نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کسی خاص عیسائی ریاست کے قیام (جس طرح دین اسلام میں تصور موجود ہے) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رومی حکومت میں عیسائی فکر کی شمولیت کو کافی سمجھتے ہوئے اسے عیسائی قرار دے دیا گیا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس حاکمیت کی سند اور جواز مذہبی Auttorities بھی دیا کرتی تھیں اس جواز کا ابتدائی خاکہ St. Augstine نے پیش کیا اس نے اپنی کتاب City of God میں خدا اور آدمی کی سلطنت کے درمیان امتیاز اور ہم موجودیت کے تصور کو واضح کیا۔ خدا کے شہر پر پوپ اور چرچ کی حکمرانی ہوگی جبکہ آدمی کے شہر پر بادشاہ کی حکمرانی ہوگی۔ دنیاوی اور دینی قیادت کی یہ تفریق اس لحاظ سے مذہبی تھی کہ اس تقسیم کا جواز مذہبی اور ایک مذہبی سند نے تجویز کیا تھا۔ عام طور پر اسے سیکولرازم کی ابتداء کہا جاتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ Augstine کے اس نظام میں کسی شعبہ کو مذہب کی دسترس سے باہر نہیں رکھا گیا مزید، یہ کہ بادشاہ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا جواز مذہب میں ہی تلاش کرتے تھے اور پوپ کی رائے کو برتر گردانتے تھے۔ اس وقت تک بادشاہوں کے الوہی ہونے کا تصور بھی موجود نہیں تھا، یہ خیال اصلاحی مفکرین نے بعد میں پیش کیا جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ اصلاح پسندی کی ابتدا کلیسا کی خرابیوں کو تحریک کا مرکز بناتے ہوئے اصلاح کا کام انجام دینا تھا اور نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ہر فرد کو اس کا اختیار دے دیا گیا کہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلیسا کی تعبیر، تشریح اور تفسیر کو رد کر سکے لیکن دوسری جانب اصلاح پسندوں کی تحریروں میں حکومتوں اور حکمرانوں کی مکمل تابعداری کی تعلیمات صاف نظر آتی ہیں۔ لوتھر کے ایک خط میں اس تابعداری کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ:

''میں خدا کی مرضی کا اظہار یوں کرتا ہوں کہ بادشاہ کا مکمل احترام کیا جائے اور اس کے باغیوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے کیونکہ ان کے لیے دونوں جہانوں میں رحم نہیں ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تم پر رحم کیا جائے تو ان باغیوں کے ساتھ مت ملنا اور حاکم سے ڈرتے رہو اور خیر اختیار کرو۔''

مزید یہ ایک اور کلیہ اس بات سے خبردار کرتا ہے کہ ''اگر بادشاہ ظالم اور نااہل بھی ہو تب بھی تمہیں اس بات کا اختیار نہیں کہ تم اس کے خلاف آواز اٹھاؤ۔''

اس نوع کی تحریروں نے بادشاہت کا ایک تصور قائم کر دیا جو خدا کی مانند ہے اور ریاست کے لوگ اس کے پابند ہو گئے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی کو مقدم جانیں اور اس کی خوشنودی کو ممکن بنائیں۔ اس جدید نظریہ نے یورپ میں قوم پرست فکر کی بنیاد رکھ دی، پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہوں نے آہستہ آہستہ پاپائے روم کی سلطنت سے نکلنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں عالمگیر عیسائی ریاست تباہ ہونے لگی اور قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔

اس سیاسی تبدیلی کی نشاندہی کے بعد علمی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کا بھی ہم ایک جائزہ لیتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں اگر ایک جانب عیسائیت کی شکست تھی تو دوسری جانب سول معاشروں کا آغاز تھا۔

1۔ اگر علمیت اور عقائد کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے عیسائیت میں عقیدہ الوہیت و تجسیم اور مسیح کے ابن اللہ ہونے کا نظریہ تھا۔ لازمی بات ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تعلیم قطعی طور پر نہیں تھی، یہ عقیدہ تو پال اور بعد میں آنے والوں نے شامل کیا اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جبکہ ایک شخص ابن اللہ اور مجسم خدا ہو سکتا ہے تو پھر دیگر انسان بھی ان اوصاف سے متصف ہو سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اگلی منزل انسان کے خود خدا بننے کی ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیت نے مذہب کی بنیادوں کو کفر و شرک سے آلودہ کر کے خود اپنی تباہی و شکست کی بنیاد رکھ دی۔

2۔ دوم یہ کہ عیسائیت کے پاس اپنی کوئی فقہ موجود نہیں تھی ابتداً حضرت موسیٰ کی شریعت کی بھی اتباع کی جاتی تھی لیکن پہلی صدی عیسوی کے وسط میں عیسائی علماء کی ایک معقول تعداد نے موسوی شریعت سے اغماض برتنا شروع کر دیا تھا اور دوسری صدی عیسوی میں اسے بالکل ترک کر دیا گیا حالانکہ رسماً آج بھی New Testaeul کے حوالے یسوع کا یہ قول کثرت سے دہرایا جاتا ہے جس کے مطابق وہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تنسیخ کے لیے

نہیں بلکہ اسے پورا کرنے آئے ہیں لہٰذا عیسائیت کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی ٹھوس متبادل نہیں تھا سوائے اس کے کہ چند رسومات و عقائد کو باقی رکھا جائے جو فرد کی اندرونی و داخلی زندگی تک محدود رہیں۔

3۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ یورپ میں عیسائیت کے غلبہ کے باوجود ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو قدیم رومی و یونانی تہذیب کی واپسی کے خواہشمند تھے اور عیسائیت کو روم کی عظیم بت پرست سلطنت کے زوال کا باعث سمجھتے تھے۔ بیسیوں صدی کا مشہور فلسفی مارٹن ہائیڈیگر اس مخاصمت کا عکاس ہے۔ ہائیڈیگر کی لاطینیت کی ہر شکل سے نفرت اور اصلی یونانیت کی طرف رجوع کی دعوت اس کی عیسائیت کے خلاف نفرت کے اظہار کی شکل ہے۔ لوتھری تحریک کو وہ یونانی عیسائیت کہتا ہے اور اس کا وہ مداح ہے اور کیتھولک گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود کیتھولک عیسائیت سے نفرت کرتا ہے۔ وہ کیتھولک اور لاطینی عیسائیت کو یورپی فکر کی کجی کا ذمہ دار گردانتا ہے۔

4۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے پہلی بار دولت کمانے کو احسن سمجھنے اور دنیا پرستی کو جواز فراہم کرنے کی بنیاد رکھی۔ زیادہ منافع کمانا اور دولت کے انبار لگا لینا خدا کی پسندیدگی اور رضامندی کے مساوی بن گیا آگے چل کر سرمایہ داری کی Legitimacy کے لیے بھی یہی انداز فکر کام آیا۔

معاشرتی و معاشی تبدیلی:

اس سیاسی و علمیاتی تبدیلی کے نتیجہ میں زہد، قناعت اور فقر کی معاشرتی برتری ختم ہونے لگی۔ لوگوں میں حرص و حسد عام ہونا شروع ہوا۔ زمیندار کے لیے زمین اب فقط سماجی برتری اور ذمہ داری کا نشان نہیں تھی بلکہ منافع کا سبب تھی۔ اب سوچ یہ ہو گئی تھی کہ زمین میں سرمایہ کاری کا بہترین طریقہ کیا ہو گا؟ حرص و حسد کے عمومی فروغ کے نتیجے میں دو صدیوں کے اندر یہ تبدیلی آئی کہ عزت و معاشرتی قدر کا معیار عدل نہیں رہا بلکہ دولت اور پیسہ بن گئے، وہ معیشت جس کی بنیاد ایثار و احسان پر تھی اب غرض و منافع کی معیشت بن گئی۔ پھر جاگیردانہ نظام کی وہ صورت سامنے آئی جسے آج عام طور پر ظالم و جابر سمجھا جاتا ہے۔ کسانوں سے تمام زمینیں اور مویشی چھین لیے گئے اور انہیں یا تو نکال دیا گیا یا معمولی ملازموں کے طور پر نوکری دے دی۔ جاگیردار صحیح معنوں میں سرمایہ دار بن گئے اور ایسے قوانین بنائے گئے جن کے نتیجے میں سرمایہ دار جاگیرداروں کے مفادات محفوظ اور عام کسانوں کو زیادہ سے زیادہ مجبور بنا دیا جائے۔ کسانوں سے زمین چھیننے کی اس تحریک کا نام Enclosure Movemeut ہے جس میں نجی ملکیت کے تحفظ کے نام پر قوانین بنائے گئے اور سرمایہ دارای کا ایک فطری رویہ سامنے آیا پارلیمنٹ نے ایک کام یہ بھی کیا کہ عیسائی بادشاہت کا ادارہ ختم کر کے دستوری ریاست کو قائم کر دیا۔ دستوری ریاست عوام کی مرضی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کسی مذہب یا الٰہی احکامات کی پابند نہیں ہوتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مقام پر ہم درج ذیل نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔

1۔ حرص وحسد کو معاشی جدوجہد اور نظام کی بنیاد بنا کر انکا معاشرے میں عام فروغ سول معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

2۔ ایسے اداروں کا اثر ورسوخ (مثلاً دارالعلوم مدرسہ وخانقاہ) ختم کیا جائے جو حرص وحسد اور ان کی علمی برتری کی راہ میں حائل ہیں۔

3۔ ایک ایسے نظام حاکمیت کا قیام جس کا جواز مذہب فراہم نہ کرتا ہو بلکہ اس کا جواز عوام فراہم کرتے ہوں۔

دستوری جمہوری ریاست:

دستوری ریاست کو سمجھنے کے لیے ہم ابتدا اس بنیادی سوال سے کرتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟...... دستوری ریاست وہ ریاست ہوتی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کا اقرار کرتی ہے اور اس کی پاسداری کا حلف اٹھاتی ہے اور دستور سے مراد اس کتاب فطرت سے آگاہی ہے جس کی ابتدائی شناخت دور تنویر میں ہوئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ انسان کی اصل حقیقت اس کی زندگی کا مقصد اور اس کی اصل "خواہش" ہے۔ سیاسیات کا ایک عام طالب علم اس سے واقف ہے کہ دنیا کا پہلا دستور امریکہ میں وجود میں آیا اور اس کے مرتب کرنے والے اس دعویٰ کو بجا سمجھتے تھے کہ امریکی دستور کتاب فطرت پر مبنی ہے اور اسی بنا پر تمام دنیا کو امریکا اور اس کے مفکرین کی آراء کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دستور نے جس چیز کی جگہ لی وہ کچھ اور نہیں بلکہ کتاب الٰہی یا قوانین الٰہی ہیں۔ تاریخی طور پر عیسائیت کو ابتدا جس طور پر رد کیا گیا وہ مذہب کا رد یا عیسائیت کے تصور خدا کا رد نہ تھا بلکہ جس چیز کا بنیادی طور پر رد کیا وہ کتاب کا رد تھا اور اس بات کا رد تھا کہ کلیسا کو اس تعبیر کا کلی حق حاصل ہے۔ جدیدیت نے ابتدا میں اس بات کا رد نہیں کیا کہ خدا کی مرضی ہی اصل الاصول ہے یہی وجہ ہے کہ جب جان لاک نے عوام کی حکمرانی کے نظریہ کا جواز پیش کیا تو وہ خدا کی مرضی کے اصول ہی کی بنیاد پر کیا۔ اس نے کہا کہ عوام کی حکمرانی اس لیے ہونی چاہئے کہ خدا کی مرضی یہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جان لاک کو اس مرضی کا علم کیونکر ہوا؟ تو جواب یہ ہے کہ اس علم کا منبع ایک نئی دریافت شدہ کتاب یا حقیقت ہے جسے کتاب فطرت کہا جاتا ہے۔ اس کتاب تک رسائی عقل کے ذریعے ممکن ہے پہلے چونکہ کلیسا کی وجہ سے گمراہی وجہل کے پردے پڑے تھے لیکن اب صحیح طور پر اس کتاب کا مطالعہ ممکن ہے اور امریکی دستور کے مصنفین وہ ہستیاں تھیں جو اسے ٹھیک ٹھیک پڑھ سکتی تھیں' اس بنیاد پر انہوں نے دستور کی فوقیت کا دعویٰ کیا۔ یہ بات اچھی طریقہ سے سمجھ لینا چاہئے کہ دستور کے مرتب کرنے میں کسی بھی طرح سے کتاب الٰہی کو سند نہیں سمجھنا چاہئے اور دوسری غلط فہمی جس کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ دستور بنانے کے لیے عوام وغیرہ کی مرضی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے اور نہ ہی ابتدائی دستور سازوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا تھا

مزید یہ کہ اب دنیا میں جس قدر بھی دستور سازی ہوتی ہے اس کی بنیاد وہی دستور اول اور انسانی حقوق کا چارٹر ہے جس کی توثیق کے بغیر اس کا کوئی پہلو وجود میں نہیں آسکتا۔ دستور کا مقصد عوام کی اصل مرضی اور خواہش کا اظہار ہے اور یہ مرضی ریاست میں مختلف طور پر منعکس ہوتی ہے۔ مقننہ انتظامیہ اور عدلیہ مساوی طور پر عوام کی مرضی کی نمائندہ ہیں۔ اب سلسلہ یہ ہے کہ دستور ایک طرف تو مقننہ کے اثبات کے ذریعے اکثریت کے حق حکمرانی کو بالکلیہ طور پر تسلیم کرتا ہے تو دوسری طرف تقسیم اختیارات کے تحت مقننہ پر قدغن عائد کر کے یہ بتاتا ہے کہ اکثریت کی حکمرانی کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ یہ بات اچھی طریقہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک جمہوری دستوری ریاست میں اکثریت کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ قوت نافذہ اور قانون کی تعبیر وتنفیذ کا کام اس اقلیت کے ہاتھ میں رہے جو ریاست کو سرمایہ داری کے اوصاف سے متمتع کر دے، جو وسائل میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرے۔ بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل میں طاق ہو۔ اصولی طور پر حکمرانی اکثریت کی ہی ہے لیکن اکثریت کی حکمرانی کا تقاضا ہے کہ ایسی اقلیت کی حکمرانی ہو جو وسائل میں اضافہ کی اہل ہو، یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں بھی جمہوریت مستحکم ہوتی ہے وہاں بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی کی حکومت مستحکم ہوتی ہے اور لوگوں کا کام محض اس اقلیت کی حکمرانی پر صاد کرنا رہ جاتا ہے۔ یہی جمہوریت ہے اور بیسویں صدی میں سرمایہ داری اور اس کی عقلیت کو رائج کرنے کا سب سے معروف ذریعہ بھی یہی ہے۔ جو لوگ جمہوری ریاست کے حوالے سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جمہوریت عوام کی مرضی اور ان کی حقیقی آزادی کو ممکن بناتی ہے تو درست یہ ہے کہ انسان کو خدائے بزرگ وبرتر کی جانب سے فقط یہ اختیار ملا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کی بندگی اختیار کرے اور چاہے تو شیطان کی بندگی اختیار کرے لیکن اللہ نے انسان کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ بندگی سے نکل کر مطلق آزادی حاصل کرے۔ لہٰذا یہ واضح ہوا کہ جمہوریت کا مطلب آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ اس بات کی آزادی ہے کہ سرمایہ کی گردش اور بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل پر کوئی قدغن نہ ہو اور تمام اعمال اور اداروں اور اقدار کو اسی بنیاد پر جانچا جائے جو لوگ اس میں معاونت کریں وہ انسان اور مہذب انسان ہیں اور جو اس کے دشمن ہوں انہیں تہس نہس کر دیا جائے۔ یہی آزادی ہے یہی دستور ہے اور یہی جمہوریت اور حقوق انسانی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

سرمایہ دارانہ افکار ونظریات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغربی تہذیب کے اصول ومبادی

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری

مغربی تہذیب چند جغرافیائی حد بندیوں کی مرہون منت نہیں بلکہ کچھ خاص عقائد (مابعد الطبیعات)' اقدار اور نظریات پر مبنی ایک مخصوص ذہنیت کی عکاس ہے۔ کسی بھی تہذیب میں انسان کا ایک خاص تصور اور مقام ہوتا ہے۔ اگر اس تصور انسان کو اپنا لیا جائے تو اس تہذیب کو (انہی) علمی بنیادوں پر رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مغرب کی تہذیبی برتری اس کی فکری برتری میں پنہاں ہے۔ کسی بھی تہذیبی غلبہ میں گو کہ عسکری عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' لیکن تاریخ شاہد ہے کہ محض عسکری بنیادوں پر حاصل کردہ غلبہ زیادہ دیر پا نہیں ہوتا ہے۔ کسی تہذیب کا زوال اس کی علمی بنیادوں کی شکست و ریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں سے ناآشنائی کا خمیازہ ہم تین صورتوں میں بھگت رہے ہیں۔

1۔ مغربی فکری بنیادوں پر غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل انتہائی مخلص اور دیندار افراد اپنے مقاصد کے حصول میں شدید ناکامی سے دوچار ہوئے (اور مسلسل ناکام ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ شیشم کے درخت سے آموں کے پھل کی توقع عبث ہے۔) اور بتدریج اپنے اسلامی تشخص سے محروم ہوتے چلے گئے۔

2۔ مغربی تہذیب کی فکر سے سطحی واقفیت رکھنے اور اس کی اساسی بنیادوں کو نہ جاننے کے باعث مغربی فکر کو ناقابل شکست تسلیم کر لیا گیا اور معذرت خواہانہ جواز پیش کر کے ہر مغربی خیال اور نظریے کو اسلامیانے (Islamization) کی کوشش کی جاتی رہی۔

3۔ مغربی فکر کی شکست و ریخت سے ناواقفیت کی بنا پر ہم میں سے اکثر دور تنویر کو اسلامی فکر کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں۔ اور مغرب کی مادی ترقی کو اسلامی فکر کی مرہون منت گردانتے ہیں۔ اس طبقے کے افراد دور حاضر میں بھی اٹھارویں' انیسویں صدی کی مغربی فکر کا راگ الاپ رہے ہیں اور اس علمی بحران سے بالکل ناآشنا ہیں جس کے باعث مغربی تہذیب اپنی فکری بنیادوں مثلاً اپنے مخصوص تصور انسان' تصور خیر اور مقصد حیات وغیرہ کو عقلی بنیادوں

پر ثابت کرنے کی کوشش سے رجوع کر چکی ہے۔

ان حالات میں ہم ناچیزوں کی رائے میں مغربی تہذیب کو فکری بنیادوں پر اکھاڑ پھینکنے کے امکانات جتنے آج موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ غلبۂ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل تمام قوتوں کو' خواہ وہ عسکری' معاشرتی' تحریکی اور سیاسی نوعیت کی ہوں یا علمی فکری نوعیت کی' باہم ایک دوسرے سے مربوط کر کے ایک دھارے میں سمو دیا جائے۔ اور کسی ایک کے کام کو کسی دوسرے کے کام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اور ہر کام کو غلبۂ اسلام کے ہمہ وقتی اور آفاقی کام کا حصہ اور جزو لاینفک سمجھا جائے۔

خاکسار کا مقصد ان فکری بنیادوں کی نشاندہی کرنا ہے' جو مغربی تہذیب کی علمی اساس قرار دی جاتی ہیں۔ تاکہ ان فکری بنیادوں کو ان کی روح و تاریخیت کے ساتھ جان کر فکر اسلامی کو درپیش خطرات سے بچایا جا سکے۔ اور احیاء اسلام کے عظیم کام میں اس ناچیز کا بھی حصہ شامل ہو جائے۔

عیسائیت کی شکست وریخت:

مغربی تہذیب کا ارتقاء عیسائیت کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہے۔ عیسائیت میں خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے لیے احکام موجود تھے' لیکن بندے کے بندے سے تعلق کے لیے واضح احکام موجود نہ تھے۔ لہٰذا سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے جو قوانین مرتب کیے گئے۔ وہ بنیادی طور پر رومی قوانین (جو کہ بنیادی طور پر سیکولر نوعیت کے تھے) سے اخذ کردہ تھے۔ عیسائی فکر کی اسی بنیادی کمزوری کے باعث ریاست اور معاشرہ کے مابین تصادم کا عنصر اپنی ابتداء ہی سے موجود تھا۔ اور آگے چل کر خود مخلص عیسائی مفکر آگسٹین نے City of man کو City of god سے الگ کر کے سیکولرازم کے لیے مضبوط جواز فراہم کر دیا۔ شادی نہ کرنا' رہبانیت' زائد عبادات وغیرہ' جس کے باعث گرجا سے وابستہ لوگوں (مرد و عورت) کے عام معاشرے سے کٹ جانے کی مذہبی بنیادیں موجود تھیں۔ اس غیر فطری طبقہ بندی کا نتیجہ طبقاتی کشمکش کی صورت میں برآمد ہوا اور عیسائی علماء نے مذہب کی من مانی تعبیر و توضیح کے ذریعے عام فرد کو مذہب سے باغی کر دیا۔ کیتھولک چرچ کی برتری کا نتیجہ پروٹسٹنٹ ازم کی صورت میں برآمد ہوا۔ لوتھر بذات خود ایک پادری تھا۔ اس نے تحریک اصلاح کی بنیاد رکھی' جس کو بعد میں کیلون نے مزید تقویت بخشی۔ پروٹسٹنٹ ازم کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ ہر عیسائی کو بائبل کی تفسیر کرنے کا مکمل' یکساں اور مساوی حق حاصل ہے۔

2۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری آمد تک ختم ہو چکا ہے۔

3۔ کسی کو کسی کے معاشرتی مرتبے کے تعین کا کوئی مذہبی استحقاق حاصل نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

4۔ لہٰذا دنیوی کامیابی کو اخروی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا جائے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر جو اقداری اجزا معاشرتی طور پر ابھر کر سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ آزادی (Freedom) 2۔ مساوات (Equality) 3۔ عقلیت (Rationality)

چونکہ ہر انسان یکساں طور پر عقل رکھتا ہے لہٰذا ہر ایک کو تفسیر انجیل کا مکمل یکساں اور مساوی حق حاصل ہوگا۔ اور اخلاقی و روحانی تربیتی اقدار کا تھوڑا بہت اہتمام جو عیسائیت میں موجود تھا اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔ خدا سے تعلق ختم ہو جانے کے باعث معاشرتی مرتبوں کے تعین کی روحانی بنیادی ختم ہو گئیں۔ اور اس کی جگہ مادی جاہ وحشمت قرب الٰہی کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ ازم میں پوپ کی قوت بھی بادشاہ کے پاس ہی ہوتی ہے۔

اگر دنیاوی کامیابی ہی اخروی کامیابی کا پیش خیمہ ہے تو سب سے زیادہ کامیاب انسان بادشاہ ہی تو ہوا۔ لہٰذا بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکتا ہے کیونکہ وہ اس کا مقدس حق رکھتا ہے اور کسی کو اس حق کے انکار کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بادشاہ کا یہی مقدس حق ایک پروٹسٹنٹ ریاست کی ابتدائی شکل میں ریاستی، سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل نو میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آگے چل کر یہی مقدس حق کا تصور مذہبی لبادے میں چھپے رومی اور یونانی سیکولر نظریات کے باعث ریاست کے مکمل طور سے سیکولرائز ہونے کا باعث بنا۔ اسی مقدس حق کے تصور نے دنیا میں حاکمیت الٰہی کے دروازے بند کر دیے اور مسیحیت محض ایک انفرادی حیثیت میں خدا سے ایک خاص تعلق رکھنے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بعد میں یہی مقدس حق ایک فرد یعنی بادشاہ سے لے کر تمام شہریوں یعنی سٹیزنز میں یکساں اور مساوی تقسیم کر دیا گیا۔ پہلے حق و باطل، خیر و شر کے تعین کا مطلق حق صرف ایک فرد یعنی بادشاہ کو حاصل تھا مگر بعد میں یہی حق شہریوں کی رائے کی بنیاد پر جانچا جانے لگا، جس کی موجودہ شکل جمہوریت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادیں:

گو کہ پروٹسٹنٹ ازم نے فکر جدیدیت کی ٹھوس بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم پروٹسٹنٹ فکر کو جدیدیت سے دو بنیادوں پر ممیز کر سکتے ہیں۔

1۔ پروٹسٹنٹ ازم کا مطلق نصاب انجیل کی صورت میں موجود ہے۔ جبکہ جدیدیت کا کوئی ایسا مطلق اور قطعی نصاب موجود نہیں۔

2۔ پروٹسٹنٹ فکر میں آزادی کا محدود تصور خاص علمی بنیادوں پر ہے۔ جب کہ جدیدیت آزادی کے لامحدود تصور پر یقین رکھتی ہے۔

نصاب مطلق سے مراد یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فکر تفسیر انجیل کا حق ہر عیسائی کو دیتی ہے لیکن کسی بھی مصدقہ تفسیر

کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انجیل ہی سے کی جائے، لہٰذا کسی نہ کسی طور پر وحی کی حیثیت برقرار رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی پروٹسٹنٹ عقائد کا حامل فرد (خالص علمی بنیادوں پر) تفسیر انجیل کی بنیاد پر خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔ یا مثال کے طور پر تفسیر انجیل کی بنیاد پر لواطت کو جائز قرار دینا آسان نہیں ہے۔ جبکہ جدیدیت کا چونکہ کوئی نصاب مطلق موجود نہیں ہے لہٰذا افلاح انسانیت کی کوئی بھی تفسیر و تعبیر کی جا سکتی ہے، اگر کسی جدید مفکر کے کام میں خدا کے وجود کی عقلی دلیل موجود ہے تو کسی دوسرے فلسفی کے کام میں خدا کے انکار کا بھی عقلی جواز موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ ازم گو کہ عیسائیت ہی کی بہت جدید شکل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں مطلق آزادی کے حصول کے امکانات موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کی تلوار کی کاٹ سے عیسائیت کی یہ پروٹسٹنٹ بھی محفوظ نہ رہ سکی اور جدیدیت ایک لادینی تہذیب کے ارتقاء کا سبب بنی۔

جدیدیت کا بانی:

ڈیکارٹ (Descart) کو ہم جدیدیت کی فکر کا بانی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے جدیدیت کی علمیت کی حدود کا نہ صرف تعین کیا بلکہ بچی کھچی مذہبیت کو بھی علمی بنیادوں پر اکھاڑ پھینکا اور ایک نئے اقداری ڈھانچے کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ ڈیکارت نے وجود انسان کے ادراک میں کسی بھی خارجی عامل کے کردار کو کلی طور پر رد کر دیا اور (Self knowledge) کی خالص عقلی دلیل دی اس کے مطابق علمی اور عقلی بنیادوں پر کوئی بھی انسان اپنے علاوہ کسی بھی چیز خواہ وہ خیالات ہوں یا اقدار، معیارات خیر و شر ہوں یا وحی، اور چاہے خدا کا وجود غرض کسی بھی چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ اکیلی میری (عقل) ذات، میرا اپنا وجود ہے۔ جس کا ہونا کسی بھی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ڈیکارت کے نزدیک واحد قائم بذات سچ "میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں" ہی ہے۔ یعنی میں اپنے اسی دنیا میں ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں نا کہ کسی خالق کائنات کے وجود کی بنیاد پر (میں ہوں)۔ ڈیکارت کے مطابق میری عقل کی "استطاعت" "نہیں" کہ میرے اپنے وجود کے علاوہ کسی بھی دوسری ذات کے وجود کا ماورائے شک جواز پیش کر سکے۔ اس طرح ڈیکارت نے ایک ایسی علمیت کی بنیاد رکھی جو کہ اولاً مابعد الطبیعات (وحی) سے ماورا تھی اور دوم ریب (Doubt) پر قائم تھی۔ یوں تو جدیدیت کی کوئی ایک تعریف موجود نہیں لیکن جدیدیت سے متعلق چند بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ انسان کائنات کا مرکز و محور ہے۔ (Anthropocentricity)

2۔ آزادی بنیادی آئیڈیل ہے۔

3۔ مساوات بنیادی قدر ہے۔ (Equality is value)

4۔ عقلیت بحیثیت معیار۔ (Reason is the criterior)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدیدیت نے چونکہ علمی بنیادوں پر صرف اور صرف وجود انسانی کو ہر شک وشبے سے عاری پایا تھا۔ چنانچہ کائنات کو صرف اور صرف انسانی پیمانوں پر پرکھنا ہی علمیت کی میراث قرار پایا۔ اور انسان پرستی (ہیومنزم) کو اقداری ڈھانچے میں کلیدی اور قطعی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دوسری تمام جدیدیت پسند مفکرین کے یہاں اس بات پر اجماع نظر آتا ہے کہ انسان آزاد تو ہے ہی سوال یہ ہے کہ اس آزادی کے دائرہ کو کس طرح زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ اس طرح آزادی کی بڑھوتری ہی انسانیت کی معراج قرار پائی کہ چونکہ جدیدیت میں انسانی ذات کی اساس اس کی عقلیت میں پنہاں ہے لہٰذا ہر انسان برابر ہے اور عقلیت ہی خیر وشر کے پرکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ عقل کی بنیاد پر قطعی اور آفاقی سچ کا حصول ممکن ہے۔ جب انسان کو ہی تمام خیر وشر کے تعین کا حق حاصل ہے تو ایسی صورت میں خدا پرستی کا کیا سوال؟ حقیقتاً اگر دیکھا جائے تو جدیدیت نے خدا کی جگہ ایک ریشنل (عقل پرست) شخص کو بٹھا دیا۔ جدیدیت انسان کی الوہیت کی طرف دعوت ہے آزادی زیادہ سے زیادہ حصول اور اس کی مستقل بڑھوتری انسان کی الوہیت کا اظہار ہیں۔ جدیدیت انسان کو خدا اور دنیا میں جنت بنانے کی ایک شعوری اور عملی کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے کسی بھی مفکر کے کام کو اٹھا کر دیکھیں تو اس میں کہیں بھی کائنات کے دائمی ہونے کی نفی نہیں ملتی۔ اگر اس دنیا کو کبھی فنا نہیں ہونا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دنیا میں اپنے قیام کو طویل اور پر لطف بنانے کی کوشش کرے۔ ماڈرنسٹ علمیت جس کلمہ پر لوگوں کو جمع کر رہی ہے وہ انسان پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ لا الہ الا انسان یعنی نہیں کوئی معبود سوائے انسان کے اس صورت میں خدا پرستی کا گمان خارج از امکان ہے۔ حادثاتی طور پر تو جدیدیت پسند معاشرے میں خدا پرستی ممکن ہے مگر اس کی کوئی علمی بنیاد پوری جدید فکر میں کہیں نہیں ملتی۔ مغربی فکر میں انسان پرستی کی بہت سی شکلیں موجود ہیں۔ یہاں پر ہم صرف دو سے بحث کریں گے۔

1۔ لبرل ازم 2۔ کیمونیٹیرینزم

16 ویں صدی کے بعد یورپ میں دو ہمہ گیر تحاریک کو فروغ ملا۔ یہ دونوں تحریکیں (انلائٹمنٹ اور رومانٹسزم) عیسائیت کو مکمل رد کرتی تھیں اور ایک نیا تصور انسان و کائنات اور نیا مقصد حیات پیش کرتی تھیں۔ ان دونوں تحریکوں نے انسانی ترقی کو اس بات پر منحصر قرار دیا کہ انسان کو کتنا آزاد ہونا چاہیے۔ ان دونوں تحاریک نے آزادی کو بنیادی قدر اور ہدف کی حیثیت سے قبول کیا۔ آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر وہ چیز حاصل کرنے کا مکلف ہو جائے جس کی وہ خواہش کرتا ہو اور بحیثیت انسان اس کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ خیر وشر کے معیارات خود متعین کرنے کا اہل ہے۔

کیمونیٹیرین ازم اور لبرل ازم دراصل انلائٹمنٹ اور رومانویت کی تحاریک کے جانشین نظریات ہیں۔ لبرل

ازم اور کیمونیٹیرین ازم میں اہم ترین قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں آزادی کو افضل ترین مقصود کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں کا اس بات پر ایمان راسخ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے قیام اور وجود کا اہم ترین کلیدی مقصد حصول آزادی ہے۔ آزادی دراصل مقصود بالذات ہے نہ کہ خدا پرستی اور رضائے الٰہی کا حصول۔ دونوں نظریات آزادی سے یہی مراد لیتے ہیں کہ انسان جو چاہے وہ حاصل کر سکے۔ اور حصول لذات کی راہ میں مادی اور معاشرتی قیود یکسر ختم ہو جائیں۔

لبرل ازم کا فروغ سولہویں صدی سے ہونا شروع ہوا اور اس کا غلبہ انقلاب فرانس کے بعد تمام مغرب پر قائم ہوا۔

لبرل ازم کا دعویٰ تھا کہ جب عیسائی قدروں کی معاشرتی گرفت کمزور ہوگی اور معاشرے کی ترتیب عقلی اور سیاسی بنیادوں پر کی جائیگی تو حصول آزادی آسان سے آسان تر ہوتا جائے گا اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے خیر وشر کے معیارات کا تعین کر سکنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات با آسانی پورا کر سکے گا۔ کیمونیٹیرینز کے نزدیک افراد خیر وشر کے معیارات کا تعین اپنے اغراض ومیلانات کی بنیاد پر کرنے کے مکلف نہیں۔ بلکہ خیر وشر کے معیارات کا تعین نوع انسانی کی مجموعی انسانی دنیاوی اغراض کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لبرل ازم میں فرد اپنی الوہیت کے اظہار کا تنہا مکلف ہے جبکہ کیمونیٹیرین ازم کی فکر میں انسان بحیثیت نوع کے کلاس یا قوم ونسل کے اپنی الوہیت کے اظہار کا حق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی اور سوشل ازم کیمونیٹیریزم ہی کی اضافیت (Extention) ہیں۔

گو کہ لبرل ازم اور کیمونیٹیریزم فکر میں آزادی بنیادی قدر ہے اور دونوں ہی فکریں بنیادی طور پر انسان پرست (Humanist) ہیں۔ لیکن لبرل اور کیمونیٹرین آزادی کے مختلف تصورات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی بنیاد پر، بہت سی خالص مذہبی تحریکیں سوشل ازم اور قوم پرستی کا شکار ہوتی نظر آتی ہیں۔

آزادی کیا ہے؟

آزادی سے مراد ہے کہ انسان اپنے خیر وشر کے معیارات کے تعین کا نہ صرف خود مجاز بلکہ حقدار ہے اور اس کی انسانیت کا جوہر ہی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ متعین کردہ اقدار کو اپنا سکے اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔

اس کا بہترین اظہار ہمیں مغربی مفکر کانٹ (kant) کے یہاں ملتا ہے جو انسان کو مقصود بالذات End in (Himself) قرار دیتا ہے وہ ایک جگہ کہتا ہے کوئی بھی کام یہ سوچ کر نہ کرو کہ تم ذریعہ ہو بلکہ ہر کام یہ سوچ کر کرو کہ تم ہر چیز کا مقصد ہو۔

مغربی مفکرین نے آزادی کی دو اقسام بیان کی ہیں: 1۔ آزادی کا منفی تصور 2۔ آزادی کا مثبت تصور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی کا منفی تصور: (لبرل ازم کے نزدیک)

آزادی کا منفی تصور یہ ہے کہ معاشرہ جو ناگزیر پابندیاں لگاتا ہے اس کے باوجود انسان کے پاس ایک ایسا علاقہ بچ رہنا چاہیے جس میں وہ اپنی خدائی کا اظہار کرنے کا موقع رکھتا ہو اور اپنے متعین کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔ آزادی کے منفی تصور میں اس بات سے بحث نہیں کی جاتی کہ انسان اس دائرہ کار میں کس قسم کی زندگی گزارے گا؟ بلکہ صرف اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرتی اور ریاستی جکڑ بندیوں کے درمیان ایک ایسا علاقہ ضرور بچ رہنا چاہیے جس میں انسان جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکے اور کر بھی گزرے اور اس معاملے میں کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ وہ اس علاقے میں چاہے کچھ بھی کرے یہ وہ مقدس حق (Divine right) ہے جس کے اندر کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ یاد رہے کہ اس مقدس حق کی مذہبی بنیاد ہمیں مسیحیت کے پروٹسٹنٹ دھڑے میں واضح طور پر ملتی ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ انفرادی حقوق کا سارا معاملہ اس مقدس حق آزادی کا تحفظ ہے جس میں آزادی فکر و نظر، حق ملکیت، اظہار رائے وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے اس تصور کے نتیجے میں پبلک اور پرائیوٹ زندگی کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس تصور کے مطابق فرد اپنی نجی زندگی میں کسی کو بھی مداخلت کا حق نہیں دیتا۔ مقصود یہی ہے کہ فرد کی آزادی زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک وسیع ہوتی چلے جائے۔ تاکہ اس کی خدائی میں اضافہ ہو سکے۔

منفی تصور آزادی سے اخذ کردہ چند اہم نتائج مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی درحقیقت کچھ نہیں، یہ صرف وہ علاقہ ہے جہاں انسان جو کچھ چاہے کر گزرے۔ خود آزادی کچھ نہیں ہے۔ اس کی کوئی اصل (Content) نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل (Content) نفسانیت یا نفسانی خواہشات سے پر ہوتا ہے۔

۲۔ آزادی اقدار کی نفی ہے کیونکہ جب آپ کہیں گے کہ آزادی ایک ایسا علاقہ ہے کہ جہاں آپ جو چاہیں چاہ سکیں اور کر بھی گزریں اور جو آپ کر گزریں وہی حق ہے۔ تو اقدار کی بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہر شخص قدر خود متعین کرتا ہے۔ حالانکہ قدر کی تعریف ہی یہ ہے کہ جس کا پیمانہ انسان کی ذات نہیں بلکہ خارجی اور معروضی ہو۔ اگر ہر شے اور خواہش کی قدر یکساں ہے تو فی الحقیقت کسی شے کی کوئی قدر نہیں۔

۳۔ آزادی کے منفی تصور سے متصل تصور اقدار کے تعدد یعنی (Plurality of values) کا ہے۔ یعنی میری متعین کردہ قدر کسی بھی متعین کردہ قدر کے برابر ہے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ترتیب اقدار ناممکن ہے کیونکہ ہر شخص کی متعین کردہ اقدار یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ اقدار کی فوقیت صرف ارتکاز قوت (کثرت رائے یا کثرت مال) سے قائم کی جا سکتی ہے۔ اور اس فوقیت کا کوئی نظری جواز پیش نہیں کیا جا سکتا اور سب سے اہم مقدس حق کا یہ تصور عیسائیت کی مسخ شدہ شکل سے اخذ کردہ ہے۔

آزادی کا مثبت تصور: (کمیونٹیرین ازم کے نزدیک)

لبرل ازم کے برعکس کمیونٹیرینٹن ازم آزادی کا ایک مثبت تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں عقل ہمیں بتا سکتی ہے کہ آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے اس سلسلے میں روسو، ہیگل اور مارکس نے مثبت آزادی کے مختلف تصورات بیان کیے ہیں اس تصور آزادی کا حصول ایسے معاشرتی نظام میں ممکن ہے جس کے نتیجے میں انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکے۔ اس تصور میں آزادی کا اظہار انفرادی حیثیت کی بجائے افراد بحیثیت نوع یا قوم یا کلاس کے اجتماعیت میں کرتے ہیں۔ اس تصور آزادی کے حصول کے لیے لازماً فرد کو اپنی انفرادی آزدی اجتماعی آزادی کے حصول کے لیے قربان کرنا پڑتی ہے جس کے باعث اظہار آزادی کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے اپنی الوہیت کا ادراک کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ روسو کے نزدیک ایک معاہدہ عمرانی کے ذریعے ایک ایسے انقلابی معاشرے کے قیام کا امکان موجود ہے جس کے ذریعے آزادی کا حصول ممکن ہے۔ مارکس کے مطابق طبقاتی کشمکش کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکتی ہے۔ کمیونٹیرین ازم جس تعقل کو بنیاد بنا کر مثبت آزادی کو متشکل کرنے کا دعویدار ہے وہ بھی خواہشات کی غلام ہے۔ یعنی (Rationality bounded by desires) ہے اور اقدار کی آفاقی اور مستقل ترتیب کرنے سے قاصر ہے۔ اس تصور آزادی کو کمیونٹیرین ازم (Communitarianism) کی مختلف شکلوں (Forums) میں الگ الگ طرف سے آشکار (Realize) کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہم یہاں صرف دو اقسام (Forms) سے بحث کریں گے۔

۱۔ اشتراکیت (Socialism) ۲۔ قوم پرستی (Nationalism)

اشتراکی نظریہ کے مطابق پرولتاری یعنی مزدور طبقہ واحد آفاقی طبقہ ہے اور اس کے اغراض اور مفادات انسانیت کے اصل اغراض و مقاصد ہیں۔ لہٰذا معیارات خیر و شر کو پرولتاری طبقہ کے اغراض کی بنیاد پر متعین کرنا چاہیے۔ اس طرح نوع انسانی کی مجموعی آزادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

قوم پرستی جزوی طور پر اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار اجتماعیت میں کریں قوم پرستی کی دو بنیادی اقسام (Forms) ہیں:

۱۔ (Civil grounded nationalism) جس میں تمام افراد کسی خاص مملکت کے شہری ہونے کی بنیاد پر ایک ہی (قوم) اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں اور اس اشتراک عمل کا مقصد قوم کی اجتماعی آزادی کی بڑھوتری اور زیادہ سے زیادہ مادی وسائل و قوت کا ارتکاز ہے۔

۲۔ (Ethical / Racial ground nationalism) کے تصور میں تمام افراد ایک نسل سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ایک اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں، لیکن مقاصد کے حوالے سے دونوں تصور قوم پرستی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

قوم پرست نظریے میں بظاہر دنیاوی روحانیت کا عنصر اسلامی انقلابیوں کے لیے خاصا پرکشش ہے۔ چونکہ قوم پرستی بظاہر یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے انفرادی مفادات پر جان قربان کرنے کو تیار ہو جائیں گے اس لئے قوم پرستی کی بنیاد پر افراد اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار کریں لیکن چونکہ قوم پرستی کی جڑ بنیادی طور پر ابلیسیت پر قائم ہے لہٰذا ان جذبوں کا اظہار اپنی قوم کے لیے محبت' ایثار' قربانی اور غیر قوموں کے لیے نفرت کی صورت میں نکلتا ہے ان معنوں میں قوم پرستی قلب کی بیماری ہے جس میں افراد کے کسی مجموعے کو اپنا اور کسی دوسرے مجموعے کو غیر تصور کرنے لگتے ہیں اور اپنے افراد یا قوم کے لیے وہ اس پریشانی کا شکار رہتے ہیں کہ ان کی قوم کا جو مقام ہے وہ اسے حاصل نہیں ہے اس لیے قوم کو اس کے اعلیٰ مقام تک صرف ایک چیز پہنچا سکتی ہے اور وہ ہے قوت۔ اس لیے ہر قوم پرست کا مقصد اور ہدف اپنی قوم کے لیے قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور قوت کا یہ اضافہ پیمانہ معیار خیر و شر بن جاتا ہے اور افراد کے اندر اس قسم کے جذبات پروان چڑھتے ہیں کہ وہ چیز حق ہے جو سندھی' مہاجر' پٹھان' پنجابی' جرمن یا امریکی قوم کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو ہر وہ چیز حق ہے جو پاکستان کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو اس خیال کو اگر مزید پھیلا کر دیکھا جائے تو ہر وہ چیز حق ہے جو مسلمانوں کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو اور ہر وہ چیز باطل ہو جاتی ہے جو ایک قوم کی قوت میں کمی کا باعث بنے چاہے وہ چیز حق کے مسلمہ اصولوں پر کتنی ہی پوری کیوں نہ اترتی ہو چنانچہ اس طرح اخلاق ایک اضافی چیز بن کر رہ جاتا ہے اور دینی معیارات کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ دینی معیارات تو وحی کے ذریعے قائم کیے جاتے ہیں یعنی ان معیارات کو تخلیق کرنے میں انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن اب چونکہ قوت کا اضافہ اور کمی خیر و شر کا معیار قرار پاتے ہیں لہٰذا قوم کے افراد وہ معیار خیر و شر وضع کرتے ہیں جو لازماً ان کے خود سے محبت (self love) کا مظہر ہوں۔ اس طرح جو بھی معیارات بنائے جائیں گے وہ بنیادی طور پر نفسانیت ہی کی بنیاد پر ہی بنائے جائیں گے۔ گویا قوم پرست کے دل میں نفس کی پرستش' لالچ' حسد اور نفرت ڈیرا ڈال لیتی ہے۔ نفرت کے اس منفی جذبہ اور قوم سے محبت کے حوالے سے قوم پرست یہ بھی سوچتا ہے کہ اگر اس کی لذت کی خواہش قوم کی قوت کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے تو وہ اپنی اس خواہش کو ترک کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ قوت میں اضافے کے لیے اس کی جان بھی چلی جائے تو اس سے دریغ نہیں کرتا ہے ان مقاصد کے حصول کے لیے غیر پر ظلم کرنا حق سمجھتا ہے کیونکہ اس طرح غیر کی قوت میں کمی واقع ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام قوم پرست تنظیمیں متشدد ہوتی ہیں۔ قوت کی پرستش کرنے والا مسلم قوم پرست دعوت کے فریضے کو انجام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ دعوت کا مطلب غیر کو اپنانا ہے اور اگر مطمع نظر غیر سے نفرت ہو تو اس کے خلاف سازش کرنا' اس سے حسد کرنا جائز ہوا تو لازماً اس کو اسلام کی دعوت موثر طور پر نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح گو کہ ایک مسلم قوم پرست

مسلم قوم کی قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم پرستی کی کوئی بھی شکل دعوت کے آفاقی ہونے کی نفی کرتی ہے۔ ایک قوم پرست اپنے ملی تشخص کے ادراک کے لیے دوسری قوم کے وجود کو قابل جواز (Legitimate) قرار دیتا ہے اور ہمیشہ اس Paradoxical co-exitance کا شکار رہتا ہے۔ ایک قوم پرست کے پاس کوئی آفاقی دعوت نہیں ہوتی اور اپنے تشخص کی کلچرل' نسلی اور تاریخی بنیادوں پر متمیز کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔ ہماری دعوت کا ہدف لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا اور جہنم سے بچانا ہے مسلمان قوم کی قوت میں اضافہ ہمارا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ ہم مسلم قوم پرست نہیں ہیں اگر مسلم قوم پرستی کے نتیجہ میں پاکستانی معیشت سویڈن جیسی بن گئی لیکن تمام لوگ جہنم کے حقدار ہو گئے تو یہ صریح ناکامی ہو گی۔ دنیاداری' جاہ و حشمت اور رضائے الٰہی میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے لہٰذا ایک اسلامی انقلابی کو مسلم قوم پرستی سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔

دعوت اسلام ایک آفاقی تاریخ میں شامل ہو جانے کا نام ہے' جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے نتیجے میں تشکیل پائی ہے۔ لیکن اسلام نہ تو کوئی تاریخی طور پر مخصوص (Historically Specific) کسی خیر/ سچ کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور نہ ہی اسلام مسلمانوں کی جاہ و حشمت کا قیام چاہتا ہے بلکہ اسلام کا صرف ایک مقصود ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول۔ دعوت کی بنیاد محبت ہے داعی کا کوئی غیر نہیں ہوتا' وہ ہر شخص کا خیر خواہ ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد قریش کے ساتھ جو حسن سلوک کیا وہ ایک انقلابی اور ایک قوم پرست کی قلبی کیفیت کے بنیادی فرق کو واضح کرتا ہے۔ احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل جہادی تحریکوں سے وابستہ پرخلوص نوجوان کارکنوں کو قوم پرستی کی زہرناکی سے بچانا ہم سب کا اہم ترین فریضہ ہے۔ قوم پرستی میں صرف وہ اقدار فوقیت رکھتی ہیں جو قوت میں اضافے کا باعث ہوں اور ان اقدار کو ناپسند کیا جاتا ہے جو قوت میں کمی کا باعث بنیں اس طرح معاشرے میں وہ افراد ہی بہتر خیال کیے جاتے ہیں جن کی قوت زیادہ ہو اور وہ اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت جمع کر سکیں اس طرح قوم پرستی کے شخصیت پرستی میں مدغم ہو جانے کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ قومی ہیروز اپنی قوم کو طاقتور بنانے کے لیے مذہب' اخلاقیات' انسانی جذبوں اور لطیف رویوں کو روندتا ہوا ناپائیدار قوت کے زیادہ سے زیادہ ارتکاز میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے جو یقیناً احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف قوتوں کے لیے زہر قاتل کا کام کرتا ہے۔

تجزیہ:

سب سے پہلی بات جس کا ادراک نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ خواہ لبرل ازم ہو یا کمیونیٹرین ازم کی کوئی بھی صورت (قوم پرستی خواہ سوشل ازم) ان کا ہدف ایک ہی ہے' یعنی حصول آزادی' گویا ہر فرد کو اس قابل بنانا کہ وہ جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہے وہ چاہ سکے اور اسے حاصل بھی کر سکے۔ بظاہر اشتراکیت لبرلزم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ افراد کی آزادی کا حصول انفرادی ملکیت اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ممکن نہیں۔ لیکن روس میں پچھتر سالہ اشتراکی تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وسائل کو قومی ملکیت میں لے کر بھی آزادی کا یہ ہدف حاصل نہ کیا جا سکا۔ روس کے عوام کی ایک بڑی اکثریت نے اشتراکیت سے برأت کا اعلان کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ سرمایہ دارانہ لبرل ازم کو حصول آزادی کا بہتر طریقہ سمجھتے ہیں اور روس میں اس کے احیاء کے لیے بڑے سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہاں سے ہم انسانیت پرستی لبرلزم اور سرمایہ داری میں ایک قدر مشترک پاتے ہیں، اور یہ تینوں نظریات ایک دوسرے کی معاونت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسلامی انقلابی نوجوان جو ان تینوں نظریات کو (علیحدہ علیحدہ رکھ کر) جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس فطری تعلق کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں جو مغربی تہذیب کی اساس کا درجہ رکھتا ہے یعنی ''آزادی''۔

مغربی تہذیب کی بنیاد انسان پرستی پر ہے یعنی انسان خود مقصود ہے اور اس دنیا میں اسکی آمد کا مقصد زیادہ سے زیادہ لذت اور اپنی خواہشات کی تکمیل ہے۔ مغرب اس بات پر یکسو ہے کہ انسان پرستی صرف آزادی کے حصول کے بعد ہی ممکن ہے۔ گویا دنیا میں کامیابی کے لیے آزادی کا حصول لازمی قرار پاتا ہے۔ یہی وہ قدر ہے جسے حاصل کر کے انسان انسان بن جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آزادی بذات خود کچھ نہیں ہے۔ اس کی ٹھوس ہیئت (Concrete form) سرمایہ ہے اور اس کی مجرد شکل ووٹ ہے، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ کیمونیٹرین ازم (communitarianism) بھی Humanism ہی کی ایک شکل ہے تاہم انسانیت پرستی کے لیے پھلنے پھولنے کے امکانات ایک لبرل معاشرے میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ ایک لبرل معاشرہ میں سرمائے کی بڑھوتری کے امکانات اشتراکی معاشرے سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور سرمایہ کی بڑھوتری دراصل آزادی کی بڑھوتری کا ہی دوسرا نام ہے۔

لبرل ازم میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فرد بحیثیت فرد کے مقصود ٹھہرتا ہے، اگر انسان اپنی آزادی کا شعور حاصل کر لینے کے بعد اپنی انفرادی آزادی کو کسی شے پر قربان کر دے تو لبرل معاشرے کی نگاہ میں وہ انسان ہی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسان کی انسانیت اس کی آزادی میں پنہاں ہے۔ اب اس آزادی کے حصول کی دو معاشرتی صورتیں ہیں۔

1۔ افادیت پسندی (Utilitarianism) 2۔ رالسی نظریہ (Rawlsianism)

افادیت پسندی کے نظریے میں معاشرے کی مجموعی فلاح کے نام پر لبرل اقدار کا تحفظ کیا جاتا ہے افادیت پسند انسان کی آزادی کے قائل ہیں لیکن اس کے نتیجے میں مجموعی فلاح کی بڑھوتری ضروری خیال کرتے ہیں۔

افادیت پسندوں کے مطابق ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں کم لوگوں کی افادیت اور حقوق قربان کیا جانا جائز ہے یعنی اگر کسی عمل کے ذریعے زیادہ لوگوں کو فلاح حاصل ہو رہی ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز۔ یعنی ایسے معاشرے میں شراب کے ناجائز ہونے کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اس سے لوگوں کی صحت خراب ہو رہی ہو اور وہ دنیا میں زیادہ لذت کے حصول سے محروم رہے۔

رالسی نظریہ افادیت پسندی کا جزوی رد ہے۔ رالس کے مطابق افادیت پسند معاشرے کو ایک فرد کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس کے نتیجے میں افادیت پسندی انسان کی آزادی پر حد لگا کر اسے محض لذات کے حصول کے ذریعہ بنا دیتی ہے جس کے باعث وہ اپنی انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ رالس لبرل معاشرے کا جو تصوراتی خاکہ پیش کرتا ہے وہ خود غرض (Self intersted) افراد کا ایسا گروہ ہے جو باہمی رضامندی سے ایک ایسا سماجی معاہدہ ترتیب دیتا ہے، جس کی بنیاد عدل کے ان دو اصولوں پر قائم ہے۔

۱۔ ہر فرد کو اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے ممکنہ حد تک آزادی مہیا کی جائے۔

۲۔ معاشرے کے پسماندہ ترین گروہ کے مفادات کو حتی الوسع فروغ دیا جائے۔

رالس کے مطابق ان مفادات کے حصول چند ابتدائی ''خیر'' میں پنہاں ہے اور یہ بنیادی ابتدائی خیر حسب ذیل ہیں:

۱۔ دولت (Wealth) ۲۔ آمدنی (Income)

۳۔ قوت (Power) ۴۔ اختیار (Authorty)

رالس کے مطابق یہی چار اشیاء قدر مطلق کی حامل ہیں اور ان میں اضافہ دراصل آزادی میں اضافے کا مماثل ہے۔ چونکہ یہ بنیادی آزادی کے اظہار کے لیے نہایت ضروری ہیں اس لئے دوسرے لفظوں میں ایک لبرل معاشرے میں آزادی ان اشیاء کی بڑھوتری کا ہی نام ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لبرل یا مغربی تصور آزادی خالص مادی نوعیت کا ہے اور اس تصور کے عام ہونے کا مطلب مذہبیت، روحانیت، عقیدۂ آخرت، احیائے دین اور حصول رضائے الٰہی کی خواہش کی پامالی کے سوا کچھ اور نہیں یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں رالس مفادات کا خالص مادہ پرستانہ تصور پیش کرتا ہے جس میں افراد کی آزادی کی بڑھوتری کا انحصار مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ پر مبنی ہے۔ لہٰذا قومی پیداوار میں اضافہ ایک ایسا آفاقی ہدف قرار پاتا ہے جس کو قبول کرنے پر ہر شخص کی خود غرضی اسے اکساتی ہے چنانچہ لبرل معاشرہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ پیداواری ترقی فروغ خود غرضی کے بغیر ممکن نہیں گو کہ اس خود غرضی کو فروغ دینے کے نتیجے میں دولت قوت وغیرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

کی تقسیم لامحالہ غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان اسلامی انقلابیوں کو جو بہبود انسانی اور سرمائے کی بڑھوتری اور بنیادی انسانی حقوق کے حصول کو اسلامی انقلاب کی بنیاد سمجھتے ہیں ان کو یہ جان لینا چاہئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے مغرب اسلامی تحریکوں سے زیادہ راسخ العقیدہ ہے اور ان مقاصد کے حصول کا احیاء اسلام سے کوئی لازمی تعلق (Equal morl status) نہیں۔

رالس اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرتی غیر مساویانہ تقسیم دولت وقوت افراد کی اخلاقی مساوی حیثیت کی نفی نہیں کرتی گو کہ رالس کے مطابق اخلاقی مساوی حیثیت سے مراد ہے کہ ہر شخص کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خیر وشر کے معیارات کا خود تعین کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود ایک لبرل معاشرے کے سرمایہ درانہ معاشرے میں تبدیل ہو جانے کے امکانات سو فیصدی ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لبرل معاشرہ آزادی کے لامحدود تصور پر یقین رکھتا ہے جو کہ پیداوار میں لامحدود اضافہ کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیداوار میں لامحدود اضافہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی ایک حد ہے جبکہ سرمائے میں اضافہ کی کوئی حد نہیں ہے لہٰذا سرمایہ درانہ عمل کی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرے میں موجود افراد کی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور اس کے حرص وحسد کو مزید بھڑکایا جائے تاکہ وہ اپنی انفرادی آزادی کے حصول کے لیے سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں شریک ہو جائے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لبرل معاشرے لازماً سرمایہ درانہ معیشت کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔

حرف آخر: لبرل ازم اور کمیونزم ـــ درحقیقت ایک ہی جڑ سے نکلے ہیں

مغربی تہذیبی بنیاد کے اس مختصر خاکے سے ہم اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت اور لبرلزم کا ہدف ایک ہی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ آزادی کا حصول اشتراکیت کا دراصل لبرلزم پر اعتراض ہی یہ ہے کہ اس سیاسی، ریاستی اور معاشی، سماجی ڈھانچے میں حصول آزادی ممکن نہیں لیکن روس میں اشتراکیت کی شکست سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے حصول کی خواہش کی تکمیل کے لئے لبرلزم اور سرمایہ داری جو سیاسی اور معاشی نظام وضع کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور مربوط ہیں۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے لبرلزم اور کمیونیٹریئنزم دونوں ہی نظام ہائے حیات میں کوئی اقداری فرق نہیں۔ دونوں کا مقصود انسان کو خدا بنانا ہے دونوں خواہشات کو پرکھنے اور ان کو ترتیب دینے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں رکھتے دونوں کا مطمح نگاہ صرف حصول دنیا ہے وہ انسان کو خود غرض، لالچی اور حاسد بناتے ہیں اور فطرت انسانی کو مسخ کرتے ہیں، روحانی ارتقاء کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اسلامی انقلابیوں کو ان دونوں نظاموں کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا عزم کرنا چاہئے۔

الغرض اس مضمون سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ تصورات کو اگر ان کے تاریخی تسلسل سے کاٹ کر دیکھا

مغربی اصطلاحات کو تاریخ سے کاٹ کر اسلامی بنانے کی کوشش کرنا

جائے تو اس بات کا شدید احتمال رہتا ہے کہ ہم ان تصورات کے اندرونی تفرقات کو بالکل نظر انداز کر دیں جو اس تصور کی زہرناکی کو ہم پر آشکارا کر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا پھر ان اندرونی تفریقات میں پھنس کر رہ جائیں گے اور تصور کا مجموعی تاثر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا مغربی تصورات کے اس تاریخی عدم تسلسل یا دوسرے معنوں میں Libral توضیح کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان غیر اسلامی اقسام (Forms) کے لئے اسلامی بنیادیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ مغربی تصورات مثلاً لبرلزم، قوم پرستی، انسان پرستی، اشتراکیت وغیرہ کو اگر ایک خاص تاریخ میں اور خاص تاریخ میں ان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ریاستی صف بندی کیں دیکھیں جو ان تصورات کے معنی و مطالب کے ادراک کے لیے ضروری اور نامیاتی طور پر منسلک ہیں تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ ان تصورات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

آزادی، مساوات، فلاح انسانی، عدل وغیرہ کو اسلام کلیتہً رد نہیں کرتا لیکن ان تصورات کے معنی و مطالب اس تاریخیت میں پنہاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے منسلک و پیوستہ ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مغربی تصور برداشت (Tolerance) کو آپ اسلام کے تصور صبر کے مماثل کر لیں اور اس کی حمایت میں قرآن وحدیث کو بھی بطور دلیل پیش کر دیں لیکن یہ ان تصورات کی مجرد تفسیر ہوگی اور ان ہی علمی بنیادوں پر استوار ہوگی جو کہ غالب اکثریت کی عقلیت سے مطابقت رکھتی ہوں اس طرز فکر کا لامحالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ آپ اسلام کو مغربی اقسام (Forms) میں ٹھونستے چلے جائیں گے اور اس کو عین عبادت بھی سمجھتے جائیں گے، اس تناظر میں اگر ہم 1857ء سے لے کر آج تک اپنی جدوجہد پر نگاہ ڈالیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی انقلابی تحریک بھی مغربی تہذیبی اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی اور ہم نے بہت سے ایسے اسلامی جواز (اسلامی علمیت کی بنیاد پر) پیش کیے جن کے سہارے میں جمہوریت، حقوق کی سیاست، سیکولرازم، مقننہ، آئین وغیرہ جیسے تصورات اسلامی سیاست کا جزو لاینفک متصور ہونے لگے۔ اور ان کو خالص اسلامی تصورات کے یا بعض معنیٰ میں غیر اقداری (Value Nutural) تصور کر لیا گیا۔ اس بات کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ بنیادی طور پر غیر اسلامی اقسام (Forms) کے ذریعے غلبۂ اسلام ممکن نہیں ہو سکتا جس لئے کہ ان اقسام (Forms) کو استعمال کرنے کے نتیجے میں ایک خاص قسم کی علمیت، عقلیت، تصور کائنات، تصور انسان تشکیل پاتا ہے، جو کہ لامحالہ اسلامی تصورات سے متصادم ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ علمیت

محمد زاہد صدیق مغل

کسی تہذیب کا تصور علم اسکے اہداف ومقاصد کے اظہار کا سب سے بلند ترین درجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت تصور علم ہی وہ اساس ہے جہاں کسی تہذیب کے مقاصد علمی وفکری سطح پر متشکل ہوتے ہیں۔ ہر تصور علم ایک تہذیب کے حیات انسانی کی حقیقت کی بابت مابعد الطبعیاتی ایمانیات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ یعنی یہ سوال کہ علم کیا ہے کا جواب مقصد علم کے بغیر دینا ناممکن ہے اور یہ مقصد لازماً ایک مابعد الطبعیاتی ایمان پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی بات ہے جس پر غور نہ کرنے کے سبب کئی اہل علم وفکر نے مغربی علوم کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنے نیز انکی اسلام کاری کرنے کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ غلط فہمی کہ مغربی علوم ایک اٹل حقیقت ہیں نیز انکی بنیاد ایسے آفاقی تصورات پر قائم ہے جو انسانیت بحیثیت مجموعی کا مظہر ہیں بھی اسی سوال پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح ماہیت علم اور ایمانیات کا تعلق نظر انداز کرنے کے نتیجے میں یہ فکری کجی بھی عام ہوئی کہ مسلمانوں کو مغربی علوم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس مضمون میں ہماری کوشش ہوگی کہ ہم علم بحیثیت مجموعی اور سرمایہ دارانہ (یا سائنسی) نظریہ علم کی حقیقت واضح کریں۔

ترتیب مضمون: تین اہم سوالات

حقیقت علم کی تفہیم کے ضمن میں تین سوالات کے جوابات اصل اہمیت کے حامل ہیں:

۱) علم کیا ہے، یعنی اسکی نوعیت وماہیت (Nature) کیا ہے؟

۲) علم کہاں سے آئے گا، یعنی منبع علم (source of knowledge) کیا ہے؟ منبع علم کی تشخیص کے ساتھ ہی اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس منبع علم سے حاصل ہونے والے علم کی صحت وعدم صحت (validity) کا معیار کیا ہے؟

۳) اس مخصوص منبع علم سے حاصل شدہ معلومات کن شکلوں میں متشکل (embodiement) ہوئیں، یعنی اس نظریہ علم کا اظہار کن علوم کی شکلوں میں ہوا؟

سرمایہ دارانہ یا سائنسی علمیت کے ضمن میں ان تینوں سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے ایک طویل مضمون درکار ہوگا لہذا خوف طوالت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس مضمون میں ہم صرف پہلے سوال کا تفصیلی جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ اس سوال کا جواب سمجھنے کیلئے تین امور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے:

(الف) علم کی نوعیت وماہیت کا حقیقت کی بابت ایمانیات سے تعلق

(ب) سرمایہ دارانہ تصور علم کا اسکے تصور حقیقت سے تعلق اور اسکی خصوصیات پر اس مضمون میں ہم درج بالا ترتیب سے اپنے مدعا کو بیان کریں گے۔

ا) ایمانیات اور تصور علم کا باہمی تعلق:

علم سے مراد عام طور پر معلومات کا ایک بامقصد مجموعہ سمجھی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ 'عالم' (knower) اور 'معلوم' (known) کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے اور ان دونوں کے درمیان اس تعلق کی مقصدیت ہی 'مجموعہ معلومات' کے مافیہ (content) کی ماہیت (nature) اور درجہ بندی (hirarchy) کا تعین کرتی ہے۔ یعنی کس مجموعہ معلومات پر لفظ علم کا اطلاق کیا جائے گا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ علم حاصل کرنے والے شخص کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ ہر مقصدیت سے نکلنے والا تصور علم اور معلومات کی درجہ بندی یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح معلومات کے ہر مجموعے پر لفظ علم کا اطلاق نہیں کیا جاتا بلکہ صرف ایک بامقصد معلومات کے مجموعے پر ہی یہ لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً کسی پاگل شخص کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اسکی ان معلومات کو کسی بھی تصور علم میں 'علم' نہیں مانا جاتا۔ یہ حقیقت کہ علم کی درجہ بندی کا براہ راست تعلق عالم کے مقصد سے ہوتا ہے اس مثال سے سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر سائنس، انجینئرنگ اور سوشل سائنسز کے مختلف مضامین کی ایک فہرست ان علوم کے طلباء کے سامنے درجہ بندی کیلئے پیش کی جائے تو انکی ترتیب میں واضح فرق ہوگا۔ ان طالب علموں کی مرتب کردہ فہرستوں میں علوم کی درجہ بندی کا یہ فرق اس مقصد اور تعلق (relevance) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس کی خاطر یہ طلباء علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگر آپ کسی انجینئرنگ کے طالب علم سے تاریخ کی اہمیت پر بات کریں تو شاید اسکے نزدیک تاریخ ایک غیر اہم علم کہلائے، لیکن اگر کسی فلسفی کی نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ سے زیادہ اہم علم کوئی اور نہ ہوگا۔ اس مثال میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ معلومات کی علمی حیثیت اور اسکی درجہ بندی طے کرنے میں علم حاصل کرنے والے شخص کا مقصد فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کیلئے ایک اور مثال پر غور کریں۔ آپ اور ہم بچپن سے یہ بات سنتے چلے آئے ہیں کہ 'اصل علم تو قرآن وحدیث ہی ہیں'۔ آج کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدیدیت پسند مفکرین کو یہ بات مبالغہ انگیزی دکھائی دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آیا واقعی یہ مبالغہ انگیزی ہے یا حقیقت واقعہ ہے؟ اور اگر حقیقت ہے تو کن معنوں میں یہ بات درست ہے؟ اس سوال کے جواب کیلئے اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کے مقصد پر غور کریں۔ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں یہ بات نہایت واضح طریقے سے بیان کی ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد دنیاوی زندگی کو پر لطف بنانے کیلئے کائنات کو مسخر کرنے کی سعی کرنا نہیں بلکہ اپنے رب کی عبادت کرنا اور اسکی خوشنودی حاصل کرنا ہے، نیز یہ کہ انسان کو یہ زندگی اسکے کسی حق کے طور پر نہیں دی گئی کہ جسے وہ جیسے چاہے ترتیب دے، بلکہ یہ زندگی اسے آزمائش کیلئے دی گئی ہے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ زندگی کا مقصد آزمائش اور حصول رضائے الہی ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزمائش جس شے میں ہو رہی ہے اسکا علم کہاں سے حاصل ہوگا دوسرے لفظوں میں رضائے الہی حاصل کرنے کے طریقے کا علم کہاں سے ہوگا؟ کیا ہر شخص آزاد ہے کہ اپنی طرف سے زندگی کا جو بھی مقصد چاہے بنالے یا اسکے رب نے اسکی ہدایت کا کوئی انتظام کیا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہدایت انسانی کے لئے انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری فرمایا اور اس ہدایت کے حصول کا آخری اور واحد معتبر ذریعہ قرآن وحدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ یہی وہ واحد ذریعہ علم ہے جس سے رضائے الہی کے حصول کا طریقہ جانا جا سکتا ہے اور اس ذریعہ علم کو چھوڑ کر اس دنیا میں اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے انسان یہ جان سکے کہ میرا رب مجھے کس شے میں آزمانا چاہتا ہے نیز وہ میرے کن اعمال سے خوش ہوگا اور کون سے اعمال اسکی ناراضگی کا باعث ہونگے۔ پس ثابت ہوا کہ انسانی زندگی کے مقصد 'عبادت رب' کے معیار پر پورا اترنے والا علم وہی ہے جسے مولوی صاحب 'قرآن وحدیث' کہتے ہیں لہذا یہ بات سو فیصد درست ہے کہ 'اصل علم تو قرآن وحدیث ہی ہیں'، نیز دیگر عقلی علوم کی درجہ بندی ان علوم کے اس مقصد حیات کے حصول میں معاونت و عدم معاونت کے اصول پر طے کی جائے گی۔ جو علم اس مقصد حیات کے حصول میں جتنا زیادہ ممد و مددگار ہوگا اسلامی نظریہ علم میں اتنا ہی اہم کہلائے گا، اور جس علم کا تعلق اس مقصد کے ساتھ جتنا کمزور ہوگا وہ علوم کی درجہ بندی میں اتنا ہی نیچے دکھائی دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں قرآن و حدیث کے بعد صرف ونحو، فقہ واصول، کلام و منطق وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ہر تصور علم (یعنی مجموعہ معلومات کی نوعیت) اور اسکی درجہ بندی چند مابعد الطبعیاتی ایمانیات کی مرہون منت ہوتی ہے نیز مقصد حیات کی بابت عقائد بدل جانے سے تصور علم بھی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ کسی تہذیب سے نکلنے والے تصور علم اور معلومات کی درجہ بندی کو اس تہذیب کی ایمانیات سے ماوراء ہو کر سمجھنا ناممکن ہے اور جو شخص بھی ایسی کوشش کرے گا لازماً غلط نتائج تک ہی پہنچے گا۔ ایمانیات اور تصور علم کے تعلق کی اس اصولی بحث

کے بعد اب ہم سرمایہ دارانہ تصور علم کی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

۲) سائنسی علم کی نوعیت اور اسکے تصور حقیقت سے اسکا تعلق

آج کی دنیا بالخصوص مغربی دنیا میں جب بھی لفظ علم بولا جاتا ہے تو اس سے مراد عام طور پر 'سائنس و ٹیکنالوجی' ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب موجودہ سائنس وٹیکنالوجی نامی کوئی بھی شے علم کے مسمّی کے طور موجود نہ تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کا موجودہ علم تمام انسانی تہذیبوں میں تحلیل ہوتا ہوا اپنا تاریخی سفر طے کر کے اس منطقی منزل تک پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک علم ایک مسلسل تاریخی عمل (Historical progression) کا نام ہے جو کسی قسم کی ایمانیات کا مرہون منت نہیں۔ ہمارے متجددین حضرات اس فکر کو اس وجہ سے اپناتے ہیں تاکہ موجودہ سائنس کو اسلامی تاریخ کا تسلسل ثابت کر دکھائیں۔ ہوسکتا ہے اس تجزیہ میں ان کے لئے خوشی کا بہت سا سامان ہو، لیکن حقیقت علم کا یہ تجزیہ کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتا۔ سرمایہ دارانہ علم (یعنی سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ) کسی مسلسل تاریخی عمل کے نتیجے میں نہیں بلکہ انسانی زندگی و کائنات کے بارے میں تصور حقیقت کی ایک ایسی تبدیلی سے پیدا ہوا جو تحریک تنویر (enlightenment) کے نتیجے میں عام ہوئی۔

۲.۱: سرمایہ دارانہ تصور حقیقت کی ایمانیات

اس تصور حقیقت نے جن بنیادی ایمانیات اور اقدار کو اپنانے کی طرف دعوت دی وہ المختصر یہ تھے۔

(الف) آزادی جس کا معنی یہ ہے کہ ہر شخص اپنی خواہشات کی ترتیب متعین کرنے کا اخلاقی طور پر مستحق ہے، یعنی یہ اسکا حق ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکے اور اپنی چاہت حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ مکلف ہونے کی جدوجہد کرے۔ مختصراً آزادی کا معنی خیر و شر طے کرنے کا حق انسان کو حاصل ہونا ہے، یعنی انسان کے 'حق' کا 'خیر وشر' پر فوقیت رکھنا ہے [prioritization of right over good] (آسان لفظوں میں یہ تصور کہ خیر اور شر کا منبع اور اسکا تعین نفس انسانی سے ہوتا ہے)۔ مغربی انسان خود کو قائم بالذات (self-determined) اور آزاد (autonomous) تصور کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں آزادی کا مطلب ہے 'عبدیت' کا رد، یعنی انسان کی حقیقت عبد ہونا نہیں بلکہ قائم بالذات یعنی خود اپنا خدا ہونا ہے، کیونکہ انسان کو خیر و شر طے کرنے کا حق دینے کا مطلب اس بات کا انکار ہے کہ وہ عبد ہے اور اسکا مقصد حیات خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ خواہش کی نفی کر کے اپنے نفس کو خدا کی رضا کے آگے جھکا دینا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ب) مساوات جسکا مطلب یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات کی ترتیب اور ان سے طے پانے والے تصورات خیر مساوی اہمیت کے حامل ہیں اور ان میں اصولاً کسی قسم کی درجہ بندی کرنا ناممکن ہے، یعنی تمام تصورات خیر وشر اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مساوات کا معنی ہے 'نظام ہدایت' کا رد، یعنی اس بات کا انکار کرنا کہ اللہ تعالی نے انسان کو خیر وشر بتانے کیلئے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم کیا ہے، نیز انبیاء کرام کی تعلیمات خیر وشر طے کرنے کا کوئی حتمی معیار ہیں۔ یہ اسلئے کہ نظام ہدایت کا معنی ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات کی ترتیب ہرگز مساوی معاشرتی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ وہ شخص جسکی خواہشات کی ترتیب تعلیمات انبیاء کا مظہر ہیں تمام دوسری ترتیبوں پر فوقیت رکھتی ہے، دوسرے لفظوں میں نظام ہدایت مساوات کا نہیں بلکہ حفظ مراتب کا متقاضی ہے جس میں افراد کی درجہ بندی کا معیار (differentiating factor) تقوی ہوتا ہے نیز اسلامی معاشرے وریاست کا مقصد جمہوری معاشرے کی طرح ہر فرد کو اپنی اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کے مساوی مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ انکی خواہشات کو نظام ہدایت کے تابع کرنے کا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریہ ریاست میں citizen (ایسی عوام جو اصولاً حاکم اور فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے) اور عوامی نمائندگی (Representation of citizens) کا کوئی تصور ہے ہی نہیں کیونکہ یہاں عوام citizen نہیں بلکہ رعایا ہوتی ہے اور خلیفہ عوام کا نمائندہ نہیں ہوتا کہ جسکا مقصد عوام کی خواہشات کے مطابق فیصلے کرنا ہو بلکہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوتا ہے جسکا مقصد رعایا کی خواہشات کو شریعت کے تابع کرنے کیلئے نظام ہدایت کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آزادی و مساوات کا معنی یہ ہے کہ خیر وشر اور اپنی منزل کا تعین انسان خود طے کرے گا اور ہر شخص کا تصور خیر وزندگی گزارنے کا طریقہ مساوی معاشرتی حیثیت رکھتا ہے اور ریاست کا مقصد ایسی معاشرتی صف بندی وجود میں لانا ہوتا ہے جہاں ہر فرد اپنی خواہشات کو ترتیب دینے اور انہیں حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ مکلّف ہوتا چلا جائے

(ج) ترقی: جسکا حاصل یہ ہے کہ زندگی میں انسان کا مقصد اپنے ارادے اور خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل (maximum satisfaction) ہے اور ارادہ انسانی کی یہی منتہا تکمیل ترقی کا جوہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترقی کا مطلب ہے 'آخرت' کا اور دنیا کے 'دارالامتحان' ہونے کا رد اور دنیاوی زندگی کو بذات خود مقصد (End in itself) سمجھنا ہے۔ ترقی درحقیقت وہ طریقہ ہے جسکے ذریعے آزادی اور مساوات کا اظہار ممکن ہوتا ہے، یعنی اگر کوئی معاشرہ آزادی اور مساوات کے اصول پر زندگی گزارنا چاہتا ہے تو وہ واحد طریقہ جسکے نتیجے میں ہر فرد اپنی خواہشات کی ترتیب طے کرنے اور اسے حاصل کر سکنے کا مکلّف بن سکتا ہے ترقی یعنی

سرمائے میں لامحدود اضافہ کرنے کی جدوجہد ہے۔

تصور حیات کی اس تبدیلی کے بدولت ایک ایسے 'جدید انسان' کی تخلیق ہوئی جسے ہیومن (Human being) کہتے ہیں۔ تحریک تنویر سے قبل اس انسان کا کوئی معاشرتی وجود نہ تھا کیونکہ ہر مذہب میں انسان سے مراد عبد (Mankind) ہی سمجھا جاتا تھا جو اپنی پہچان اور وجود خود اپنی ذات سے نہیں بلکہ خدا کے وجود سے حاصل کرتا تھا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مابین اظہار عبدیت کے معتبر طریقے میں اختلاف موجود تھا۔ فوکالٹ (بیسویں صدی کے مشہور ترین مغربی فلسفیوں میں سے ایک) کا یہ کہنا صد فیصد درست ہے کہ ہیومن تو پیدا ہی سترہویں صدی میں ہوا ہے اس سے پہلے کسی تہذیب اور نظام زندگی میں ہیومن کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ ہیومن (وہ انسان جو خود کو قائم بالذات سمجھتا اور آزادی کا خواہاں ہے) مغربی نظام زندگی کی روح رواں ہے اور تمام مغربی علوم جس انسان کے رویے سے بحث کرتے ہیں وہ یہی ہیومن ہے نہ کہ عبد۔ یہ ایک ایسا انسان تھا جسکی دلچسپی کا محور مذہبی رسوم عبودیت بجالانے کے بجائے دنیاوی معاملات سے بے پناہ رغبت تھی، اور جس میں ایک ایسا نیا ولولہ اور جوش تھا جو اسے غیر مشروط آزادی کی طرف مائل کرتا تھا۔ اس تبدیلی کی تصویر کشی ڈاکٹر ظفر حسن نے اپنی کتاب 'سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت' میں خوبصورت الفاظ میں کی ہے:

''یہ ایک ایسا انسان تھا جو اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر دینا چاہتا تھا... اٹھارویں صدی کے اوائل میں کہا جانے لگا کہ بزرگوں نے نئی نسل کو ایک ایسا معاشرتی نظام دیا ہے جو نرا دکھاوا اور دھوکا ہے اور جو ہر برائی کا ذمہ دار ہے... اٹھارویں صدی کی نسلیں اس نظریے کو کہ انسان کو کوئی الہامی پیغامات وصول ہوتے ہیں بالکل رد کر کے وحی کا انکار کر دینا چاہتی تھیں۔ القصہ مختصر وہ انسانی زندگی کو کسی حال میں بھی مذہبی طرز فکر سے نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ایک نئی چیز کو جنم دیں گی، عقل کی روشنی سے وہ ظلماتی دور کو نیا نور بخشیں گی اور قدرت کے منصوبے کو دریافت کرلیں گی اور اسطرح انسان کا ایک پیدائشی حق یعنی انسانی خوشی اور خوشحالی انسان کے لئے بحال کر دیں گی''

۲.۲: جدید علم کا مطلب وہ صلاحیت جس سے انسان ہر خواہش کی تکمیل پر قادر ہو:

حیات انسانی کی مقصدیت کے بارے میں یہ گمراہ کن تصورات سترہویں اور اٹھارویں صدی کی پیداوار ہیں جنکے نتیجے میں علم کا ایک نیا تصور ابھرا۔ اگر اس دنیا میں انسان کا مقصد ارادے اور خواہشات کی تکمیل ہے تو پھر اس کائنات میں لامحدود خواہشات انسانی کی تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ یہاں کی تمام اشیاء وموجودات اسکے ارادے کے تابع ہو جائیں، کیونکہ جب تک وہ انسانی ارادے کے تابع نہیں ہو جاتیں، تکمیل خواہشات کا خواب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً انسان کی ایک خواہش یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ ہوا میں اڑے، لیکن اس کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ وہ زمین کی اپنی طرف گرانے کی قوت پر قابو پائے۔ اشیاء و موجودات کو اپنے ارادے کے تابع کرنے کیلئے ضروری تھا کہ انسان ایسی معلومات حاصل کرنے کے درپے ہو جو اسے تسخیر کائنات کی راہ سجھائے۔

لہذا اس تصور حقیقت (کہ زندگی کا مقصد ارادہ انسانی کی تکمیل ہے) سے جو تصور علم نکلا اسکے مطابق علم سے مراد ایسی بات جاننا ہے جس کے ذریعے انسان اس چیز پر قادر ہو جائے کہ اسکے ارادے کی تکمیل کیسے ہوسکتی ہے اور وہ علم جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ کائنات پر اسکے ارادے کا تسلط کیسے ممکن ہے اسے 'سائنس' کہتے ہیں۔ لہذا ترقی کا اصل معنی ہے علم کو سائنس کے ہم معنی قرار دینا، یعنی ترقی سے مراد ان معلومات میں اضافہ ہے جو انسانی ارادے کی تکمیل کو ممکن بناتی ہوں۔ گویا مغربی تہذیب میں 'ارادے و خواہشات کی تکمیل' ہی معلومات کے مجموعے اور عالم (knower) کے درمیان تعلق کی بنیاد ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں علم وہ چیز جاننا نہیں ہے کہ جس سے انسان اپنے رب کی رضا جان لے، یعنی علم یہ نہیں کہ مجھے وضو یا غسل وغیرہ کرنے کا طریقہ اور مسائل معلوم ہو جائیں بلکہ علم تو یہ ہے کہ میں یہ جان لوں کہ پنکھا کیسے چلتا ہے، بجلی کیسے دوڑتی ہے، جہاز کیسے اڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گویا اب علم رضائے الہی کے حصول کا طریقہ جان لینا نہیں، بلکہ تسخیر کائنات یا بالفاظ دیگر انسانی ارادے کے کائناتی قوتوں پر تسلط قائم کرنے کا طریقہ جان لینے کے ہم معنی بن گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہاں علم اللہ تعالی کی رضا نہیں بلکہ نفس انسانی کی رضا اور اسکی تکمیل کا سامان فراہم کرنے والی معلومات کا نام پڑ گیا۔ تصور علم کی یہ تبدیلی انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تبدیلی تھی جس نے انسان کی کامیابی کو کسی خدا کی اطاعت (obedience) کے ساتھ نہیں بلکہ لامتناہی خواہشات انسانی کی تکمیل و ارادہ انسانی کے تسلط (dominance) کے ساتھ مشروط کر دیا۔ سائنسی علم کا یہ مقصد اور اسکے پھیلاؤ کیلئے درکار ضروری اسباب کا نقشہ سائنس کے موجدین اور فلاسفہ نے بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلاً گلیلیو کا مشہور مقولہ ہے: Bible shows us the way to heavens, but it does not show the way heavens go یعنی 'بائبل ہمیں جنت میں جانے کا راستہ تو بتاتی ہے، مگر یہ نہیں بتاتی کہ یہ کائنات کیسے چلتی ہے'۔ مشہور تاریخ دان H.G. Wells راجر بیکن جسے جدید سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے کے خیالات کو کچھ اس طرح خراج تحسین پیش کرتا ہے:

''بیکن کی کتابیں جہالت کے خلاف بغاوت تھیں۔ اس نے اپنے دور کے لوگوں کو بتایا کہ وہ جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور یہ ایک ایسی بات تھی جسے اس دور میں کہنے کے لئے بہت ہمت درکار تھی۔ قرون وسطی کے لوگ اپنے دور کی ذہانت اور ایمانیات کے سچ ہونے کے بارے میں جذباتی حد تک قائل تھے اور انکے خلاف ہرگز

کوئی تنقید برداشت نہ کرتے۔ راجر بیکن کی کتابیں ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ 'غیر عقلی ایمانیات اور مسلمہ مقتدرہ (Authority) کی پیروی کرنا چھوڑ دو'۔ دنیا پر غور کرو، (حصول علم کے لئے) تجربہ تجربہ اور تجربہ (پرزور) ہی اسکا مقصد تھا۔ اسنے جہالت کے چار اسباب بیان کئے: (۱) مسلمہ مقتدرہ کا احترام (۲) اسلاف کے طور طریقوں پر عمل (۳) ریت و رواج کی پیروی (۴) اور ہمارے فخریہ مگر نہ سمجھ آنے والے دکھاوے۔ اگر ہم ان چیزوں سے جان چھڑا لیں تو پھر سائنسی ایجادات اور مکینیکل قوت سے بھرپور ایک نئی دنیا انسانیت کو دکھائی دے گی۔۔۔ (میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ) بحری سفروں کے لئے بغیر ملاحوں کی ایسی مشینیں بنانا ممکن ہے جسے صرف ایک آدمی اس کشتی کی رفتار سے کئی گنا تیز چلا سکتا ہوگا جسے کئی ملاح مل کر چلاتے ہیں۔ اسی طرح بغیر ڈھور ڈنگر سے چلنے والی ایسی سواریاں بنانا بھی ممکن ہے جو پرانے دور کی تیز ترین سواریوں سے تیز چلتی ہونگی۔ اور ہوا میں اڑنے والی ایسی مشینیں بنانا بھی ممکن ہے جس میں انسان بیٹھ سکتا ہو اور وہ مشین بالکل پرندوں کی طرح پر ہلا کر چلتی ہو''

بیکن نے یہ تمام تفصیلات اپنی کتاب The New Atlantis میں بیان کی ہیں جس میں اسنے ایک ایسے فرضی جزیرے کی تصویر کشی کی ہے جہاں سائنسی تحقیقات کرنے والا ایک بہت بڑا ادارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں کا حاکم آنے جانے والے لوگوں کو اس جگہ کی سیر کراتا ہے اور ان سے کہتا ہے ''ہمارے اس ادارے کا مقصد علل و معلول (cause and effect) و حرکت کائنات کے قوانین اور انسانی ارادے کی حدود کی توسیع کرنے کے طریقے کا علم حاصل کرنا ہے تاکہ ہر چیز کرنا ممکن ہوسکے''۔ (A Short History of the World, by H.G. Wells, p. 200-01، بحوالہ مریم جمیلہ صاحبہ کی معرکۃ الاراء کتاب Modern Technology and the Dehumanization of Man)۔ اس تصور علم میں فطرت ان معنوں میں انسان کی حریف ٹھہری کہ یہ انسانی ارادے کی تکمیل پر حد بندی کرتی ہے اور اسے تسخیر کر کے انسانی ارادے و خواہشات کی تکمیل کیلئے استعمال کرنا ضروری ٹھہرا۔ آج بھی موجودہ سائنسی علمیت کا یہ جنون ہے کہ انسانی عقل کو استعمال کر کے فطرت کے تمام رازوں سے پردہ اٹھانا نیز انسانی ارادے کو خدا اسکے اپنے سواء ہر بالاتر قوت سے آزاد کرنا عین ممکن ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جینیٹکس (Genetics) کی فیلڈ میں تحقیقات کر کے انسانی خون میں ایسی تبدیلیاں لانا ممکن ہے جس کے بعد اسکے اندر پائے جانے والے غضب اور حسد جیسے جذبات کو ختم کر کے دنیا کو جنگوں سے نجات دلائی جا سکے گی، اسی طرح سائنس دانوں کو امید ہے کہ موت پر قابو پانا ممکن ہے، اور نجانے کیا کچھ اور۔ سائنس کے اس اصل جنون کا اظہار دور جدید کی انگریزی زبان میں بننے والی سائنس فکشن فلموں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب سے واضح انداز سے نظر آتا ہے جن کے جملوں، الفاظ اور مرکزی خیالات میں نت نئے انداز کے ساتھ انسان کی خود اپنا خدا بننے کی خواہش جلوہ گر ہوتی ہے۔

۲.۳: سرمایہ دارانہ علم کی خصوصیات (طریقہ حصول علم کے اعتبار سے)

سائنس یا سرمایہ دارانہ طریقہ حصول علم میں حتمی بات اور قانون معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ سائنسی علمیت حقیقت کے ارتقائی تصور پر ایمان رکھتی ہے جسے سمجھانے کیلئے ہم ارتقائی تصور علم کی چند خصوصیات بیان کرتے ہیں:

(الف) **غیر حتمیت (uncertainity):** ارتقائی علمیت کا اول اصول یہ ہے کہ حتمی سچ جاننا ناممکن ہے، البتہ سائنسی طریقہ علم استعمال کر کے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ انسانیت ایک حتمی سچ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی کلیات کی مدد سے کسی حتمی سچ کا علم حاصل کر پانا ہی سرے سے ناممکن ہے۔

(ب) **تردیدیت:** اس تصور علم میں وہی دعوی اور قضیہ علم کہلانے کا مستحق ہے جسے تجربے میں لا کر رد کرنا ممکن ہو۔ سائنس میں علم کو غیر علم سے ممیز کرنے کا معیار تردیدیت (falsification) ہے یعنی اگر کسی بات کو تجربے کے ذریعے غلط ثابت کرنا ناممکن ہو تو وہ علم کی تعریف پر پوری نہیں اترے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں زندگی بعد الموت وغیرہ جیسے حقائق علم نہیں سمجھے جاتے کیونکہ یہ سائنس کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ اس بات کو دوسرے انداز سے یوں سمجھئے کہ ارتقائی علم وہی ہو سکتا ہے جسے غلط ثابت کرنا ممکن ہو کیونکہ جو بات غلط ثابت نہیں کی جاسکتی اسمیں ارتقاء کہاں سے آئے گا؟

البتہ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سرمایہ داری اور سائنس کی اپنی ایمانیات کبھی سائنس کے اس معیار پر نہیں جانچی جاتیں بلکہ انہیں ماننا تو ایمانیات کا حصہ ہے اور جو انہیں نہیں مانتا وہ ہیومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ مثلاً سائنس کا یہ مفروضہ کہ علم کا منبع انسان کی ذات ہے (یعنی علم انسان کی ذات سے نکلتا ہے) کسی بھی تجربے ثابت نہیں کیا جا سکتا (یعنی یہ تردیدیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا) لیکن پھر بھی سائنس اسے مفروضے کے طور مان کر آگے بڑھتی ہے۔ گو کہ سائنسی علمیت میں حوادثات عالم کی تشریح اور حقیقت کیلئے کسی ایسی مقصدیت کو تلاش کرنا جسکی نسبت ارادہ انسانی سے باہر مثلاً خدا کی طرف ہو سائنس کے نزدیک ایک لایعنی بات ہے لیکن سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ خود انسانی ذات کی حقیقت کیا ہے بلکہ اسے آزاد اور خود مختار فرض کرتی ہے۔ ایسے ہی سائنس کا یہ مفروضہ بھی محض ایمان ہے کہ یہ کائنات کسی خارجی کنٹرول کے بغیر چلنے والا ایک ایسا مکمل قائم بالذات نظام ہے جسکے اندر تبدیلیاں اس کے اندرونی نظام کے تحت آتی ہیں نیز اسکی معنویت سمجھنے کیلئے کسی خدا کی ضرورت نہیں بلکہ اس مشین کو علت و معلول

کے چند اصولوں کے ماتحت سمجھنا ممکن ہے (البتہ سائنس کی دنیا میں ہونے والی تازہ ترین Quantum Mechanics کی تحقیقات نے سائنس کے اس ایمان کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں)۔ گویا اگر انسان علت و معلول کے قانون کے ماتحت رونما ہونے والے سلسلے کو دریافت کر لے تو نہ صرف یہ کہ وہ اشیاء کی حقیقت سمجھ سکتا ہے بلکہ اسے قابو میں لا کر ان پر اپنا تسلط قائم کر سکتا ہے۔ سائنس کے نزدیک انسان کا اپنی آزادی کی تکمیل کیلئے کائناتی تسلط قائم کرنا ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

(ج) **شک نہ کہ ایمان:** سرمایہ دارانہ تصور علم کے مطابق کسی بات کو حتمی اور آخری سمجھ کر اس پر صمیم قلب سے ایمان لے آنا اور دوسروں کو اسکی دعوت و تبلیغ کرنا غیر علمی طریقہ کہلاتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر بات میں شک کرنا اور کسی چیز کو رد کرنے کی کوشش کرنا ہی اصل علمیت کہلاتی ہے۔ جو شخص مذہبی حقائق پر ایمان لائے اسپر انتہا پسند، بنیاد پرست اور دہشت گرد کے لیبل چسپاں کر دیئے جاتے ہیں

(د) **ترقی (بہتری):** ہر نئے دور کا سچ پچھلے دور کے سچ سے بہتر گردانا جاتا ہے کیونکہ اس میں پچھلے دور کے تصور حقیقت کے اچھے پہلو کو شامل کر لیا جاتا ہے اور کمزور پہلوؤں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہذا ہر آنے والا دور پچھلے دور سے بہتر ٹھرتا ہے۔ مغربی دنیا میں سپنسر، ہیگل اور مارکس وغیرہ نے انسانی علم کے رفتہ رفتہ ایک خاص منزل کی طرف بڑھنے کے تصور کی بناء پر تاریخ کی اپنی اپنی تعبیرات پیش کی ہیں جن سب کا حاصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی لاشعوری طور پر ایک ایسے عظیم الشان مقصد کی طرف رواں دواں ہے جہاں پہنچنا اسکا مقدر ہے، لہذا ہر آنے والا دور پہلے سے بہتر ہے۔ ان تمام تعبیرات کی حیثیت چند قصوں اور کہانیوں سے زیادہ اور کچھ نہیں جو ان لوگوں نے اپنے اپنے بند کمروں میں بیٹھ کر گھڑی تھیں۔

جدیدیت پسند مسلمانوں کو مولوی کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ "ہم مسلمانوں کا سب سے اچھا دور تو دور نبوی، دور صحابہؓ اور سلف صالحین کا دور تھا جو گزر چکا، لہذا اب آنے والا ہر دور پہلے سے بہتر نہیں بلکہ برا ہوگا جیسا کہ احادیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے"۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مولوی ہمیں پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، اور اسمیں شک بھی کیا ہے کہ مولوی تو یہی چاہتا ہے کہ دنیا کسی طرح پھر ویسی ہی ہو جائے جیسی آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے اصحاب کے دور میں تھی۔ اسی جرم میں مولوی پر دقیانوسی اور تنگ نظر ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے کہ یہ ہمیشہ یہ طے کرنے کیلئے کہ "ہمیں آگے کیا کرنا چاہئے" مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف دیکھنے کو کہتا ہے، یہ آج کے عمل کو ماضی کے پیمانوں پر کسنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ہدایت حاصل کرنے کیلئے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف پلٹنا سکھاتا ہے، یہ تو ترقی کا دشمن ہے اور یہ دنیا کو پھر پتھروں کے دور میں واپس لے جانا چاہتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ہ) <u>ایک سے زیادہ حق کا امکان:</u> اس نظریہ علم میں چونکہ کسی بھی چیز کی بابت مسلمہ اور حتمی علم موجود نہیں ہوتا، لہذا ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ حق نیز دو مختلف افراد کیلئے دو مختلف حق ہو سکتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں بیک وقت ایک ہی شے کے بارے میں دو مختلف نظریات (theories) کا ہونا معمول کی بات ہے۔

(و) تحقیق برائے تحقیق کا نہج: چنانچہ تحقیق برائے تحقیق کا نام ہی علمی کاوش پڑ گیا، چاہے وہ تحقیق بندروں اور کتوں وغیرہ کے حالات زندگی جمع کرنے کا کام ہی کیوں نہ ہو۔ ہر لغو سے لغو بات جس میں انسانی خواہش کوئی معنی دیکھتی ہو لائق تحقیق ٹھرتی ہے کیونکہ کسی شے کے معنی اللہ تعالی اور اسکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی روشنی میں نہیں بلکہ انسانی خواہشات اور ارادے کی تکمیل کے پیمانے پر تول کر متعین کئے جاتے ہیں۔

(ز) <u>ارتقائی تعبیرات کی تلاش:</u> دور حاضر میں موجود ہر معاشرتی و انسانی ادارے و عمل کی وحی سے علی الرغم ایک ارتقائی تعبیر پیش کرنے کی روش عام ہو جاتی ہے اور اس فرضی قیاس آرائی کو ہی علمی کارنامہ سمجھا جانے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت عمدہ مثال یاد آئی۔ ایک مرتبہ ہمارے ایک بزرگ ساتھی (اللہ تعالی انہیں جنت نصیب فرمائے) نے ایک محفل میں شادی کے موضوع پر ہونے والی ہوئی گفتگو میں تمام شرکاء مجلس سے سوال کیا 'کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ شادی کا ادارہ کیسے قائم ہوا؟' سب نے پوچھا کہ جناب آپ بتایئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اولاً تمام انسان بھی جانوروں کی طرح جنسی تعلقات استوار کرتے تھے، یعنی جس مرد و عورت کا جس سے دل چاہا خواہش پوری کر لی۔ ایک عرصے تک معاملہ یونہی چلتا رہا، لیکن پھر آہستہ آہستہ انسانوں میں جذبہ رقابت نے جوش مارا، اور لوگوں کو یہ بات بری محسوس ہونے لگی کہ کل تک جو عورت میرے ساتھ تھی آج کسی اور مرد کے ساتھ کیوں ہے؟ اس جذبے کے زیر اثر انسانی معاشروں میں طاقت کے قانون کا راج شروع ہونے لگا یعنی جس نے آگے بڑھ کر پہلے کسی عورت پر قبضہ جما لیا پس وہ ہمیشہ کیلئے اسکی ہو گئی۔ پھر بچوں کی پیدائش کے بعد بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال کے مسائل سامنے آنے لگے جنہیں حل کرنے کیلئے لوگوں نے کئی طرح کے قوانین بنانے شروع کر دیئے۔ مثلاً یہ کہ بچوں کی ذمہ داری اسی پر ہوگی جس نے عورت پر قبضہ جمایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یوں انسانیت لحہ بہ لحہ آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ لوگوں نے مرد و عورت کے جنسی تعلق کی بنیاد شادی کے ادارے کے ساتھ منسلک کر دی۔ جب وہ بزرگ تمام کہانی سنا چکے تو میں نے پوچھا کہ یہ کہانی آپ نے کہاں سے سنی، تو فرمانے لگے کہ فلاں سوشل سائنس کے جرنل میں فلاں محقق نے یہ مقالہ لکھا ہے۔ میں نے کہا یہ بتائیں کہ اس پوری کہانی میں انسانی معاشروں کی کردار سازی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد انبیاء کرام کا کردار کیا رہا؟ کیا انبیاء نے لوگوں کو نہیں بتایا کہ انہیں کیسے زندہ رہنا چاہئے نیز کیا انکی تعلیمات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا؟ اس کہانی سے تو یہ تصور

ابھرتا ہے کہ گویا اول تو انبیاء نام کی کوئی ہستی انسانی تاریخ میں گزری ہی نہیں، اور اگر تھی بھی تو نعوذ باللہ شاید وہ دنیا کی سیر وغیرہ کرنے کیلئے آئے تھے نیز انسانوں اور معاشروں نے اپنی زندگیاں وحی الہی کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنے حیوانی جذبات کے تحت گزاری تھیں۔ یہ کہانی تو ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص حضور پر نور صلی اللہ علیہ سلم کا نام لئے بغیر یہ کہے کہ مسلمانوں کے معاشروں میں پایا جانے والا شادی کا تصور در حقیقت اسلام سے قبل عربوں کے معاشرے میں پائے جانے والی جنسی بے راہ روی کی ارتقائی شکل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز کہانی ہے، کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ معاشرتی تبدیلی انسانی جذبات کے محرکات میں ارتقاء کے طور پر نہیں بلکہ ایک نبی کی تعلیمات پر عمل کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ اگر شادی کے ادارے کا یہ سفر کوئی ارتقائی سفر تھا تو پھر مغرب میں یہ ادارہ ٹوٹ کیسے گیا؟ ارتقاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی معاشرہ انبیاء کرام کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر زندگی گزارتا ہے تو وہاں زندگی کا اظہار صرف حیوانی سطح پر ہی ہوتا ہے جسکا نظارہ ہم مغربی دنیا کی غلیظ اور پلید معاشرت میں کر سکتے ہیں

یہ محض ایک مثال تھی، ورنہ اس طرز کی اور بھی کئی فرضی کہانیاں ہمارے ہاں مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ سب سے پہلے انسانیت پر غاروں اور پتھروں کا دور گزرا کہ جب سب لوگ غاروں میں رہتے تھے، پتے اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے بدن ڈھانپتے تھے، جنگلوں میں جنگلیوں کی طرز کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام کہانیوں کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ یہ سب کی سب انسانی معاشروں کی تشکیل میں وحی اور انبیاء کرام کے کردار کو نظر انداز کرنے کیلئے گھڑی گئی ہیں جسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں وحی کو علم نہیں سمجھا جاتا۔

۲.۴: سرمایہ دارانہ علم کی منطقی منزل

<u>ایک نئی شخصیت کا جواز:</u> سرمایہ دارانہ جاہلی تصور علم نے اخلاق رزیلہ سے متصف ایک نئی قسم کی شخصیت کے اظہار کا جواز فراہم کیا جس کے نتیجے میں ایک نئی انفرادیت معاشروں میں مقبول ہوئی۔ سرمایہ دارانہ تصور علم سے پہلے صرف ایسی شخصیت ہی معاشروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی جن کی زندگی انبیاء کرام کی تعلیمات اور اسوائے حسنہ کا منہ بولتا ثبوت ہوتی۔ لیکن اس تصور علم نے ایک ایسی شخصیت کے علمی جواز کی بنیادیں فراہم کیں جو انبیاء کرام کی تعلیمات سے کوسوں دور اور اخلاق رزیلہ سے متصف ہونے کے باوجود بھی معاشرے میں ایک باعزت علمی مقام پر فائز ہو سکتی تھی۔ اس ضمن آئن سٹائن کی مثال نہایت واضح ہے جسے سائنس کی دنیا میں ایک امام کی سی حیثیت حاصل ہے لیکن اسکی زندگی زنا و بدکاری کی غلاظت سے لت پت تھی (آئن سٹائن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے نجی معاملات زندگی ان خطوط سے واضح ہوتے ہیں جو اسکی پوتی نے چھاپے ہیں)۔ ایسے ہی باوجود اسکے کہ کانٹ اغلام باز تھا اسے مغربی فلسفے میں بلندترین مقام حاصل ہے۔ اگر آپ مغربی علم کے کسی دلدادہ شخص کو یہ مثال دیں تو وہ کہے گا کہ اسکے اخلاق کو مت دیکھو بلکہ اہم چیز اسکا سائنسی کارنامہ ہے۔ گویا مذہبی اخلاقیات اب علم کے معنوں میں شامل ہی نہیں رہیں۔ سرمایہ دارانہ تصور علم میں ایسی معلومات کو علم سمجھا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ اخلاقیات یعنی حرص وحسد کی غمازی کرتی ہوں (اسکی تفصیل آگے آرہی ہے)۔ آج علم کا تصور اس حد تک گر چکا ہے کہ اگر ایک ڈاکٹر، وکیل، ایم بی اے وغیرہ خاتون ننگے سر اور نیم برہنہ حالت میں ٹی وی پر بیٹھ کر انٹرویو دے رہی ہو تو اسکے علمی کارناموں کا تعارف اس شان سے کرایا جاتا ہے گویا وہ کتنی بڑی عالمہ ہے۔ اسکے مقابلے میں گاؤں میں رہنے والی خاتون جسکی حیا اسے نامحرم کے سامنے جانے سے روکتی ہو اسے جاہل، ان پڑھ اور گنوار کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ تصور علم نے مادہ پرستانہ سوچ اور دنیاداری کے رجحانات کو تقویت بخشی اور رہی سہی عیسائی اخلاقیات کا جنازہ مارٹن لوتھر اور کیلوین جیسے مفکرین کے خیالات سے برآمد ہونے والی پروٹسٹنٹ ازم نے نکال دیا۔ اس فرقے نے عیسائی عوام میں یہ خیالات عام کئے کہ بائبل کی تشریح ہر شخص خود کر سکتا ہے، انسان اور خدا کے درمیان تعلق فرد کا نجی معاملہ ہے جس کی صحت وعدم صحت پر کسی دوسرے فرد (مثلاً پوپ) کو حکم لگانے یا فتوی دینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، چونکہ خدا اور بندے کا تعلق نجی اور اندرونی احساسات پر مبنی ہے لہذا ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ عبادت کرنے کا جو بھی طریقہ اختیار کرنا چاہے کرلے، دنیا کی کامیابی آخرت کی کامیابی کا پیش خیمہ ہے، اصل عبادت چرچ جانا یا ذکر واذکار کرنا نہیں بلکہ دنیا کے کام زیادہ انہماک سے کرنا ہے نیز فطرت کا مطالعہ بھی اتنا ہی اہم ہے کہ جتنا بائبل کا۔ درحقیقت جدیدیت کی کامیابی کی اصل وجہ مادہ پرست فلسفیوں کے افکار سے زیادہ وہ مذہبی عناصر تھے جنہوں نے اصلاح مذہب کے نام پر مذہبی تعلیمات کو مسخ کر کے جدیدیت کی مذہبی توجیہات بیان کیں۔ یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس اور میکس ویبر جدیدیت کی کامیابی کو اصلاح مذہب کی تحریک (Reformation) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر اصلاح مذہب کی تحریک کامیاب نہ ہوتی تو جدیدیت یورپ میں شکست کھا جاتی کیونکہ مذہبی آزادی کی روش ہی وہ راستہ ہے جو آگے چل کر نفس پرستی اور دنیا کی محبت جیسے جذبات دلوں میں راسخ کرنے کا باعث بنتی ہے۔

مذہبی ایمانیات کا انکار: ادراک حقیقت کے اس ارتقائی تصور کا دوسرا منطقی نتیجہ بالآخر پس جدیدیت (post-modernism) کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے حق کے وجود ہی کا انکار کر ڈالا۔ جدیدیت نے ادراک حقیقت کے لئے سائنسی طریقے پر اعتماد کرنے کی دعوت تو دی لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ حقیقت کا حتمی

ادراک ممکن ہی نہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی حتمی حقیقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تو اسے تلاش کیوں کیا جائے؟ جب حقیقت معلوم ہی نہیں تو یہ کیسے طے ہوگا کہ جس سائنسی طریقے پر ہم عمل پیرا ہیں وہ ہمیں حقیقت کے قریب کر رہا ہے یا دور؟ یعنی جب منزل کا ملنا ہی ناممکن ٹھہرا تو اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ 'کس طرح' دوڑا جائے؟ یہی وہ سوالات ہیں کہ جن کا جدیدی مفکرین کے پاس کوئی جواب تھا، نہ ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس فکر نے کسی حتمی حقیقت (absolute truth) کے وجود ہی کا انکار ڈالا، یعنی حقیقت ایک اضافی (relative) شے بن گئی جو ہر فرد، معاشرے اور زمانے کے لئے مختلف ہو سکتی ہے۔ ان مفکرین کے نزدیک زندگی بعد الموت وغیرہ کے سوالات کالعدم اور لایعنی ٹھہرے یعنی جب مرنے کے بعد زندگی ہے ہی نہیں تو اسکے بارے میں سوچنا بے کار کی بات ہے۔ انکے نزدیک اصل مسئلہ تو اس وجود انسانی کا ہے جو اس دنیا میں اسے حاصل ہے، اس وجود سے پہلے انسان نہ تو کہیں تھا اور نہ ہی اس کے بعد وہ کہیں اور جانے والا ہے۔ اس فکر کے نتیجے میں پس جدیدیت کے نزدیک دنیاوی زندگی کی حقیقت اور معنویت محض کھیل تماشہ اور مزے کرنا ہے، وٹنگسٹائن کی فکر کا نچوڑ یہ ہے Life is a game, and maturity is to play it seriously یعنی زندگی ایک کھیل ہے اور عقلمندی یہ ہے کہ اسے سنجیدگی سے کھیلا جائے۔ بیسویں صدی کے وسط میں جب یہ فکر یورپ میں عام ہوئی تو نوجوانوں میں خودکشیاں کرنے، سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں جانے اور ہیروئن اور بھنگ استعمال کر کے مست رہنے کے رجحانات پروان چڑھے۔ وٹنگسٹائن جیسے بڑے فلسفی نے بالآخر تنگ آکر خودکشی کی۔ یہ آئے نئے فیشن کی بھرمار اور راک موسیقی کا پھیلاؤ اسی زمانے کی پیداوار ہے، الغرض ہر ایسا کام کیا جانے لگا جسے لوگ عجیب سمجھتے تھے اور ہر ایسے کام میں معنی تلاش کئے گئے جنہیں لوگ عام طور پر بے معنی گردانتے تھے۔ ظاہری بات ہے کہ اگر زندگی بے معنی ہے تو پھر کسی خاص طریقے سے ہی زندگی گزارنے میں معنی کیوں تلاش کئے جائیں، ہر طریقہ مساوی طور پر بے معنی ہے لہذا سب کا اظہار کرنا چاہئے۔ آخر کسی خاص طریقے کے ساتھ ہی گانا کیوں گایا جائے، ہر اس طریقے سے گانا گاؤ جسے لوگ عام طور پر غیر عقلی (senseless) سمجھتے ہیں۔ یہ اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ آئے دن سر اور داڑھی کے بالوں کے نئے نئے انداز نظر آتے ہیں، کبھی پینٹ کے پائنچے پھاڑ لئے جاتے ہیں کبھی اسے الٹا کر کے پہنا جاتا ہے، کبھی مرد کانوں میں بالیاں لٹکائے گھومتے دکھائی دیتے ہیں، اور عورتوں کے فیشن کی بھرمار وغیرہ وغیرہ، اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی یہ کیا کر رہے ہو تو جواب ملتا ہے 'فیشن'۔ فیشن کا مطلب ہی بے معنی کاموں میں معنی تلاش کرنا ہے، آزادی کا خواہاں شخص معنویت 'فرق' (difference) میں تلاش کرتا ہے یعنی آزاد انفرادیت کا اظہار فرق کے طریقے سے ہوتا ہے، جبکہ عبدیت کا اظہار فرق میں نہیں بلکہ یکسانیت (similarity)

www.KitaboSunnat.com

میں ہوتا ہے یعنی میری ذات جس قدر آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا میں فنا ہوگی اتنی ہی زیادہ معنی خیز ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مولوی اور صوفی وہی حلیہ اپناتا ہے جو چودہ سو برس قبل کا نقشہ پیش کرسکے۔ زندگی بعد الموت اور اسکی اصل حقیقت کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان مفکرین کے ہاتھ زندگی بعد الموت کے خلاف کوئی ایسی قاطع دلیل آگئی ہے جسے رد کرنا ناممکن ہو، بلکہ یہ حقائق حصول علم کے ان ممکنہ ذرائع کی گرفت سے ہی باہر ہیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں (یعنی حواس خمسہ اور عقل انسانی)۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ادراک حقیقت کا ذریعہ اگر کوئی ہے تو وہ وحی یعنی انبیاء کرام کی تعلیمات ہیں جنکی حیثیت خبر صادق کی ہے اور جنہیں کسی اور ذریعہ علم سے پرکھا (judge) نہیں جاسکتا ہے کیونکہ یہی اصل میزان ہیں۔

پس جدیدیت کے ان افکارات کو ان معنوں میں علمی سطح پر برتری حاصل ہوئی ہے کہ جدیدیت کے حامی مفکرین مثلاً ہیبر ماس وغیرہ کے پاس ان کے جواب میں مغربی تہذیب کے آفاقی نیز عقلی طور پر برتر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں رہی۔ البتہ ابھی اس فکر کا اظہار سیاسی سطح پر نہیں ہوا، لیکن یاد رہے کہ فکر پہلے کتابوں میں لکھی جاتی ہے اور پھر وہ معاشرے اور ریاست میں نفوذ کرتی ہے۔ آخر لوگ ایک دن میں ہی تو enlightened نہیں ہوئے تھے بلکہ کئی صدیوں کی خونی تاریخ کے بعد ہی جدیدیت معاشروں پر غالب آئی۔ بدقسمتی سے ہمارے مسلم مفکرین (جو کئی صدیاں پیچھے کی سوچتے ہیں) جدیدیت کیلئے اسلامی علمیت سے دلائل فراہم کرنے کی فکر میں کوشاں ہیں: کبھی اجتہاد کے نام پر نصوص شریعت میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، کبھی اسلام کی نئی تعبیر کی بات کرتے ہیں، کبھی اجماعی مسائل امت سے انحراف کی دعوت دیتے ہیں، کبھی مغربی افکار و تصورات کی حقیقت سمجھے بغیر ہی انہیں اسلام میں تلاش اور انکا اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کیلئے مولوی کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں تاکہ عوام کا رابطہ علما سے کٹ جائے اور جدیدیت کی راہ ہموار ہوسکے۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مساجد و مدارس اور علمائے کرام کے وقار کا تحفظ درحقیقت جدیدیت کے خلاف جنگ میں اسلام کی زندگی اور بقا کا مسئلہ ہے، اگر ہم اس محاذ پر ہار گئے تو پھر جدیدیت کے سیلاب کے آگے بند باندھنے والا کوئی منفرد گروہ باقی نہیں رہے گا۔

۲.۵: سرمایہ دارانہ علم کی تشکیل

سرمایہ دارانہ علم درحقیقت (anthopocentric approach) یعنی 'حوادثات عالم اور انسانی زندگی اور معاشروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی تشریح و تعبیر میں انسانی نقطۂ نگاہ سے غور کرنے' کے رویے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں وحی سے حاصل ہونے والے علم کی روشنی میں اس کائنات اور انسانی معاشروں کو سمجھنے کی کو

شش کرنا سرمایہ دارانہ تصور علم میں معتبر علم نہیں کہلاتا۔ سائنسی علوم کے ماہرین جب بھی انسانی رویوں کے اخلاقی و غیر اخلاقی اظہار اور معاشروں و ریاست کی صحیح اور غلط تشکیل و ترتیب کے اصول وضع کرتے ہیں تو اسکے لئے وہ ہرگز وحی کی طرف رجوع نہیں کرتے، بلکہ وہ آزادی، مساوات اور ترقی کے مجموعی خاکے کو سامنے رکھ کر ان سوالات پر غور کرتے ہیں۔

تنویری علم سائنس کی دو شاخوں کی صورت میں متشکل ہو کر آج ہمارے سامنے موجود ہے: (۱) طبعی سائنسز اور (۲) معاشرتی سائنسز (natural and social sciences)۔ پہلے کا دائرہ کار انسانی ارادے کے کائناتی قوتوں پر تسلط کے امکانات کو بڑھانا جبکہ دوسرے کا مطلوب ایک ایسے معیاری معاشرے اور ریاست کی ترتیب و تنظیم کا لائحہ عمل وضع کرنا ہے جہاں افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور سرمائے کی بڑھوتری کے مواقع میسر آسکیں۔ اس بات کی مثال یوں سمجھی جاسکتی ہے جیسے اسلامی علمیت علم الفقہ، کلام اور تصوف وغیرہ کی صورت میں متشکل ہو کر سامنے آئی ہے۔ یعنی جیسے علم اصول فقہ اور فقہ کا مقصد قرآن و سنت میں وارد شدہ نصوص سے وہ اصول اخذ کرنا ہے جنکی روشنی میں یہ طے کیا جاسکے کہ ان گنت انسانی اعمال و افعال سے رضائے الہی کے حصول کا درست طریقہ کیا ہے (یعنی ان اعمال کا شرعی حکم بیان کیا جاسکے) نیز یہ معلوم کیا جاسکے کہ افراد کے تعلقات کو کن ضروری بندشوں کا پابند بنا کر معاشرے کو احکامات الہی کے تابع کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح سوشل سائنسز کا مقصد ایک طرف سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرے و ریاست کی علمی توجیہہ پیش کرنا ہے اور دوسری طرف یہ افراد کے تعلقات میں آزادی کی ان لازمی حدود کا تعین کرنے کے اصول وضع کرتی ہیں جنکے نتیجے میں سرمایہ دارانہ معاشرتی و ریاستی صف بندی وجود میں آسکے۔ تنویری مفکرین کا یقین تھا کہ جس طرح فطرت میں ایسے قوانین ہیں جو اشیاء پر عائد ہوتے ہیں بالکل اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ایسے قوانین فطرت ہیں جن کے تحت معاشرے قائم رہتے ہیں لہذا معاشروں اور انسانی تعلقات کی تفہیم کے لئے بھی سائنسی تجربے اور مشاہدے کا طریقہ استعمال کرنا ضروری ہے۔ سوشل سائنسز کا مقصد ایک ایسے نئے دستور، ایک ایسے نئے قانون، ایک ایسے نئے معاشرتی نظام کا قیام ہے جسے الہامی اور آسمانی قانون سے کوئی واسطہ یا رابطہ نہ ہو۔ ایک ایسا نیا سیاسی ڈھانچہ جس میں کوئی رعایا (subjects) نہ ہو بلکہ سب شہری (citizens) ہوں۔

۲.۶: سرمایہ دارانہ علمی اخلاقیات: 'خرید و فروخت' (Buying and Selling) کی ذہنیت کا عموم

لیوتارڈ ایک نامی گرامی پس جدیدی فلسفی ہے جس نے سائنسی علمیت کی حقیقت 'خرید و فروخت' کے معنی خیز الفاظ میں بیان کی ہے۔ اس بات کی تفہیم کیلئے خواہشات اور سرمائے کے تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ تسخیر کائنات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورلامحدودخواہشات کی تکمیل کومقصد علم ٹھہرانا درحقیقت سرمائے کی بڑھوتری (accumulation of capital) کواپنا مقصود بنانا ہے، کیونکہ ہرخواہش کی تکمیل سرمائے ہی کی مرہون منت ہے۔ یعنی اگر کوئی فرد یا معاشرہ آزادی کا خواہاں ہے تو اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ درحقیقت سرمائے میں اضافے کا خواہاں ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل بغیر سرمائے کے ناممکن العمل ہے۔ مثلاً ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس عالی شان بنگلہ ہو جس میں دنیا بھر کی پرتعیش اشیاء الٹ دی گئی ہوں، نئے ماڈل کی گاڑی ہو، کئی عدد پلاٹ اور کئی کمپنیوں کے شیئرز اسکی ملکیت ہوں جن سے حاصل ہونے والے نفع سے وہ مزید کاروبار کرسکتا ہو وغیرہ وغیرہ، تو ظاہر بات ہے کہ یہ تمام خواہشات بغیر سرمائے کے عملی شکل اختیار نہیں کرسکتیں۔ چنانچہ معاشیات کا مضمون اس بات کو باور کراتا ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادیت (یا آزادی) کا اظہار عمل صرف (Consumption) کے ذریعے کرتا ہے یعنی وہ جتنی زیادہ تعداد میں اشیاء کو اپنے استعمال میں لاکر صرف (Consume) کرتا ہے اتنی ہی زیادہ خواہشات کی تسکین کر سکتا ہے۔ اور ایک صارف (Consumer) زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین تبھی کرسکتا ہے جب اسکے پاس زیادہ سے زیادہ اشیاء خریدنے کیلئے آمدنی (Income) ہو۔ اسی طرح معاشیات کا مضمون یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کی خواہشات لامحدود (Infinite) ہونی چاہئیں، مگر چونکہ ان خواہشات کو پورا کرنے کے ذرائع لامحدود نہیں ہیں، لہذا زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ فرد اپنے ذرائع کو اپنے وجود کی ممکنہ حد تک بڑھانے کی کوشش میں لگا رہے (ذرائع میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی اسی خواہش کو ماہرین معاشیات عقلیت (Rationality) کا معیار کہتے ہیں، یعنی عقلمند شخص (Rational agent) وہی ہے جو سرمائے میں لامحدود اضافے کی خواہش رکھتا ہو)۔ آزادی کا مطلب ہی سرمائے کی بڑھوتری ہے اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں، جو شخص آزادی کا خواہاں ہے وہ لازماً اپنے ارادے سے اقدار کی وہی ترتیب متعین کرے گا جس کے نتیجے میں اس کی آزادی میں اضافہ ہو کیونکہ سرمایہ ہی وہ شے ہے جو ممکن بناتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی چاہے حاصل کرسکے۔ سرمائے کی بڑھوتری ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہیومنز کی ہر خواہش اور خواہشات کی تمام ترتیبوں کو جانچا جاتا ہے اور انکی تقابلی قدر (Exchange value) اسی قدر محض کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت (rationality) ہر فعل کو خودارادیت اور خودغرضیت کے پیمانے پر تول کر اس کی تقابلی قدر متعین کرتی ہے۔ جب للّٰہیت، محبت، طہارت، تقویٰ، آخرت کا خوف، عفت، حیا، غیرت، ایثار، شوق شہادت کو اس پیمانے پر تولا جاتا ہے تو یہ بالکل بے وقعت اور بے قدر دکھائی دیتی ہیں۔ ایک سول سوسائٹی یا سرمایہ دارانہ معاشرے میں ان اوصاف حمیدہ کے پنپنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس معاشرے کے نظام تعلیم کا مقصد تسخیر کائنات اور تمام فطری قوتوں کو ہیومن کے

ارادے کے مطیع بنانے کو بطور مقصد کے قبول کرنے کی ایمانیات کو مستحکم بنانا ہوتا ہے (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، ساحل اگست ۲۰۰۶: ص ۳۸)۔

اس بحث سے واضح ہوا کہ سرمایہ دارانہ علم کا مقصد سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری ہوتا ہے۔ سرمائے کی بڑھوتری کا یہ عمل اسی وقت ظہور پزیر ہوتا ہے جب علم بذات خود نفع خوری (profit-maximization) کے نظم (Discipline) کا پابند اور اسکے تابع ہوجائے، یعنی علم تعمیر کیا جائے 'بیچنے' کیلئے اور اسے 'خریدا' جائے صرف (consumption) کرنے کیلئے [knowledge is produced for sale, and purchased for consumption]۔ دوسرے لفظوں میں تکمیل خواہشات کی ذہنیت علم کو خرید وفروخت میں تبدیل کردیتی ہے اور خرید وفروخت کی یہ ذہنیت ہی سرمایہ دارانہ علمیت کی اصل شکل (essence) ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ معاشروں میں سائنس وٹیکنالوجی کی ایجادات سے لیکر سوشل و بزنس سائنسز کی تحقیقات تک خرید وفروخت کے اسی عمل کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ مثلاً جب ایک یونیورسٹی میں کمپیوٹر یا بزنس سائنس کا طالب علم چار سال کی محنت شاقہ کے بعد اپنے تعلیمی کیریئر کے آخری سال میں اپنا تحقیقی کام (Research project) کرنے لگتا ہے تو اسکے اساتذہ اسکے پلے یہ ہدایت نامہ باندھتے ہیں: 'بیٹا ایسا کام کرو جسکی کوئی مارکیٹ میں مانگ (Market value) ہو، فضول کاموں میں وقت برباد مت کرو'۔ درحقیقت یہی نصیحت تمام تر علم اور ٹیکنالوجی کا نقطہ آغاز وانتہا ہوتا ہے۔ تعلیم، تحقیق اور کنسلٹنسی (consultancy) کے تمام تر ادارے اسی اصول پر اور ایسا ہی علم تعمیر کرتے ہیں جسے زیادہ متوقع منافع وآمدنی کے ساتھ کمپنیوں کو بیچنا ممکن ہو، اور کمپنیاں ایسے ہی علم کو خریدتی ہیں جسے وہ اپنے پیداواری عمل میں استعمال کرکے مزید اشیاء بیچ کر زیادہ سے زیادہ منافع کما سکیں۔ خرید وفروخت کا یہ علم جب معاشروں میں پروان چڑھتا ہے تو معاشرے 'مارکیٹ' میں تبدیل ہوجاتے ہیں جہاں تعلقات کی بنیاد محبت، صلہ رحمی، تعاون اور مذہب نہیں بلکہ 'اغراض' اور اشیاء اور خدمات کی لین دین (Exchange of goods and services) بن جاتی ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ کسی شے کے لین دین میں ایک شخص ڈیمانڈر (Demander) اور دوسرا سپلائیر (Supplier) ہوا کرتا ہے، اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں طلب اور رسد (Demand and Supply) کا اصول ہی درحقیقت ہر رشتے اور تعلق کی اصل روح ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تعلق کی یہ نوعیت صرف موچی، درزی، کسان، مزدور، سرمایہ دار وغیرہ کے درمیان ہی بننے والے تعلقات میں ہوتی ہے، بلکہ ایک سرمایہ دارانہ معاشرے میں ہر تعلق (چاہے میاں بیوی کا ہو یا ماں باپ کا) کی روح آہستہ آہستہ بس طلب اور رسد (Demand and Supply) پر منتج ہوجاتی ہے کیونکہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

معاشرے کے تمام افراد ماں باپ، بھائی بہن، استاد شاگرد یا پیر مرید نہیں بلکہ پروفیشنل (professionals) ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مذہبی معاشرے میں استاد کا تعلق اپنے شاگرد سے باپ اور مربی کا ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں مارکیٹ (یا سول) سوسائٹی میں یہ تعلق ڈیمانڈر اور سپلائیر (Demander and Supplier) کا ہوتا ہے یعنی استاد محض زر کی ایک مخصوص مقدار کے عوض ایک خاص قسم کی خدمت مہیا کرنے والا جبکہ طالب علم اس خدمت کا ڈیمانڈر ہوتا ہے اور بس۔ ہر وہ تعلق جسکی بنیاد ڈیمانڈ اور سپلائی کی روح پر استوار نہ ہو سرمایہ دارانہ معاشرے میں لایعنی، مہمل، بے قدر و قیمت اور غیر عقلی (irrational) ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیار عقلیت کے مطابق عقل مندی (Rationality) اسی کا نام ہے کہ آپ تعلقات ذاتی اغراض کی بنیاد پر قائم کریں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی معاشرے میں سائنسی (بشمول طبعی و عمرانی) علوم عام ہوں اور افراد میں ذاتی اغراض اور حرص و حسد نیز دیگر اخلاق رزیلہ پروان نہ چڑھیں۔ یہ تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسے مذہبی علوم کا مقصد افراد میں زہد، تقوی، عزیمت، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم و فنا جیسی صفات عام کرنا ہے۔ سرمایہ دارانہ علوم کی بالا دستی کا مطلب درحقیقت افراد کی ذہنیت اور معاشروں کو خرید و فروخت کے نظم میں شامل اور تابع کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایسے علوم (مثلاً مذہبی علم) جو خرید و فروخت کی کسوٹی پر پورا نہ اترتے ہوں یعنی جنہیں خریدنے اور بیچنے کے نتیجے میں سرمائے کی بڑھوتری کے مواقع کم ہوں انکے پنپنے کے مواقع بھی اتنے ہی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے معاشرے (مثلاً مذہبی معاشرے) جہاں علم کے معنی خرید و فروخت نہ ہوں وہاں سرمایہ دارانہ علوم ہرگز ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں 'اعتدال پسند' اور enlightened ہونے کا سبق دیا جا رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر سائنسی علوم کا فروغ اور ترقی ہرگز ممکن نہیں۔

نتائج: نوٹ کرنے کی اہم باتیں

اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ علم سے مراد وہ مجموعہ معلومات ہے:

☆ جو ارادہ انسانی و خواہشات کی تکمیل (self-determination) کو ممکن بناتا ہو، اسے سائنس کہتے ہیں

☆ جو وحی کے علم ہونے کے انکار پر مبنی ہے لہذا یہ جہالت خالصہ ہے

☆ جسکا مقصد انسان کے تمتع اور تصرف فی الارض میں لامحدود اضافہ ہے

☆ جو اس مادہ پرستانہ تصور حیات کو بطور مقصد حیات قبول کرنے کی ذہنیت عام کرتا ہے

☆ اس کے پھیلاؤ کے نتیجے میں افراد میں بہت سے اخلاق رزیلہ پھیلتے ہیں:

- خود غرضی (اپنے مقصد کیلئے دوسروں سے تعلقات قائم کرنا)
- حرص (زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خواہش)
- حسد (دوسروں سے زیادہ دولت کی خواہش)
- طول امل (دنیا کی بے پناہ محبت، طویل العمری کی خواہش اور موت سے کراہیت)
- غضب (ہر شے کو قابو اور زیر کرنے کی خواہش)
- لذت پرستی (خواہشات نفسانی کی کثرت)
- عبادات کو حقیر جاننا، ضیاع اوقات، گناہ کے کاموں کو تفریح سمجھنا، کلام لغو (جو فحش گوئی، کھیل تماشوں، فلموں، ٹھٹھے بازی اور جنس مخالف کے موضوعات سے پر ہوتا ہے) وغیرہ کے اوصاف کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔

☆ جس میں کوئی حتمی حق نہیں ہوتا (سوائے اس کے کہ انسان قائم بالذات ہے)

یہ فکر اور تصور بداہتاً لغو اور عقلاً باطل ہے اسی لئے فکری سطح پر سرمایہ دارانہ علمیت ایک دم توڑتی ہوئی فکر ہے، لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم اسکی ماہیت و مقاصد کی سمجھ بوجھ حاصل کر کے اسکا محاکمہ کرنے کی کوشش کریں نہ یہ کہ اس کی حمایت میں امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماع کا انکار کر کے اس جاہلی علمیت کے لئے دلائل فراہم کر دیں۔ ہمارے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے جدیدی علمیت کے افکار و نظریات کے خدوخال پر اپنے معاشروں اور ریاست کو تشکیل دیا تو وہ لازماً ایک قوم پرست مسلم سرمایہ دارانہ ریاست ہی بنا پائیں گے جس کے نتیجے میں اس ملک کے مسلمانوں کو تو شاید کوئی مادی فوائد مل جائیں لیکن اسلام کو ہرگز بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ نظام کی اساسی اقدار

آزادی، مساوات اور عدل

علی محمد رضوی

کسی بھی تہذیب کا انحصار اس کے اقداری نظام پر ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی تہذیب کی ماہیت اس کے اصول کو سمجھنے کے لیے اس کے بنیادی اقدار کا سمجھنا اور جاننا لازمی ہے۔ یہ زمانہ جس میں ہم رہ رہے ہیں مغربی تہذیب کے غلبہ کا زمانہ ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اقدار کو سمجھا جائے جس پر مغربی تہذیب قائم ہے تاکہ وہ سامان مہیا کیا جا سکے جس کی بنیاد پر ہم اپنے معاشرے اور تہذیب کو مغربی تہذیب سے بچانے کی کوشش کر سکیں اور ان اقدار کو فروغ حاصل ہو جو ہماری تہذیب کا جزو لاینفک ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب آخر ہے کیا؟ اور اس کی بنیادی قدریں کیا ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تہذیب انسان پرست (Humanist) تہذیب ہے جس کا محور و مرکز انسان اور صرف انسان ہے اور جس کی تمام تر جولانیوں کا حاصل اس دنیا میں انسان کی خدائی کا قیام ہے۔ مغربی تہذیب کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی بنیادی قدر آزادی ہے۔ یہی تہذیب مغرب کی اساس اور بنیاد ہے۔ دراصل آزادی نام ہے اس بات کا کہ انسان خیر و شر کے معیارات کے تعین کا نہ صرف مجاز بلکہ حق دار ہے اور اس کی انسانیت کا جوہر ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آزادانہ متعین کردہ اقدار کو اپنا سکے اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ اس کا بہترین اظہار ہمیں مغربی مفکر کانٹ کے یہاں ملتا ہے جو انسان کو End in himslef یا مقصود بالذات قرار دیتا ہے وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ تم کوئی بھی کام یہ سوچ کر نہ کرو کہ تم ذریعہ ہو بلکہ ہر کام یہ سوچ کر کرو کہ تم ہر چیز کا مقصود ہو۔

مغربی مفکرین نے آزادی کی دو اقسام بیان کی ہیں۔

(۱) آزادی کا منفی تصور (Negative Freedom)

(۲) آزادی کا مثبت تصور (Postive Freedom)

آزادی کا منفی تصور:

آزادی کا منفی تصور یہ ہے کہ معاشرہ جو ناگزیر پابندیاں لگاتا ہے اس کے باوجود انسان کے پاس ایک ایسا

علاقہ بچ رہنا چاہیے جس میں وہ اپنی خدائی کا اظہار کر سکے اور اپنے متعین کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔ آزادی کے منفی تصور میں اس بات سے بحث نہیں ہوتی ہے کہ انسان اس دائرہ کار میں کس قسم کی زندگی گزارے گا (شراب پیئے گا، نماز پڑھے گا، زنا کرے گا وغیرہ) بلکہ صرف منفی طور پر یہ تصور کارفرما ہوتا ہے کہ تمام ناگزیر معاشرتی جکڑ بندیوں کے درمیان ایک ایسا علاقہ ضرور ہونا چاہیے جس میں انسان جو چاہے وہ کر گزرے اور کسی دوسرے کے سامنے وہ اس معاملے میں جواب دہ نہیں ہوتا۔ وہ اس علاقہ میں چاہے کچھ بھی کرے یہ اس کا وہ مقدس حق ہے۔ جس کے اندر کوئی دوسرا مداخلت نہیں کر سکتا۔ اس تصور کے رو سے انسان کی ذاتی زندگی میں آزادی اس کی نفسیاتی خواہشات پر ہر قسم کی قدغن سے آزادی ہے۔ انفرادی حقوق کا سارا معاملہ اس مقدس آزادی کا تحفظ ہے جس میں آزادی فکر و نظر، حق ملکیت، اظہار رائے وغیرہ کا حق شامل ہے۔ عیسائی برلن کے الفاظ ہیں:

"ان معنوں میں آزاد ہونے کا مطلب دوسروں کی کسی قسم کی مداخلت سے آزادی ہے۔ دوسروں کی مداخلت سے آزادی کا یہ علاقہ جتنا وسیع ہوگا اس قدر میں زیادہ آزاد ہوں گا۔"

"یہ بہت ضروری ہے کہ کم از کم ایک ایسا علاقہ ضرور ہو جس میں کسی کو کسی بھی حالت میں مداخلت کا حق نہ ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا ہے وہ اچھائی اور برائی کے پیمانوں کا خالق ہے۔ لبرلزم کے تمام دھڑے اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی اختیار کا کوئی نہ کوئی دائرہ معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جہاں وہ اپنی خدائی کو روبہ عمل لا سکے۔ ریاست و معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اس دائرے کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیں۔

برلن کے الفاظ میں:

"اکیلی آزادی جو آزادی کہلانے کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے طریقے کے مطابق اپنے اہداف حاصل کرنے کا اختیار ہو۔"

وہ مزید کہتا ہے کہ:

"آزادی کا یہ تصور اس منفی ہدف پر مشتمل ہے کہ انسان کے مخصوص دائرہ اختیار میں ہر قسم کی مداخلت کا قلع قمع کیا جا سکے۔"

آزادی کے اس تصور کے نتیجہ میں پبلک اور پرائیویٹ لائف کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کے منفی پہلو سے مراد یہ ہے کہ انسان کی نجی زندگی میں کسی کو بھی مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کی آزادی زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک وسیع ہوتی چلی جائے تاکہ وہ اس کی خدائی میں اضافہ ہو سکے۔

منفی آزادی کے نتائج:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منفی آزادی سے جو وسیع نتائج اخلاق، معاشرت اور ریاست کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں ان پر سیر حاصل بحث کا تو یہ موقع نہیں ہے لیکن چند اشارات ناگزیر ہیں۔

۱۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی درحقیقت کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف ایک خالی علاقہ ہے جہاں انسان جو کچھ چاہے وہ کر گزرے۔ خود آزادی کچھ نہیں ہے۔ اس کا کوئی Content نہیں ہے بلکہ اس کا Content نفسانیت سے پر ہوتا ہے۔

۲۔ آزادی اقدار کی نفی ہے۔ کیونکہ جب آپ کہیں گے کہ آزادی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں آپ جو چاہیں کر گزریں اور جو آپ کریں وہی حق ہے تو اقدار کی بحث بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہر شخص قدر خود متعین کرتا ہے حالانکہ قدر کی تعریف ہی یہ ہے کہ جس کا پیمانہ انسان کی ذات نہیں بلکہ خارجی اور معروضی ہو۔ اگر ہر شے اور خواہش کی قدر یکساں ہے تو فی الحقیقت کسی شے کی کوئی قدر نہیں۔

۳۔ آزادی کے منفی تصور سے متصل تصور اقدار کے تعدد یعنی Plurality of Values کا ہے۔ یعنی میری متعین کردہ قدر اور آپ کی متعین کردہ قدر برابر ہے۔

اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ ترتیب اقدار ناممکن ہے کیوں کہ ہر شخص کی متعین کردہ اقدار یکساں اہمیت کی حامل ہیں لہٰذا اقدار کی فوقیت صرف ارتکاز قوت (کثرت رائے یا کثرت مال) سے قائم کی جا سکتی ہے اور اس فوقیت کا کوئی نظری جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی کا مثبت پہلو:

لبرلزم کے پاس آزادی کا کوئی مثبت معاشرتی تصور موجود نہیں ہے بلکہ وہ منفی آزادیوں کے مجموعہ ہی کو معاشرتی اور مثبت تصور گردانتے ہیں اور ان کے خیال میں معاشرہ کا فرض ہی یہ ہے کہ منفی آزادی کے مجموعہ کی زیادہ سے زیادہ بڑھوتری کے لیے تگ و دو کرے۔

لبرلزم کے برعکس کمیونیٹیرین آزادی کا ایک مثبت تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں عقل ہمیں بتا سکتی ہے کہ آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے۔ اس سلسلہ میں روسو، ہیگل اور مارکس نے مثبت آزادی کے مختلف تصورات بیان کیے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم بنیادی طور پر لبرل سوچ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے ہم تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کمیونیٹیریزم مثبت آزادی (Positive Freedom) سے وہ معاشرتی نظام مراد لیتے ہیں جس کے قیام کے نتیجہ میں انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکے۔ روسو کے مطابق خدا بن جانے کا یہ عمل (Social Contract) کے ذریعہ ایک انقلابی معاشرہ کے قیام کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور مارکس کے خیال میں انسانیت طبقاتی کشمکش کے ذریعہ بحیثیت نوع خدا بن سکتی ہے۔ خدا بننے کی آرزو تمام خواہشات کی تکمیل

کے سوا کچھ نہیں چنانچہ کمیونیٹرزم جس تعقل کو بنیاد بنا کر Positive Freedom کو متشکل کرنے کا دعویٰ دار ہے وہ بھی خواہشات کی غلام ہے۔ وہ بھی Rationality bounded by desire ہے اور اقدار کی آفاقی اور مستقل ترتیب کرنے سے قاصر ہے لینن نے اس بات کا اقرار کئی جگہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے جن اخلاقیات کو اپنانا چاہیے وہ ان اخلاقیات سے بالکل مختلف ہیں جو اشتراکی معاشرہ کی تعمیر کے دور میں مستحسن قرار دی جانے چاہیں یعنی کوئی مستقل اقدار موجود نہیں۔ لبرل مفکرین آزادی کے مثبت تصور کو رد کرتے ہیں اور آزادی کے حصول کا صحیح طریقہ منفی آزادی کے فروغ کو ہی گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مثبت آزادی کی جستجو لا حاصل بلکہ خطرناک ہے کیونکہ اس سے فاشزم کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔

لبرل مفکرین کے نزدیک آزاد معاشرہ میں:

(۱) قوت مطلق نہیں ہوتی بلکہ حقوق مطلق ہوتے ہیں۔

(۲) فرد کی زندگی کے اردگرد ایسی غیر مصنوعی سرحدیں ہیں جو مقدس ہیں اور جنہیں کسی قیمت پر پامال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لبرلز کے نزدیک مثبت آزادی ممکن ہی نہیں

یعنی اصل مقصود ''منفی آزادی'' ہے اور مثبت یا معاشرتی آزادی اس کے تحفظ کا ذریعہ ہے اور لبرل مفکرین کے یہاں مثبت سیاسی حقوق، سیاسی عمل میں شرکت، وغیرہ کا واحد مقصد ''منفی آزادی'' کا تحفظ ہوتا ہے ان مفکرین کے نزدیک انسانیت کی مجموعی آزادی کا تصور لغو اور صرف تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔

مساوات: (لبرلز کے نزدیک)

لبرلزم کا تصور مساوات اس کے تصور آزادی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ہر انسان کے متعین کردہ اہداف دوسرے انسان کے متعین کردہ اہداف کے برابر قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

اس تصور کے مطابق ترتیب اقدار ناممکن ہو جاتی ہے۔ معاشرتی قدر و قیمت انسان کے اعمال اور اخلاص سے متعین نہیں ہوتی بلکہ مادی ترقی معاشرتی قدر و قیمت کا واحد معیار رہ جاتی ہے۔

رالس (Rawls) نے اس سلسلہ میں ایک عمدہ مثال دی ہے وہ کہتا ہے کہ ایک شخص اگر متعین رقبہ میں ہیروئن کو ختم کرنے کا ہدف طے کرتا ہے اور دوسرا شخص اسی رقبہ میں گھاس کی پتیوں کو گننے کا ہدف مقرر کرتا ہے تو لبرلزم کے نزدیک یہ دونوں اہداف یکساں معاشرتی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

معاشرہ کو دو طرح سے معاشرتی اداراتی حیثیت دی جاتی ہے۔ (۱) قانونی طور پر (۲) سیاسی طور پر۔

سیاسی طور پر ہر شخص کا ووٹ برابر ہے چاہے وہ نمازی ہے یا زانی یا شرابی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانونی اعتبار سے ہر شخص کی آزادی کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس میں مداخلت نہ کی جا سکے اور اس کی نجی حیثیت برقرار رہ سکے۔

اسلام مساوات کے اس تصور کو رد کرتا ہے۔ تمام اقدار کی یکساں اہمیت نہیں ہے بلکہ خدا کی قائم کردہ مطلق ترتیب ہے کہ جس میں ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص تقویٰ میں، محبت رسول میں بڑھا ہوا ہے وہی افضل ہے۔ کوئی شرابی وزانی نہ تو نمازی کے برابر ہو سکتا ہے نہ اس کے ووٹ کی قدروقیمت نمازی کے ووٹ کے برابر ہو سکتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ”جو جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔“

ایک لبرل معاشرہ میں عدل کا تصور یہ ہے۔

(۱) ہر فرد کو اس کا حق ہو کہ وہ اپنی ذاتی اور معاشرتی اہداف کو آزادانہ طور پر (Autonomously) مقرر کرے۔

(۲) تمام اہداف کو مساویانہ معاشرتی قدر حاصل ہو ان میں کوئی ترجیحی ترتیب جائز نہیں۔

(۳) لیکن چونکہ اس ترجیحی ترتیب کے بغیر زندگی کا کاروبار نہیں چلایا جا سکتا لہٰذا اہداف میں ترتیب کا حق صرف مستقل تبدیل ہوئی اکثریتی رائے کو سونپا جا سکتا ہے۔

(۴) اس کے باوجود اکثریت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی فرد کا بنیادی فطری حق منسوخ کر دے۔ فطری حق یہ ہے۔

”ہر فرد کے ساتھ مساویانہ قانونی اور اخلاقی برتاؤ کیا جائے گا خواہ اس کے عقائد، کردار، شخصیت اور میلانات کچھ بھی ہوں۔“

لبرل تصور عدل سراسر ظلم ہے کیونکہ

(۱) اس تصور کے مطابق فرد کو خدا کا مقام دیا جاتا ہے فرد کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی تمام نفسانی خواہشات کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ خیر و شر کا بنیادی معیار نفسانی خواہشات ہیں۔

(۲) چونکہ تمام نفسانی خواہشات یکساں طور پر قدر رکھتی ہے لہٰذا اصولاً ان کو کوئی ترجیحی ترتیب نہیں دی جا سکتی عملاً چونکہ یہ ترتیب ناگزیر ہے لہٰذا اس کا حق اکثریت کو دیا جاتا ہے۔ لیکن اکثریت کو یہ حق نہیں ہے کہ فرد کے خدا ہونے کے بنیادی مفروضہ کو رد کرے۔

(۳) لبرلزم فطرت انسانی کے ادراک کا واحد ذریعہ صرف طبعی علوم (Physical Scinices) کو گردانتا ہے۔ لبرلزم کا تصور عین جہالت ہے۔ چونکہ لبرلزم کے مطابق علم کی بنیاد ایمان نہیں بلکہ ریب (doubt) ہے۔

جیسا کہ کارل پاپر (Popper) نے کہا ”صرف وہ حق ہے جس کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔“ لبرل ”علم“ کے حصول کا واحد مقصد تسخیر کائنات ہے۔

(۴) جیسا کہ لبرل فلسفی خود اقرار کرتے ہیں طبعی ”علوم“ کسی ضابطۂ حیات یا نظام اخلاق کی نشاندہی نہیں کرتے وہ ”value neutral“ ہیں۔ لبرلزم کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ فرد کی پرستش کے باوجود وہ فرد کی داخلی زندگی اور اس کی داخلی کیفیات کا کوئی ادراک نہیں رکھتا۔ اس کا ”علم“ صرف ہیئت (form) اور تعلقات (Structures) تک رسائی رکھتا ہے۔ عرفان ذات سے قاصر ہے۔ اس کی دنیا بے نور (disenchanted) ہے چونکہ لبرلزم دل کی دنیا تاریک کر دیتا ہے لہٰذا وہ خدا کی موت (god is dead) کا قائل ہے۔

(۵) لبرلزم فرد کی شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ وہ محبت اور عبدیت کی نفی کر کے خودغرضی کو معاشرتی اور شخصی عمل کا واحد محرک تسلیم کرتا ہے۔ لبرل معاشرہ کا نمائندہ فرد خودغرض، سفاک، مفاد پرست اور متکبر ہوتا ہے۔ اس کی تمام تر دلچسپی اس دنیا کے مادی مفادات پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ تکاثر کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور محبت اور خیرخواہی کی بنیاد پر شخصی تعلقات استوار کرنے سے بتدریج قاصر ہوتا ہے۔

(۶) لبرل معاشرہ اعتماد (Trust) سے خالی ہوتا ہے وہ خیر کی کوئی مستقل تعریف کرنے سے قاصر ہے لہٰذا اشخاص کو سماجی وحدتوں میں جوڑنے کے بجائے توڑتا ہے۔ تمام بنیادی سماجی ادارے لبرل معاشرہ میں شکست ریخت کا شکار ہوتے ہیں۔ لبرل معاشرہ خاندان پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ مرد اور زن کے تعلق کی بنیاد محبت کی بجائے شہوت کے قرار پاتی ہے اور ہر لبرل معاشرہ لازماً جنسی بے راہ روی کو فروغ دیتا ہے۔ اخلاقی تنزل کی بدترین مثالیں لبرل معاشرہ ہی فراہم کرتی ہے۔

ظاہر ہے اسلام لبرل اقدار، تصورات معاشرت اور نظام سیاست کی مکمل نفی کرتا ہے۔ ایک لبرل جمہوری ریاست میں اسلام کے پنپنے کے مواقع بتدریج معدوم ہو جاتے ہیں خواہ وہ ریاست دستوری ہو یا فلاحی ان دونوں قسم کی لبرل ریاستوں کے خلاف انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دستوری اور فلاحی ریاستوں کو مسمار کرنے کی ایک مربوط اور جامع اسلامی انقلابی حکمت عملی مرتب کی جائے۔

آزادی اور مساوات کے تصورات کی اصل نوعیت کا ادراک عام ہو اور ان اقدار کو ”اسلامیانے اور اسلامی جمہوریت اور لبرلزم کا ایک مغلوبہ بنانے کی تمام کوششیں ترک کی جائیں۔“

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقوقِ انسانی کا چارٹر

سرمایہ داری کا مذہبی صحیفہ

محمد احمد حافظ

دورِ حاضر میں تحریکاتِ اسلامی کے کارکنان کے لیے "انسانی حقوق" کا موضوع نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

انسانی حقوق کا چارٹر جسے یو این او کے ذریعہ تمام ممبر ممالک پر یکساں طور پر لاگو کیا گیا ہے، عمومی طور پر اسے ایک ایسا "خیر" اور "حق" تصور کیا جاتا ہے جو فلاحِ انسانی کا ضامن، امن وسلامتی کا علمبردار اور شرفِ انسانی کا پیکر ہے۔ ہمارے بہت سے اہلِ علم اور عام پڑھے لکھے حضرات بھی ایک قدم مزید آگے بڑھ کر "انسانی حقوق" کے چارٹر کو اسلامی تعلیمات خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں ایک مقبولِ عام جملہ اکثر دہرایا جاتا ہے کہ: "اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے سب سے پہلے انسانی حقوق عطا فرمائے......" بادی النظر میں یہ جملہ ممکن ہے اپنے اندر کسی قسم کی پیچیدگی نہ رکھتا ہو مگر جب ہم اس چارٹر کو مغربی فکر کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ جملہ اسی طرح نظر آتا ہے جیسے کہا جائے کہ "اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے سب سے پہلے ہندومت کی بنیادیں فراہم کیں......!!" کیا کوئی ہوش مند مسلمان یہ جملہ کہہ کر اپنے ایمان سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہوگا؟ ظاہر کہ نہیں!

فلسفہ انسانی حقوق کا مختصر خلاصہ:

قبل اس کے ہم آگے بڑھیں، خلاصے کے طور پر "حقوقِ انسانی" کی اصل فکر کو چند سطور میں بیان کردیں..... سترھویں صدی عیسوی میں جب جدید یورپ کی ابتدا ہوئی تو اس دور میں جو فکر ابھر کر سامنے آئی اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت سے تعبیر کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت یہ ہے کہ انسان کسی کا عبد نہیں بلکہ وہ آزاد (Free) ہے۔ آزاد ان معنوں میں کہ وہ جو چاہنا چاہے، چاہ سکے اور جس چیز کی خواہش اس کا نفس کرے اسے حاصل کر سکے۔ خواہشات بے پناہ ہیں اور انسان کو خواہشات کی تکمیل کے لیے بنیادی طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ "سرمایہ" ہے سرمایہ ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس کے ذریعے تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ امکانات وقوع پذیر

ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت مابعد الموت سے بحث نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک موت اختتامِ زندگی ہے۔

چناں چہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں جس طرح مابعد الموت کی بحث نہیں، اسی طرح ماقبل پیدائش کا سوال بھی خارج از بحث ہے۔ مغربی فکر کے جتنے بھی کلاسیکل مفکرین ہیں، ان کے نزدیک انسان اسی معنی میں قائم بالذات اور اپنا خالق خود (Existent by itself) ہے۔ اس فکر کا مقدمہ پانچ صدی قبل مسیح کی یونانی فکر میں بھی ملتا ہے جس میں یونانی مفکر پروتاغورس کہتا ہے:

"انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے"

یعنی وہ اس کائنات میں مقصود بالذات ہستی ہے اور وہ کائنات کی ہر شے کو اپنی مرضی (Decision) اور منشاء (will) کے تابع کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ تصورِ انفرادیت "الوہیت انسانی" کا مظہر ہے، اور اسی تناظر میں تہذیب مغرب کا کلمہ...... "لا الٰہ الا الانسان" ہے۔

انسانی حقوق کو "خیر" سمجھنے کا مغالطہ کیوں؟

اصطلاح "انسانی حقوق" ہیومن رائٹس کا ترجمہ ہے۔ "ہیومن" کا مغربی فلسفہ وفکر میں خاص مقام اور اس کا خاص معنٰی ومطلب ہے اور ظاہر ہے کہ "ہیومن" کا ترجمہ "انسان" کر کے اسے نہیں سمجھا جاسکتا۔ "ہیومن" مغربی فکر میں ایک خاص مفہوم کا فرد ہے جس کے معنی ومطلب کو جاننے کے لیے ہمیں لازماً مغربی فلاسفہ کے افکار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جب ہم ہیومن کی کنہ اور مغربی فکر میں اس کی وجہ وجود کو جان لیں گے تو ہمارے لیے انسانی حقوق کے چارٹر کا تجزیہ ومحاکمہ کرنا آسان رہے گا۔

انسانی حقوق کا تاریخی پس منظر:

جدید یورپ کی ابتدا عیسائیت کی شکست وریخت سے ہوئی۔ عیسائی پادری مارٹن لوتھر وہ شخص تھا جس نے اپنے ہی مذہب پر کاری ضرب لگائی اور لوگوں کو عیسائیت کے خلاف وہ بنیادیں فراہم کردیں، جن کے سہارے انہیں مذہب سے راہِ فرار ڈھونڈنے میں آسانی ہوگئی۔ انہی بنیادوں پر بعد کے فلسفیوں نے عیسائی علمیت کو رد کیا اور ہیومن ازم (انسان پرستی) کا آغاز ہوا۔ مغربی مفکرین نے مذہب کو زندگی کے ہر شعبے اور ہر سطح سے خارج کر کے انسان ہی کو ہر شے کی میزان ٹھہرایا۔ انسان کو اللہ کا بندہ ہونے کی بجائے ایک ایسے آزاد فرد کے طور پر باور کرایا جو خیر وشر کی تعیین اور تحدید میں بذاتِ خود ایک پیمانہ ہے۔ یہ فرد ہر طرح کے شک وشبہے سے بالاتر قرار پایا۔ مغربی فلسفیوں (ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، نطشے، روسو وغیرہ) کے نزدیک کائنات کو صرف اور صرف انسانی پیمانوں پر پرکھنا ہی علمیت کی میراث ہے۔ یوں انسان پرستی (ہیومن ازم) کو اقداری ڈھانچے میں کلیدی اور قطعی حیثیت حاصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئی۔

ہیومن ازم کیا ہے؟

انسان کو کائنات کا محور و مرکز قرار دینا ہی ہیومن ازم ہے۔انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی کے مطابق:

Humanism is that philosphical and literary movement originated in italy in the second half of the fourteenth century and diffused into other countries of Europe coming o constite one of the factors of the factors of modern culture.

ترجمہ: ہیومنزم وہ فلسفیانہ اور ادبی تحریک ہے جو چودھویں صدی کے نصف ثانی تک میں اٹلی میں پیدا ہوئی اور وہاں سے یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیل گئی جو بالآخر جدید ثقافت کی تشکیل کے اسباب میں سے ایک سبب بنی۔

اس کی حقیقتوں سے بحث کرتے ہوئے درج کیا گیا:

Hunasim is also any philosphy which recogonizes the blue or drignity of man and makes him the measure of all things of some how takes human nature,its limits, or its interest as its theme.

[Encyclopaedia of philosphy the macmillon company and the free press N.York]

ترجمہ: ہیومنزم ہر اس فلاسفی کو بھی کہتے ہیں جو انسانی قدر یا عزت کو تسلیم کرے اور اسے ”تمام چیزوں کا میزان“ قرار دے یا جو صرف انسانی طبیعت کو اپنی فکر کی حد یا دائرہ کار کی حیثیت سے لے۔

ہیومن ازم کی تحریک اپنی اصل کے اعتبار سے وحی الٰہی اور ہدایت ربانی کی ضد تھی۔اس تحریک کا مقصد عیسائی معاشرے میں تصورِ الٰہ، تصورِ رسول اور تصورِ آخرت کو ختم کر دینا تھا، چناں چہ اس تحریک نے عیسائیوں کو ہر اس ہدایت کے انکار کی طرف ابھارا جو ربانی یا آسمانی ہو اور ہر اس ضابطے سے بغاوت پر آمادہ کیا جس کی بنیاد ہدایتِ الٰہی تھی۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں بیان کیا گیا:

Hunasim in philosophy is opposed to nauralism and absolutism; it desuganates the philosophical attitude which regards the interpretation of human experience as the primary concern of human knowledge for this

purpose.

[Encyclopedia of religion and ethics edinbery, T&T clarh, 1937]

ترجمہ: فلسفہ میں ہیومن ازم ہر طرح کی فطریت (ربانیت) اور کلیت کی ضد ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفیانہ رجحان دیتا ہے جو انسانی تجربوں کی تشریحات کو ہر طرح کے فلسفہ کا اولین مرکز توجہ دے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس کام کے لیے انسانی علم کافی ہے۔

ہیومن ازم کی فکری بنیادیں:

کسی بھی نظام میں سب سے بنیادی مسئلہ تصورِ ذات (self) کا ہوتا ہے۔مثلاً آپ ایک عالمِ دین سے پوچھیں کہ انسان ذاتی طور پر کیا ہے؟ اور اس کا بنیادی وظیفہ کیا ہے؟ تو وہ ربانی عالمِ دین آپ کو بتائیں گے کہ انسان دراصل اللہ کا بندہ ہے اور اس کا بنیادی وظیفہ اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔مگر یہی سوال جب آپ کسی مغربی فرد سے کریں گے تو وہ آپ کو جواب دے گا کہ انسان کے اندر وہ جبلتیں اور خصائص موجود ہیں جن کی بنیاد پر وہ خود اپنی زندگی کو استوار کر سکتا ہے۔اسے کسی ماورائی ذات کی پرستش کرنے، اس سے ہدایت حاصل کرنے اور اس کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں۔

مغربی فکر میں انسان ہی کائنات کا میزان ٹھہرایا گیا ہے۔ چناں چہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی خارجی قدر، وحی اور ہدایتِ الٰہی کا انکار کر دے۔ وہ کائنات میں کارفرما عقائد، نظریات اور افکار و خیالات کو اپنی عقل کی میزان میں پرکھ کر فیصلہ کرے کہ وہ ریزن ایبل (Reason able) ہیں کہ نہیں؟ یہ ریشنل ازم یا عقلیت پرستی ہے۔

ریشنل ازم لاطینی لفظ Ratio سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے عقل یا Reason انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی کی روح ان فلاسفروں سے مربوط ہے جو سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ میں پیدا ہوئے۔ ان مغربی فلاسفروں کے مطابق عقل کی بنیاد پر قطعی اور آفاقی سچ کا حصول ممکن ہے۔ چناں چہ جب انسان ہی تمام خیر و شر کا تعین کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں خدا پرستی کا کیا سوال؟

مشہور فلسفی ڈیکارٹ [۱۵۹۶ء۔۱۶۵۰ء] وہ شخص ہے جس نے جدید فلسفہ کی بنیاد رکھی اور عیسائیت کو شکست دی، اس نے انسانی ادراکات میں کسی بھی خارجی عامل کو رد کر دیا اور سیلف نالج کی خالص عقلی دلیل دی۔ اس کے پیش کردہ فلسفے کے مطابق:

”علمی اور عقلی بنیادوں پر کوئی بھی انسان اپنے سوا کسی بھی چیز کو خواہ وہ خیالات ہوں یا اقدار، معیارات خیر و شر ہوں یا وحی اور چاہے خدا کا وجود، غرض کسی بھی چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ اکیلی میری ذات میرا وجود ہے، جس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونا کسی بھی قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہے۔"

ڈیکارٹ کے نزدیک واحد سچ:...... "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔"

[Ithink there for I,m]

یعنی میں اپنے اس دنیا میں ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں۔ میرا وجود کسی خارجی ذریعے، حقیقت مطلق یا خالقِ کائنات کا مرہون منت نہیں...... ڈیکارٹ کے مطابق میری عقل کی استطاعت نہیں کہ میں اپنے وجود کے سوا کسی بھی دوسری ذات کے وجود کا ماورائے شک جواز پیش کر سکوں۔

اس طرح ڈیکارٹ نے ایک ایسی علمیت (جہالت) کی بنیاد رکھی جو کہ اولاً مابعد الطبیعات (وحی) سے ماورا تھی...... وہ (Doubt) پر قائم تھی۔ ڈیکارٹ کے پیش کردہ تصور انسانی یا تصور ذات کو بعد کے مفکرین نے آگے بڑھایا۔

روسو کا خیال ہے کہ انسان بنیادی طور پر خیر ہے۔ وہ ہمیشہ خیر کا طالب ہوتا ہے۔ (یہاں خیر سے مراد وہ خیر نہیں جسے ہمارا دین خیر کہتا ہے بلکہ روسو کے مزعومہ انسان کا خیر اس کی "خواہشِ نفس" ہے۔) وہ کہتا ہے کہ انسانی خواہشات، جبلتیں اور احساسات فطرتاً پاک ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے تحت جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ عمومی فلاح ہے، اس کے خیال میں:

The self is essentially good

"انسان فی نفسہ خیر ہے"

چوں کہ مغرب کا فرد خود اپنی عقل سے اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کیا چیز خیر ہے اور کیا نہیں اس لیے اس کے ہاں وہ بات بھی خیر میں شامل ہے جو ہمارے ہاں بدی تصور کی جاتی ہے۔ مثلاً جھوٹ بولنا، ماں باپ کی نافرمانی، زنا، اور دیگر فواحش ومنکرات جنہیں ہم رذائل میں شمار کرتے ہیں۔ ہیومن کے نزدیک وہ خیر ہی ہے۔

کانٹ انسانی ذات کے بارے میں کہتا ہے کہ:

self کے اندر وہ ترتیب اور نظم order موجود ہے جس کے نتیجے میں اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کو واضح کر سکے۔ کانٹ Kindom of ends میں ایک ایسی ریاست کا قائل ہے جہاں ہر فرد کا یہ اختیار تسلیم کیا جائے کہ وہ خود مختار [Automomous] اور قائم بالذات [self determind] ہے۔ جہاں ہر شخص اس بات کا تعین کرے کہ وہ کس قسم کی زندگی گزارے گا۔ جہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ ہر شخص خیر وشر کا تعین خود کر سکتا ہے۔

ہیگل کے خیال میں اجتماعیتوں (معاشروں) کی تاریخ اور طرز حیات ہی خیر وشر کے پیمانہ ہیں۔ اخلاقیات وہ نہیں جو انجیل اور قرآن میں لکھی ہیں بلکہ اخلاقیات سے مراد یہ ہے کہ تاریخی اجتماعیت نے ارتقاء

(Evolution) کے لیے جو معیارات خیر وشر مقرر کیے ہیں انہی سے اخلاقی معیارات اور پیمانے تشکیل پاتے ہیں۔ ہر آنے والا وقت پہلے سے بہتر ہے اور اس کے پیمانے پہلے دور کے مقابلے میں فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی کا نام ارتقاء اور ترقی ہے۔ چوں کہ سب سے زیادہ ترقی جس اجتماعیت نے کی ہے اور سب سے زیادہ جس نے غلبہ حاصل کیا ہے وہ مغرب ہے، اس لیے مغرب کی تاریخ، اس کی تہذیب، ادارتی صف بندی اور آدرشیں ہی حق وباطل کا معیار ہیں اور چوں کہ مغرب کی اس ترقی کے آگے کسی ترقی کا تصور نہیں ہو سکتا اس لیے مغربی تہذیب ہی بنیادی طور پر ذات مطلق اور روحِ کائنات کا مکمل اظہار ہے۔

سارتر جو مغرب کا بہت اہم مفکر ہے، اس کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات (self) کے اندر اس بات کی استطاعت ہے کہ وہ جیسا بننا چاہے بن سکے، وہ اپنی تخلیق خود کر سکتا ہے اور دنیا کو بھی جیسا بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر کوشش کرتا ہے کہ وہ خدا بن جائے، اگر وہ خدا نہیں بننا چاہتا تو یہ Bad faith ہے۔

سارتر نے جو بات کہی ہے کم وبیش مغرب کے تمام فلسفی یہی بات کہتے ہیں، ان کے نزدیک انسان ہی الوہیت کا مظہر ہے۔ مثلاً J. H.Homes اپنی کتاب (A struggling God) میں کہتا ہے کہ "خدا انسان ہے اور انسان خدا ہے، دونوں سے مراد وہ زندگی ہے جو محبت کے لیے مصروفِ کشمکش ہے۔"

ایمز کہتا ہے کہ...... خدا کا مخصوص اور قابل رسائی تصور اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسے انسانوں کا وہ اجتماعی ضمیر سمجھ لیا جائے جو معاشرے مین کارفرما اور اس طرح معاشرتی اداروں میں برنگ مجاز جلوہ گر نظر آتا ہے"

فیور باخ خدا کے وجود ہی کا منکر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا صرف انسان کے دل میں ہوتا ہے اس سے باہر اس کا کہیں وجود نہیں۔

کامٹ کا کہنا ہے کہ...... "انسانیت خدا ہے"

مفکرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ خدا نے کائنات کو بنایا اب اس کے بعد وہ اس مشینری کے چلانے میں دخل نہیں دیتا، یہ مشین انسان کے سپرد کر دی گئی ہے، لہٰذا کائنات میں الوہیاتی منصب اب خود انسان کو مل چکا ہے۔

مغربی مفکرین کی ان تعریفات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں کسی ان دیکھی ہستی کا وجود خدا کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کے ہاں انسان ہی ان تمام طاقتوں کا مظہر ہے، جنہیں کوئی بھی مذہب ان دیکھی ہستی کے ساتھ وابستہ تصور کرتا ہے۔ مغرب کا "سپرمین" انہی خدائی طاقتوں کا مظہر ہے۔

[مغرب مذہب اور خدا کو کس طرح خیرباد کہہ چکا ہے اس کا اظہار ڈنمارک کے بدبخت شاتم رسول "فلیمنگ روز" نے ان الفاظ میں کیا تھا:

"ہم میں اور مسلمانوں میں فکری اور ثقافتی یا تہذیبی طور پر فرق یہ ہے کہ ہم نے تو خدا، رسول اور کتاب کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ اپنے ذہنوں سے اتار دیا ہے، ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ بائبل میں کیا لکھا ہے؟ کوئی قانون طے کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے؟ کوئی بات کہتے وقت عیسیٰ کا حوالہ نہیں دیتے کہ اس بارے میں انہوں نے کیا کہا تھا، ہم آزاد ذہن سے فیصلہ کرتے ہیں''

اس مخصوص تصور علم اور تصور انسان کو ہیومن بینگ (Human Being) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس وقت مغرب میں جتنے بھی علوم پائے جاتے ہیں خواہ سائنس ہو یا سوشل سائنس، ان میں یہی فکر اساسی طور پر کارفرما ہے۔

مغربی مفکرین کے مطابق جب انسان ہی کائنات کا محور و مرکز ہے اور وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بغیر کسی خارجی علم کی مدد کے خود پہچان سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی استوار کرسکتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ خواہش نفس کا مطیع ہے۔ انسانی خواہشات کا بنیادی عنصر لذات سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونا ہے، لذات سے بہرہ ور ہونے کے لیے، تمتع فی الدنیا کے لیے ''سرمایہ'' اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ فرد کا سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل میں شریک ہونا لازمی امر ٹھہرتا ہے۔ یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اول درجے کا حریص اور حاسد نہ ہو۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا سرمائے کی بڑھوتری حرص وحسد کو عمومی فروغ دیے بغیر ممکن ہے؟...... تاریخ اس کا انکار کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرے بدترین سطح کی حد تک حریص اور حاسد ہوتے ہیں۔ ہم آئے روز دیکھتے ہیں خصوصاً مغرب میں تو یہ معمول کی بات ہے کہ سرمائے کے حصول کے لیے اخلاقی اور معاشرتی قدریں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ حرص اور حسد دیگر کئی اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کا مجموعہ ہیں۔ حریص اور حاسد انسان خود غرض، سفاک، قاتل، انتہائی درجے کا فریبی اور مکار، اور نہ جانے کیا کچھ ہوسکتا ہے!! جو شخص خود کو ''فری'' خیال کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں اور عبدیت میں رہنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ دراصل نفس و شیطان کا بندہ ہوتا ہے...... اسی معنی میں ہیومن بینگ شیطنت کے مساوی ہے۔ یہی ہیومن رائٹس (Human Rights) کا علمیاتی پس منظر ہے۔

انسانی حقوق کا چارٹر کن لوگوں نے مرتب کیا؟

پچھلی سطور میں مغرب کا جو تصور انسان ذکر کیا گیا اور مغربی مفکرین کے افکار کا خلاصہ پیش کیا گیا، انسانی حقوق کا چارٹر انہی تصورات انسان سے ماخوذ ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ۱۷۷۶ء میں امریکا کا اعلان آزادی سامنے آیا۔ ۱۷۸۸ء میں امریکی دستور ''بل آف رائٹ'' مرتب ہوا۔ امریکی دستور کا ماخذ فیڈرلسٹ پیپرز ہیں۔ فیڈرلسٹ پیپرز وہ مضامین تھے جو دستور کی حمایت میں امریکا کے پہلے وزیر خزانہ الیگزینڈر ہملٹن، امریکا کے پہلے چیف جسٹس جان جے اور امریکی صدر جیمس میڈیسن نے امریکی اخباروں میں لکھے تھے۔

یہ تمام مضامین مغرب کے ملحد مفکرین کے تصورات انسان ہی کی روشنی میں لکھے گئے تھے۔

اقوام متحدہ کا منظور کردہ انسانی حقوق کا منشور اسی امریکی دستور کا چربہ ہے۔ اس منشور کی مصنفہ اس وقت کے امریکی صدر کی بیوی ایلینا روز ویلٹ تھی۔ اقوام متحدہ کے ذریعہ تمام ممبر ممالک کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ انسانی حقوق کے اس منشور کو عالمی اور ناقابل چیلنج قانون تسلیم کرتے ہوئے اس پر دستخط کریں۔ چناں چہ مسلم ممالک بھی یو این او کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس کفر مطلق اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر مبنی منشور پر دستخط کرتے ہیں، وہ پابند ہوتے ہیں کہ اپنے ممالک کے دستور و قانون کو انسانی حقوق کے چارٹر سے ہٹ کر عمل میں نہیں لائیں گے۔

ہیومن رائٹس چارٹر کے بعض اہم مشمولات:

☆ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اس آزاد حیثیت میں ہر فرد دوسرے فرد کے مساوی ہے۔

☆ ہر انسان کو زندگی گزارنے اور معاشرت کو تعمیر کرنے کے لیے جو بنیادی وسائل دیے گئے ہیں، وہ دو ہیں:

(۱) عقل (۲) ضمیر

عقل کی بنیاد پر انسان طبعی معاشرت کی تعمیر کرتا ہے تو ضمیر کی بنیاد پر اپنی اخلاقی معاشرت کی تعمیر کرتا ہے۔

☆ ہر شخص کو ضمیر اور مذہب کی آزادی ہے۔ اسی طرح مذہب کو تبدیل کرنے، اپنے عقائد کا انفرادی یا اجتماعی طور پر اظہار کرنے کی آزادی ہے۔ (چاہے وہ فرد اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہونا چاہے یا یہودی یا عیسائیت قبول کرلے)۔

☆ ہر شخص کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا حق حاصل ہے۔

☆ ہر شخص کو (خواہ مرد ہو یا عورت) ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ طور پر ملنے اور اپنی انجمنیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

☆ ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ کسی بھی میڈیا کے لیے جس قسم کی معلومات جہاں سے چاہے حاصل کرسکتا ہے۔

☆ مرد و عورت (بلاتفریق مذہب و ملت) شادی کرنے کے بعد اسے فسخ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

☆ تمام بچے خواہ شادی سے پہلے ہوں یا بعد میں، معاشرتی تحفظ میں یکساں طور پر مستفید ہوسکتے ہیں۔

☆ انسانی حقوق کے چارٹر کے مطابق غیر انسانی اور وحشی سزاؤں (مراد اسلامی سزائیں) کو کالعدم قرار دے دیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

☆انسانی حقوق کے اس چارٹر میں غلام، لونڈی بنانے رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

☆ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہِ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا اختیار حاصل ہے۔ عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیا ہوگی۔

☆تعلیم کا مقصد، انسانی شخصیت کی پوری نشو و نما ہوگا اور وہ انسانی اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

یہ چند نکات ہم نے بطور نمونہ پیش کر دیے ہیں ورنہ حقوق کی فہرست بہت طویل ہے جس میں ہمہ قسم کی آزادیوں کی لمبی تفصیل ہے۔

انسانی حقوق کا مقصد خدا سے بغاوت ہے:

انسانی حقوق کی اس بحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ حقوق کے ضمن میں تمام فلاسفہ مغرب کا اصل زور آزادی (Freedom) پر ہے۔ فری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر طرح سے آزاد ہے۔ وہ کسی ان دیکھی ہستی کا عبد نہیں، اس کی عقل اس کے لیے واحد اتھارٹی ہے، اس کی عقل ہی فیصلہ کرے گی کہ شر کیا ہے اور خیر کیا ہے؟...... کسی خارجی ذریعے کو یا خارج از عقل ہستی کو خیر و شر کے تعین کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس معنی میں تمام انسان مساوی ہیں کہ ہر فرد اپنی عقلیت کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتا ہے۔ وہ آج مسلمان ہے تو کل عیسائی ہو سکتا ہے، اگر مذہب اس کی خواہشات کی تکمیل میں سدِ راہ ہو تو وہ لامذہب بھی ہو سکتا ہے۔ خواہشات لامحدود ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے سرمایہ وہ بنیادی عنصر ہے جو خواہشات کی تکمیل میں معاون ہو سکتا ہے، لہٰذا سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری اس کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے اور یہ بڑھوتری حرص و حسد کی عمومیت کے بغیر ممکن نہیں۔

اوپر ذکر کردہ فکر کا پیکر ہی 'نیو مین' ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے فلسفے کے نتیجے میں خلق جدید کے نتیجے (New Man) کا ظہور ہوا تھا، کیوں کہ اس سے قبل کا انسان عہد ظلمات (Dark ages) کا آدمی تھا۔ تحریک تنویر (Enlightenment) کے نتیجے میں انسان نے گویا اپنا اصل مقام پہچانا تھا۔ چناں چہ اب وہ روشن خیال، لبرل، آزادی و مساوات پر اور جمہوریت پر یقین رکھنے والا انسان تھا۔ اب وہ خیر و شر کے تعین کے لیے کسی خارجی ذریعے کا محتاج نہیں تھا، بلکہ اس کی عقل ہی اس کے تمام امور زندگی کے لیے میزان تھی۔ جو چیز ریزن ایبل نہیں تھی، وہ ردی کی ٹوکری کے برابر بھی نہیں تھی۔

نطشے نے کہا تھا 'خدا مر گیا ہے' فوکالٹ نے کہا کہ انسان بھی مر گیا ہے۔ یہ مرنے والا انسان وہی تھا جو عہد ظلمات میں جی رہا تھا۔ مشل فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔ اس لیے حضور! یہ بات

جانئے کہ اہلِ مغرب کے نزدیک وہ فرد انسان ہی نہیں جو آزادی، مساوات، جمہوریت پر یقین نہیں رکھتا اور جواب بھی وحی پر یقین رکھتا ہے، رسولوں کی رسالت پر، آخرت پر اور قیامت پر یقین رکھتا ہے۔

انسانی حقوق کے نفاذ کے لیے استعماری جبر:

یو این ڈی پی کی ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 2000ء میں ہیومن رائٹس کے فروغ کے لیے تین اہم خطوط متعین کیے گئے۔ UNDP کی رپورٹ میں جن ترجیحات کا تعین کیا گیا وہ حسب ذیل تھیں:

۱۔ تیسری دنیا کے ممالک بین الاقوامی قوانین کی ملکی قوانین پر بالادستی تسلیم کر لیں جو ہیومن رائٹس سے متعلق سول لبرٹیز کو عالمی سطح پر نافذ کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

۲۔ قومی ریاستوں کا دستوری ڈھانچہ ان بین الاقوامی قوانین اور عدالتی تنظیموں کے ماتحت کر دیا جائے، جو سرمایہ دارانہ نظام کی عالمگیریت کے تحفظ کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

۳۔ معاشرتی سطح پر اغراض کی بنیاد پر ایسی گروہ بندیاں قائم کی جائیں جو حقوق کی سیاست کو فروغ دیں اور قومی ریاستوں کے عالمی سرمایہ کے ماتحت ہو جانے کے عمل کی تائید کریں اور اس کا جواز عوامی سطح پر پیش کریں۔

اسی رپورٹ کے آغاز میں اس وقت کے یو این او کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ جو ملک بھی حقوق انسانی کے ماورا قانون سازی کرے اس کے خلاف اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل فوجی کارروائی کرے۔ کوفی عنان نے لکھا تھا:

"کسی حکومت کو حق نہیں کہ وہ قومی خود مختاری کو آڑ بنا کر ہیومن رائٹس سے انکار کرے۔ سوڈان اور افغانستان کے مظلوم عوام کا حق ہے کہ ہم ان پر ہونے والے ظلم کو ختم کریں اور ان ممالک کو ترقی کی راہ پر لائیں۔ ہم ان ممالک میں فوجی مداخلت کریں کیوں کہ یہ مداخلت ہیومن رائٹس کے عالمگیر طور پر تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق ہوگی۔"

(UNDP. Human Development Report 2000 P 31)

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حقوق انسانی کا منشور عالمی سطح پر تسلیم شدہ واحد "الحق" ہے، جسے تسلیم کیا جانا اور ریاستی معاملات کو انسانی حقوق کے مطابق استوار کرنا لازم ہے۔ جو ریاستیں انسانی حقوق کے طے شدہ منشور کے علی الرغم "الحق" کو رائج کرنے کی کوشش کریں ان پر فوج کشی ضروری ہے۔

مثلاً افغانستان میں طالبان عالی شان نے شریعت اسلامیہ کا نفاذ کیا اور افغانستان کو امارت اسلامی قرار دیا تو امریکا نے نیٹو افواج کے ہمراہ افغانستان پر حملہ کر دیا۔ تب بش نے کہا تھا کہ وہ افغانستان کے باشندوں کو آزادی دلانے اور جمہوریت رائج کرنے آیا ہے۔ یہ آزادی وہی تھی جس کا دعویٰ ہیومن رائٹس میں کیا گیا ہے اور جمہوریت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کوشریعت کے متبادل جگہ دی گئی ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیمیں:

منشور انسانی حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ استعماری ریاستوں کی سرپرستی میں سینکڑوں این جی اوز دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک میں کام کرتی ہیں اور قومی معاشروں میں اس بات کا جائزہ لیتی ہیں کہ حکومتیں، ریاستی ادارے، سیاسی جماعتیں انسانی حقوق کی پاس داری کر رہی ہیں کہ نہیں؟ یہ غیر ریاستی تنظیمیں منشور انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر رپورٹیں شائع کرتی ہیں، احتجاجی مظاہرے ترتیب دیتی ہیں، مختلف ذرائع سے حکومتوں پر دباؤ ڈالتی ہیں تا کہ منشور انسانی حقوق کی مکمل پاس داری ہو سکے۔ ان تنظیموں کے طریق کار، اہداف، حکمت عملی سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ ان کا کوئی تعلق معاشرتی وحدت، مذہب کی بالا دستی، شرعی قوانین کی پاس داری سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ مذہبی معاشرے کے انہدام اور سرمایہ داری کو مستحکم کرنے کا سبب ہوتی ہیں۔ یہ این جی اوز جب صاف پانی کی فراہمی کو اپنا ایشو بناتی ہیں تو بین السطور ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ منرل واٹر کی بوتلیں خرید کر پانی پییں تا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سرمائے میں اضافہ ہو سکے۔ یہ این جی اوز جب کسی بیماری کو ایشو بناتی ہیں تو اس کا ذکر اس طور پر کیا جاتا ہے کہ لوگ شدید خوف زدہ ہو جائیں تا کہ اس بیماری کی ادویات کی فروخت میں اضافہ ہو سکے، اسی طرح یہ تنظیمیں انصاف کی فراہمی کو ایشو بناتی ہیں تو عمومی طور پر ایسے زنا کار جوڑوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو اپنے مذہب، والدین اور معاشرے سے بغاوت کر کے سرمایہ داری کی محافظ عدالتوں کا رخ کرتے ہیں۔ مذہب دشمنی ان کی سرشت میں ہوتی ہے، اسی لیے یہ مختاراں مائی کے لیے تو جان و دل سے تگ و دو کرتی ہیں مگر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے لیے کبھی کلمۂ حق کہنے کو تیار نہیں ہوتیں۔ یہ این جی اوز جب غیر اسلامی فرقوں کے تحفظ کی بات کرتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلم معاشروں میں ارتداد کی کھلی اجازت ہونی چاہیے......کوئی مسلمان قادیانی ہونا چاہے یا عیسائی یا لبرل بننا چاہے تو اس میں مذہب کو مزاحم نہیں ہونا چاہیے۔

خلاصۂ کلام:

انسانی حقوق کا چارٹر اور اس کے پس منظر میں کارفرما پورا فلسفۂ مغرب کسی خیر کا منبع نہیں بلکہ شر و فساد کا محور ہے۔ اصولاً حقوقِ انسانی:

☆ کتاب اللہ کا رد ہیں۔ ☆ ربوبیت کا انکار ہیں۔

☆ سرمایہ داری کو مستحکم کرنے کے بنیادی اصول ہیں۔ ☆ انسان کو خدا بنانے کا ذریعہ ہیں۔

جن معاشروں میں انسانی حقوق کو پریکٹس کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرے حریص و حاسد، سفاکی کی حد تک خود غرض، شہوت پرست، قاتل اور غاصب ہو جاتے ہیں۔ ہر فرد محض اپنی ذات میں سمٹ جاتا ہے اور معاشرتی اکائیاں مثلاً خاندان وغیرہ بکھر جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بلا کسی تامل کے انسانی حقوق کے چارٹر کو اسی طرح کفرِ خالص تسلیم کرتے ہیں جس طرح سکھوں کی گرنتھ، ہندوؤں کی وید کو...... اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم عظیم قرار فرمایا ہے اور مشرک کو کسی صورت معاف نہ فرمانے کا اعلان کیا ہے۔ مشرک وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں اس کے غیر کو شریک ٹھہرائے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہوتا ہے مگر شرک کی آلودگی کے ساتھ جب کہ انسانی حقوق کے فلسفے میں معاملہ جدا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واجب الوجود کا ہی سرے سے انکار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ انسانی حقوق اور انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کو بالکلیہ رد کر دینا ہمارے ایمان کا عملی تقاضا ہے۔ ہماری دینی تحریکات کے کارکنان کے لیے لازم ہے کہ فلسفۂ حقوق سے کلی برأت کا اعلان کریں۔

[نوٹ: ہمارا یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا دوسرے حصے میں فلسفۂ انسانی حقوق کا قرآن و حدیث کی روشنی میں تجزیہ و محاکمہ ہے جو ان شاء اللہ تکمیل کے بعد علیحدہ کتابچے کی صورت میں دستیاب ہوگا۔]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظہور انسان - ادارہ اجتماعی - معاشرہ عمرانی

انفرادی آزادی - جمہوریت

رائے دہندگی - نمائندگی - بیوروکریسی - معاشرتی تفاوت

عمل اور نظریہ میں تضاد

جمہوریت اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

جاوید اقبال تاب

تعارف:

اس مضمون میں ہم نے جمہوری نظام اس کی مابعد الطبیعات، اخلاقیات، اداروں اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آغاز یونان سے کیا گیا ہے جو مغربی تہذیب کا اولین گہوارہ تھا۔ بتایا گیا ہے کہ یونانی مفکرین (افلاطون، ارسطو) جمہوریت کو کن بنیادوں پر رد کرتے تھے۔ ان کے بعد کلاسیکی مفکرین کا ذکر ہے جس میں ہم نے (جان اسٹورات مل اور روسو) کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ مفکرین کن بنیادوں پر جمہوریت کا اثبات کرتے ہیں۔ بنیادی جمہوری اداروں (رائے دہندگی، نمائندگی، بیوروکریسی) وغیرہ کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ادارے انسان کے نفس میں کس قسم کے تغیر کا باعث بنتے ہیں۔ جمہوری عمل اور کلاسیکی مفکرین کے نظریہ میں تضاد کو واضح کرتے ہوئے، اثباتی سیاسی مفکرین کے فکر کا جائزہ لیا ہے۔ آخر میں ایک عمومی اسلامی تنقید پر یہ بحث ختم ہوئی ہے۔

جمہوریت اور یونان:

جمہوریت کے بارے میں ہمیں مغربی تہذیب میں سب سے پہلی بحث یونانیوں کے یہاں ملتی ہے۔ یونانی مفکرین افلاطون وارسطو جمہوریت کے خلاف تھے۔ وہ جمہوریت کو جن بنیادوں پر رد کرتے تھے وہ یہ تھیں کہ جمہوری آدرشیں ان مستقل اقدار سے لگا نہیں کھاتیں جو انہوں نے اپنے فلسفوں میں متعین کی تھیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں مثلاً افلاطون نے نظریہ امثال (Theory of forms) کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ عالم بالا میں ایسی اشیاء اور حقائق پائے جاتے ہیں (جن کو وہ Forms کہتا ہے) جو غیر متبدل اور اصل الحقائق ہیں اور دنیا میں ہمیں نظر آنے والی اشیاء ان اصل حقائق کا مدہم سا عکس ہیں۔ یہ اصل حقائق ہیں جن تک رسائی حاصل کر کے فلسفی فطرت کی تہہ تک پہنچتا ہے اور جہل کے پردے ہٹ جاتے ہیں، وہ حقائق اشیاء کو جس طرح سے کہ وہ ہیں دیکھ سکتا ہے۔ ان اصل حقائق تک ہر شخص نہیں پہنچ سکتا ہے بلکہ جو افراد ایک خاص قسم کی صلاحیت کو پروان چڑھا

سکتے ہیں اور ایک خاص قسم کی صلاحیت بہم پہنچا سکتے ہیں وہی ان حقائق تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ افلاطون کی اس مابعد الطبیعات اور نظریہ علم کا اس کے نظریہ اخلاق پر گہرا اور لازمی اثر پڑا۔ مثلاً عدل کیا ہے؟ اس کے جاننے کے لیے ہمیں عدل کی (Form) جو عالم بالا میں موجود ہے اور جو مکمل اور غیر متبدل ہے اس تک رسائی حاصل کرنا ہوگی اور اسی کے مطابق پھر ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس دنیا میں پائی جانے والی اشیاء یا ہونے والے عمل میں عدل کا عنصر کتنا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ہے بلکہ فلسفی ہی یہ کام انجام دے سکتا ہے اسی لیے افلاطون اپنی ریاست کی زمام کار فلسفیوں کے ہاتھ میں تھمانے کی بات کرتا ہے جو انسانیت کو غیر متبدل اور کلی اقدار کے مطابق گامزن منزل کریں گے۔ اسی سے ہم کچھ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ افلاطون جمہوریت کو کن بنیادوں پر رد کرتا ہے۔ چونکہ جمہوریت عام آدمی کے اقتدار کا نام ہے اور وہ اصل حقائق تک رسائی نہیں رکھتا بلکہ اکثر اپنی خواہشات کی بنیاد پر فیصلے کرتا ہے اس لیے لازماً جمہوریت میں اخلاقیات اور اقدار کا زوال ہے اور بالآخر وہ تباہ ہو کر رہ جاتی ہیں اسی طرح چونکہ حکمران ہر دم بدلتی عوامی رائے کے سامنے بے بس ہوتے ہیں اور اس کو اپنے فیصلے میں جگہ دینے کے پابند ہوتے ہیں اس لیے آہستہ آہستہ وہ بھی اقدار کی جگہ ذاتی اور عوامی خواہشات کو جگہ دینا شروع کر دیتے ہیں اور یوں سیاست جادہ حق سے ہٹ جاتی ہے۔

ارسطو جمہوریت کو رد کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کرتا ہے:

١۔ ارسطو کے خیال میں اکثریت قطعی فیصلے کے معاملے میں گومگو رہتی ہے اس لیے عدل اجتماعی کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔

٢۔ سیاسی طور پر جمہوریت عدم استحکام کو جنم دیتی ہے

٣۔ جمہوریت کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔

٤۔ اکثریت پرستی اور عمومی بے راہ روی کو فروغ ہوتا ہے

٥۔ چند افراد کا اقتدار پر قابض ہونا۔

٦۔ حقیر لذات کی جستجو کو فروغ ملتا ہے۔

٧۔ حقیقی اخلاقی اور اجتماعی مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یونانی مفکرین اخلاقی اور اقداری بنیادوں پر جمہوریت کو رد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جمہوریت کے نتیجے میں جو کردار فروغ پاتا ہے وہ وہ کردار ہے جو کردار مطلوب نہیں ہے، یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان مفکرین کے یہاں مستقل اور غیر متغیر آدرشوں کا اثبات ہے جو ان کی مابعد الطبیعات نظریہ علم اور اخلاقیات سے متعین ہوتی ہے۔ جمہوریت کو اس بحث میں اس اہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکتہ کو ایک اہم موڑ پر پھر اٹھائیں گے۔

کلاسیکی مفکرین:

جمہوریت کے ضمن میں یونانی مفکرین کے بعد ان مفکرین کا تذکرہ آتا ہے جنہیں ہم کلاسیکی مفکرین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جن میں سے ہم روسو اور مل کو لیں گے۔ یہ کلاسیکی مفکرین یونانی مفکرین کے ساتھ ایک لحاظ سے مماثلت رکھتے ہیں اور ایک لحاظ سے ان کی رائے یونانی مفکرین کے بالکل برعکس ہے۔ مماثلت اس امر میں ہے کہ یونانی اور کلاسیکی مفکرین جمہوریت پر بحث اور گفتگو کو اخلاقی، اقداری مباحث کے سیاق وسباق میں کرتے ہیں جبکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یونانی کہتے تھے کہ جمہوریت جو کردار پیدا کرتی ہے اس میں مطلوب خصوصیات عنقا ہوتی ہیں، جبکہ کلاسیکی مفکرین کہتے ہیں کہ جمہوریت کے ذریعہ سے مطلوب اقداری تبدیلیاں اور مطلوب کردار پیدا ہو سکتا ہے۔

سیاسی تصورات کی بنیاد انسان کے نفس کے بارے میں تصورات اور معاشرے کے بارے میں تصورات نیز مقصد زندگی کے بارے میں تصورات ہوتے ہیں۔ کسی بھی مفکر کے سیاسی نظریہ کو سمجھنے کے لیے اس کے تصور انسان اور معاشرہ کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

روسو کے نزدیک انسان بنیادی طور پر خیر کی طرف مائل ہے اور اگر وہ اپنے دل کی صاف وشفاف روشنی کا اتباع کرے تو وہ جادہ حق سے ہٹ نہیں سکتا۔ روسو کی ''فطری حالت'' جو اس کے ideal فرد کی تصویر ہے، میں انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری خود اس کی اپنی ذات ہے، وہ جبلت اور فطری روشنی کی رہنمائی میں چلتا ہے، عقل و دلیل سے اسے کوئی خاص غرض نہیں ہے بلکہ وہ دل اور جبلت سے رہنمائی لیتا ہے اور اس کی تصویر Enlightenment کے Sophisticated شخص کی نہیں ہے بلکہ وہ سادہ اور جنگلی (Noblesarage) ٹائپ کا شخص ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ تہذیب وتمدن اور علم وعقل کی فراوانی اس شخص کو Corrupt کر دیتی ہے اور وہ اپنی اس سادگی اور جبلی زندگی سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ اب اس فطری حالت کو جوں کا توں دوبارہ حاصل کرنا تو ناممکن ہے لیکن اس کی جتنی بھی زیادہ سے زیادہ مشابہت حاصل کرنے کے امکانات ہیں وہ بروئے کار لانے چاہئیں۔ روسو اس کا جو طریقہ بتاتا ہے وہ مغربی طرز فکر میں رومانوی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے جس کے مطابق انسان کو اپنی آزادی کے حصول اور حالت فطری کی صاف وشفاف زندگی کی ممکنہ مطابقت کے لیے اپنے آپ کو ایک برتر ہستی جس کو وہ ارادہ اجتماعی کہتا ہے میں ضم کر دینا چاہیے۔ اس انضمام کے نتیجہ میں وہ اپنی اصلی شخصیت کو کسی نہ کسی حد تک دوبارہ پا سکتا ہے ور اسی صورت میں حقیقی معنوں میں آزاد اور اپنی ہستی کا تشکیل کنندہ قرار پا سکتا ہے۔ روسو کے ارادہ اجتماعی کی مندرجہ ذیل خصوصیات

سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ ارادہ اجتماعی مستقل ہے۔

۲۔ یہ ارادہ اجتماعی غیر متبدل ہے۔

۳۔ یہ ارادہ خالص ہے۔

۴۔ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ اس ارادہ اجتماعی کے اتباع کے نتیجہ میں انسان اپنی اصل فطرت کے قریب ہو جاتا ہے اور حقیقی معنوں میں آزاد اور اپنی تقدیر کو آپ متعین کرنے والا بن سکتا ہے۔ (بحیثیت انسان)

روسو کے مطابق معاشرہ کی تنظیم کی بنیاد معاہدہ عمرانی ہے۔ معاہدہ عمرانی میں داخل ہونے کا مقصد ارادہ اجتماعی کی آگاہی اور اس کا اتباع اور اس کے نتیجہ میں انسان کا بحیثیت انسان آزاد ہوتا ہے۔ روسو چھوٹی ریاستوں میں ارادہ اجتماعی کے اظہار کا ذریعہ جمہوریت کو بتاتا ہے اور وہ اس کا ideal بھی ہے۔ وہ ارادہ اجتماعی اور اکثریت کی رائے میں فرق کرتا ہے۔ وہ ایک مثال قانون ساز کا قائل نظر آتا ہے جو لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ ارادہ اجتماعی اس وقت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی دیتا ہے۔ لیکن روسو جمہوریت کو ارادہ اجتماعی کے اظہار کا ناگزیر طریقہ نہیں بتاتا ہے اور وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ بادشاہت اور طبقہ علیا کی حکومت کے ذریعہ بھی اجتماعی ارادہ کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن اس کا آئیڈیل بہر حال جمہوریت ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے بغیر بالآخر ریاست چل نہ سکے گی اور عوام انتشار اور تفرقہ کا شکار ہو جائیں گے۔ اس مختصر تجزیے کے مطابق مندرجہ ذیل نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۔ روسو انسان کی علیحدگی، الوہیت اور آزادی کا قائل ہے۔

۲۔ حقیقی آزادی کا حصول ارادہ اجتماعی کے اتباع سے ممکن ہے۔

۳۔ ارادہ اجتماعی کا اظہار مثالی مقنن پر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں مثالی مقنن کی نشو ونما کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔

جان اسٹوراٹ مل برطانیہ کی مشہور سیاسی، معاشی، فلسفیانہ تحریک ''افادیت'' (utilitarianism) سے تعلق رکھتا ہے جس نے افادی نقطہ نظر کو ایک خاص نوع سے ترقی دی اور اس کو حقوق کے خاص تصورات کے ساتھ منسلک کیا نیز انسان کا ایک خاص تصور پیش کیا ہے۔

مل کے تصور انسان کی بحث کا سراغ افادی فلسفہ کی مشہور بحث کے ساتھ منسلک ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ افادیت (utilitarianism) انسان کا ہدف ''لذت'' کے زیاہ سے زیادہ حصول کو قرار دیتی ہے۔ اب اس فلسفہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکتہ کو ایک اہم موڑ پر پھر اٹھائیں گے۔

کلاسیکی مفکرین:

(یونانی اور کلاسیکل مفکرین کا اتفاق و اختلاف)

جمہوریت کے ضمن میں یونانی مفکرین کے بعد ان مفکرین کا تذکرہ آتا ہے جنہیں ہم کلاسیکی مفکرین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جن میں سے ہم روسو اور مل کو لیں گے۔ یہ کلاسیکی مفکرین یونانی مفکرین کے ساتھ ایک لحاظ سے مماثلت رکھتے ہیں اور ایک لحاظ سے ان کی رائے یونانی مفکرین کے بالکل برعکس ہے۔ مماثلت اس امر میں ہے کہ یونانی اور کلاسیکی مفکرین جمہوریت پر بحث اور گفتگو کو اخلاقی، اقداری مباحث کے سیاق وسباق میں کرتے ہیں جبکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یونانی کہتے تھے کہ جمہوریت جو کردار پیدا کرتی ہے اس میں مطلوب خصوصیات عنقا ہوتی ہیں، جبکہ کلاسیکی مفکرین کہتے ہیں کہ جمہوریت کے ذریعہ سے مطلوب اقداری تبدیلیاں اور مطلوب کردار پیدا ہوسکتا ہے۔

کسی سیاسی تصورات کی بنیاد انسان کے نفس کے بارے میں تصورات اور معاشرے کے بارے میں تصورات نیز مقصد زندگی کے بارے میں تصورات ہوتے ہیں۔ کسی بھی مفکر کے سیاسی نظریہ کو سمجھنے کے لیے اس کے تصور انسان اور معاشرہ کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

روسو کے نزدیک انسان بنیادی طور پر خیر کی طرف مائل ہے اور اگر وہ اپنے دل کی صاف وشفاف روشنی کا اتباع کرے تو وہ جادہ حق سے ہٹ نہیں سکتا۔ روسو کی ''فطری حالت'' جو اس کے ideal فرد کی تصویر ہے، میں انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری خود اس کی اپنی ذات ہے، وہ جبلت اور فطری روشنی کی رہنمائی میں چلتا ہے، عقل و دلیل سے اسے کوئی خاص غرض نہیں ہے بلکہ وہ دل اور جبلت سے رہنمائی لیتا ہے اور اس کی تصویر Enlightenment کے Sophisticated شخص کی نہیں ہے بلکہ وہ سادہ اور وحشی (Noblesarage) ٹائپ کا شخص ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ تہذیب وتمدن اور علم وعقل کی فراوانی اس شخص کو Corrupt کر دیتی ہے اور وہ اپنی اس سادگی اور جبلی زندگی سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ اب اس فطری حالت کو جوں کا توں دوبارہ حاصل کرنا تو ناممکن ہے لیکن اس کی جتنی بھی زیادہ سے زیادہ مشابہت حاصل کرنے کے امکانات ہیں وہ بروئے کار لانے چاہئیں۔ روسو اس کا جو طریقہ بتاتا ہے وہ مغربی طرز فکر میں رومانوی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے جس کے مطابق انسان کو اپنی آزادی کے حصول اور حالت فطری کی صاف وشفاف زندگی کی ممکنہ مطابقت کے لیے اپنے آپ کو ایک برتر ہستی جس کو وہ ارادہ اجتماعی کہتا ہے میں ضم کر دینا چاہیے۔ اسی انضمام کے نتیجہ میں وہ اپنی اصلی شخصیت کو کسی نہ کسی حد تک دوبارہ پا سکتا ہے اور اسی صورت میں حقیقی معنوں میں آزاد اور اپنی ہستی کا تشکیل کنندہ قرار پا سکتا ہے۔ روسو کے ارادہ اجتماعی کی مندرجہ ذیل خصوصیات

سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ ارادہ اجتماعی مستقل ہے۔

۲۔ یہ ارادہ اجتماعی غیر متبدل ہے۔

۳۔ یہ ارادہ خالص ہے۔

۴۔ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ اس ارادہ اجتماعی کے اتباع کے نتیجہ میں انسان اپنی اصل فطرت کے قریب ہو جاتا ہے اور حقیقی معنوں میں آزاد اور اپنی تقدیر کو آپ متعین کرنے والا بن سکتا ہے۔ (بحیثیت انسان)

روسو کے مطابق معاشرہ کی تنظیم کی بنیاد معاہدہ عمرانی ہے۔ معاہدہ عمرانی میں داخل ہونے کا مقصد ارادہ اجتماعی کی آگاہی اور اس کا اتباع اور اس کے نتیجہ میں انسان کا بحیثیت انسان آزاد ہونا ہے۔ روسو چھوٹی ریاستوں میں ارادہ اجتماعی کے اظہار کا ذریعہ جمہوریت کو بتاتا ہے اور وہ اس کا ideal بھی ہے۔ وہ ارادہ اجتماعی اور اکثریت کی رائے میں فرق کرتا ہے۔ وہ ایک مثالی قانون ساز کا قائل نظر آتا ہے جو لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ ارادہ اجتماعی اس وقت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی دیتا ہے۔ لیکن روسو جمہوریت کو ارادہ اجتماعی کے اظہار کا ناگزیر طریقہ نہیں بتاتا ہے اور وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ بادشاہت اور طبقہ علیا کی حکومت کے ذریعہ بھی اجتماعی ارادہ کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن اس کا آئیڈیل بہرحال جمہوریت ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے بغیر بالآخر ریاست چل نہ سکے گی اور عوام انتشار اور تفرقہ کا شکار ہو جائیں گے۔ اس مختصر تجزیے کے مطابق مندرجہ ذیل نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۔ روسو انسان کی علیحدگی، الوہیت اور آزادی کا قائل ہے۔

۲۔ حقیقی آزادی کا حصول ارادہ اجتماعی کے اتباع سے ممکن ہے۔

۳۔ ارادہ اجتماعی کا اظہار مثالی مقنن پر ہوتا ہے جمہوریت میں مثالی مقنن کی نشوونما کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مل برطانیہ کی مشہور سیاسی، معاشی، فلسفیانہ تحریک ''افادیت'' (utilitarianism) سے تعلق رکھتا ہے جس نے افادی نقطہ نظر کو ایک خاص نوع سے ترقی دی اور اس کو حقوق کے خاص تصورات کے ساتھ منسلک کیا نیز انسان کا ایک خاص تصور پیش کیا ہے۔

مل کے تصور انسان کی بحث کا سراغ افادی فلسفہ کی مشہور بحث کے ساتھ منسلک ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ افادیت (utilitarianism) انسان کا ہدف ''لذت'' کے زیادہ سے زیادہ حصول کو قرار دیتی ہے۔ اب اس فلسفہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اندرونی منطق کے مطابق مختلف قسم کی لذات میں جو فرق کیا جاسکتا ہے کہ وہ مقدار اور شدت کے لحاظ سے ہی ہوسکتا ہے۔یعنی اس فلسفہ کے مطابق دو مختلف لذتوں میں کیفیت کے اعتبار سے فرق نہیں ہوتا یا نہیں کیا جاسکتا۔یہ کلاسیکی افادی نقطہ نظر ہے جس کے حامی بینتھم اور جیمس مل ہیں۔

جان اسٹوراٹ مل نے جو اسی سلسلہ فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے اس بات کو محسوس کیا کہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ لذات کے درمیان کیفیاتی فرق پایا جاتا ہے۔مثلاً موسیقی سے حاصل شدہ لذت کو شراب سے حاصل کردہ لذت کے مقابلے میں مغرب میں عام طور پر کیفیت میں ارفع سمجھا جاتا ہے۔لیکن جان مل نے مختلف لذات میں جو کیفیاتی فرق کیا اس کی کلاسیکی افادی نقطہ نظر سے توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی اس لیے مل کو اس توجیہ کے لیے دوسرے ذرائع سے رجوع کرنا پڑا۔اور اس میں خاص طور پر اس کا تصور انسان شامل ہے، گو کہ اس کی کتابوں میں اس کا واضح اظہار اور اقرار نہیں ملتا کہ اس نے لذات میں کیفیاتی فرق کے لیے افادی نقطہ نظر سے ہٹ کر کوئی کسوٹی قائم کی ہے۔

آیئے اس تمہید کے بعد یہ دیکھیں کہ جان اسٹوراٹ مل کا تصور انسان کیا ہے۔اس بات کی دلیل کے لیے جان مل نے لذت کے درمیان کیفیتی فرق کے لیے افادی نقطہ نظر کے علاوہ اور کسی کسوٹی کو اپنا لیا ہے اس کا مشہور جملہ کافی ہے۔جس میں وہ کہتا ہے کہ:

''غیر مطمئن انسان مطمئن سور سے بہتر ہے اور یہ کہ غیر مطمئن سقراط مطمئن ابلہ سے بہتر ہے۔اسی طرح وہ بینتھم پر تنقید کرتے ہوئے اس کے ناقص تصور انسان کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے۔

جان مل کا تصور انسان ارسطو سے ماخوذ ہے۔وہ کہتا ہے کہ ''انسان کا مقصود یہ ہے کہ اس کی مختلف قوتوں اور استعداد کی مجموعی اور ہم آہنگانہ ترقی ہوسکے۔'' اس کی مختلف تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی ترقی اور اس کی اصلاح کو بہت اہمیت دیتا ہے اور فرد کی انفرادیت پر وہ خاص توجہ مبذول کرواتا ہے۔مندرجہ بالا ارشارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مل کا تصور انسان انفرادیت کے اثبات اور اس کی قوتوں کی ہم آہنگانہ تربیت و ترقی کو محیط ہے۔

اس کے بعد مل کے معاشرتی تصورات پر نظر ڈالنی چاہیے۔افادی فلسفہ میں جیسا کہ معلوم ہو کہ معاہدہ عمرانی کا انکار کیا جاتا ہے اور معاشرے کی بنیاد افادیت کے نقطہ نظر پر رکھی جاتی ہے۔کلاسیکی افادی فلسفہ میں صرف افادیت ہی معاشرے کی بنیاد ہے پر نیز کلاسیکی افادی فلسفہ حقوق کی بحث کو فضولیات کہہ کر رد کر دیتا ہے۔لیکن جان مل نے کلاسیکی افادی فلسفہ میں جو اہم اضافے کیے ہیں اس میں انفرادی آزادی اور حقوق پر بطور خاص زور دینا شامل ہے۔وہ کہتا ہے کہ اگر ہم انفرادی آزادی اور حقوق کو تحفظ فراہم نہیں کریں گے تو افادیت (Utility) کا

ضامن نظام بالآخر محفوظ نہیں رہ سکے گا اور تہس نہس ہوجائے گا۔جب افادیت کا محافظ نظام ہی تہس نہس ہوجائے گا تو مفاد عامہ کا تذکرہ چہ معنی دارد؟ جان مل نے اپنی کتابوں ''آزادی'' اور ''افادیت'' میں اس بحث کو خاص طور پر لیا ہے اور اہم نکات کی وضاحت کی ہے۔اس کے خیال میں مفاد عامہ کا تقاضہ ہے کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے چاہیے اکثریت کو فرد کے بارے میں فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں، اس لیے اسے اپنے نظریات خیر و شر کسی شخص پر تھوپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے وہ آزادی نامی کتاب میں لکھتا ہے:

''معاشرہ کو فرد کی آزادی میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرنی چاہیے جب تک کسی فرد یا معاشرہ کے مفادات کو لامحدود اور معین خطرہ لاحق نہ ہو۔''

آزادی کے بارے میں مل کی یہ بحث مل کے حکومت کے بارے میں نقطہ نظر کو متعین کرنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔مل جمہوریت کو بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ہر معاشرے کے لیے جمہوریت قابل عمل طرز حکومت نہیں ہے بلکہ وہ معاشروں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

مہذب معاشرے اور غیر مہذب معاشرے۔مہذب معاشرے وہ معاشرے ہیں جو آزادی اور حقوق کے تصورات کو قبول کر کے ان اقدار کو اپنی تہذیب و ثقافت کا حصہ بنا لیتے ہیں جبکہ غیر مہذب معاشرے وہ معاشرے ہیں جو مغربی تہذیب و ثقافت و آزادی و مساوات سے ناآشنا اور معاند ہیں۔ایسے معاشروں میں جمہوریت اس وقت تک قابل عمل نہیں جب تک تعلیم اور دیگر ذرائع سے ان معاشروں کو مہذب معاشروں کی سطح پر نہ پہنچا دیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ خود جمہوری عمل میں شرکت کے نتیجہ میں جمہوری اقدار کو فروغ حاصل ہوتا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔شہری اوصاف کا فروغ۔

۲۔اپنی ذاتی زندگی کو پبلک زندگی کے ماتحت لانا۔

۳۔ہر انسان اپنا حکمراں خود ہوگا۔

ان اوصاف کے فروغ کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔سیاسی تربیت

۲۔مساوات

مل نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ جدید معاشرہ مساوات کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔مل یہ بھی کہتا ہے کہ جمہوریت راست (Direct Participatory democerey) صرف چھوٹے قصبوں اور شہروں کے لیے ہی قابل عمل ہے اس لیے بڑے علاقوں میں نمائندگی (represention) کی بنیاد پر جمہوری عمل کو چلایا جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن جمہوریت کے بارے میں ان خیالات کے ساتھ وہ اس بارے میں خدشات بھی رکھتا ہے مثلاً اکثریت کی آمریت کے خطرہ کے سدباب کے لیے اور اقلیت کے مفادات کے تحفظ کے لیے تناسب نمایندگی کا تصور دیتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تعلیم کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیتا ہے جس کے ذریعہ انفرادی آزادی کے تصور کو ہر فرد کے ذہن میں راسخ کردیا جائے اور اس سلسلہ میں مذہب، نسل اور دوسرے تعصبات کو راہ نہ دی جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ مل فلاح عامہ کے تصور اور فلاحی ریاست کے تصور کو بطور خاص جگہ دیتا ہے اور اس سلسلہ میں ریاست کے محدود کنٹرول کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ دراصل مل کے نزدیک آزادی کا مفہوم صرف بیرونی موانع سے آزادی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس نے آزادی کو اس حیثیت سے بھی اہم سمجھا کہ وہ انسان کی بحیثیت انسان ہم آہنگانہ ترقی کے لیے بھی ضروری اور لازمی ہے اور یہ مفاد عامہ کا تقاضا بھی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ مل کے نزدیک یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ انسان کی زیادہ سے زیادہ ترقی کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرے۔

اس تمام بحث سے مندرجہ ذیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔

روسو اور مل کے نظریات کی تشریح سے بات یہ واضح ہوجاتی ہے کہ جمہوریت محض ایک سیاسی آلہ (Pcolitical Instrument) نہیں بلکہ ایک مکمل نظام زندگی کے نفاذ کا طریقہ ہے۔ یہ نظام لبرلزم ہے اور تاریخ نے ثابت کردیا کہ جمہوریت کے ذریعہ صرف ایک لبرل معاشرہ اور لبرل ریاست ہی قائم ہوسکتی ہے۔ کوئی دوسرا نظام جمہوریت کی بنیاد پر نہ قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ قائم رکھا جاسکتا ہے۔

لبرلزم ایک مکمل تہذیب ہے اس کا بنیادی عقیدہ انسان پرستی ہے۔ اس عقیدہ کے فروغ کے لیے وہ جس اخلاقیات کی تعلیم دیتی ہے اس کی مرکزی اقدار آزادی اور مساوات ہیں۔ وہ ایسا انسانی کردار تعمیر کرنا چاہتی ہے جو اپنی خواہشات کی تکمیل کو ذات کی ارتقاء کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ لبرلزم کا قائل فرد اپنے آپ کو دنیا میں تنہا سمجھتا ہے اور اپنی خواہشات کو جانچنے کے لیے خود کو خیر اور شر کے پیمانے وضع کرنے کا مکلّف سمجھتا ہے وہ ہر دوسرے انسان کی یہی حیثیت تسلیم کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے خیر اور شر کے پیمانے پر متعین کرے اور اپنی خواہشات کی جس طرح چاہے تسکین حاصل کرے۔ لبرل معاشرہ ایسے تنہا اور خود کفیل افراد کا مجموعہ ہیں جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ خواہشات کا حصول ہے، لبرل معاشرہ تمام خواہشات کی یکساں اہمیت اور قدر کا اصولاً اقرار کرتا ہے لہٰذا خواہشات کی ترجیحی ترتیب محض کثرت رائے پر منحصر ہوتی ہے لبرل معاشرہ حلال اور حرام کے کسی مستقل پیمانہ کو اصولاً قبول نہیں کرسکتا۔

جمہوریت وہ ذریعہ ہے جس سے ایسے افراد تیار کیے جاتے ہیں جو:

۱۔ خود غرض ہوں۔ اپنے آپ کو یکا و تنہا محسوس کریں۔

۲۔ اپنے آپ کو اس بات کا مکلّف سمجھیں کہ معیار خیر و شر خود متعین کرسکتے ہیں اور کسی دوسرے کو ان کے لیے یہ بات متعین کرنے کا حق نہیں۔

۳۔ تمام انسانوں کو تنہا اور خیر اور شر متعین کرنے کا مکلّف سمجھیں۔

۴۔ نفس کی پرستش کے قائل ہوں اور تمام خواہشات کی تکمیل کو اسی نفس پرستی کا ذریعہ سمجھیں۔

۵۔ ان چاروں نکات کو اختصار سے بیان کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ لبرل شخصیت آزادی کو اہم ترین گرداننے والی شخصیت ہوتی ہے۔

ایسی شخصیت کی تعمیر کے لیے جمہوری نظام میں جو ادارتی صف بندی کی جاتی ہے اس کی ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

جمہوریت کے ادارے:

اب ہم جمہوریت کے اداروں پر گفتگو کریں گے اور تجزیہ کے ذریعے ان کے عمل کی وضاحت کرکے ان کی روح کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

(ا) رائے دہندگی:

جمہوریت کا بہت اہم ادارہ ہے جو جمہوری مابعدالطبیعات اور اخلاقیات کا عکاس ہے۔ رائے دہندگی کا تعلق انسان کی حاکمیت سے اور اس کی آزادی سے ہے۔ ہر انسان اپنی تقدیر بنانے، اپنے فیصلے کرنے میں خودمختار تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ معاشرہ کی تشکیل کے لیے مختلف الخیال آزاد اور خودمختار افراد کے درمیان رہن سہن کا قابل عمل فارمولا تشکیل دینا ہوتا ہے اس لیے ہر حاکم اور خودمختار فرد کی رائے مانگی جاتی ہے اور اکثریت کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اقلیت کے مفادات کے تحفظ کے لیے حقوق کا سارا معاملہ موجود ہے۔ جب انسان حق رائے دہی کا استعمال کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس حق کو اس طرح استعمال کیا جائے جس سے اس کے مفادات کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہوسکے۔ اس سارے عمل کے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ ہر شخص شروع سے ہی الگ اور تنہا تصور کیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اسی لحاظ سے دیکھنے لگتا ہے۔

۲۔ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کو اولین اہمیت دینے لگتا ہے اور جس طرح یہ عمل بڑھتا چلا جاتا ہے وہ شخص اپنے مفادات کو زیادہ اہمیت دیتا چلا جاتا ہے۔

۳۔ حق رائے دہی کا یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اجتماع کی بناء محبت کے بجائے اغراض بن جاتی ہیں جس شخص کے اغراض میرے اغراض سے متصادم ہیں وہ میرا حریف اور جس شخص کے اغراض میرے اغراض سے لگا کھاتے ہیں وہ میرا حلیف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت کے فیصلے کرتے وقت ہر شخص کی رائے کو برابر کی اہمیت دی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں شرابی، زانی، نمازی ایک ہی اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں اور معاشرتی برتری کا واحد معیار مادی مفادات کے حصول میں کامیابی قرار پاتا ہے۔

② نمایندگی کا تصور:

یونان میں جمہوریت کا تصور ہر فرد کی براہ راست شرکت پر مبنی تھا لیکن جوں جوں ریاستیں وسیع ہوتی گئیں براہ راست شرکت کا عمل ناممکن ہوتا چلا گیا۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ رائے دہندگان اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے چند افراد کو چنیں جو ایک معین مدت کے بعد رائے دہندگان سے اپنی کارکردگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکیں۔ اس ادارہ سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ رائے دہندگان نمائندگان کو اپنی اغراض کی بنیاد پر منتخب کرتے ہیں۔

۲۔ نمائندگان بھی رائے دہندگان کی اغراض کو ہوا دیتے ہیں تا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ رائے دہندگان کا اعتماد حاصل ہو سکے۔

۳۔ چونکہ رائے دہندگان اور نمائندگان کے تعلق کی واحد بنیاد غرض ہوتی ہے اس لیے معاشرے میں وہ لوگ چنے جاتے ہیں جو زیادہ مکار، زیادہ چالاک اور حرام خوری میں زیادہ طاق ہوتے ہیں۔

۴۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ صلاح اور تقویٰ کی معاشرتی اہمیت معدوم ہوتی چلی گئی اور صالحین اور متقین کا معاشرہ میں مقام بہت کم ہو گیا کیونکہ نمائندگان قانون ساز بھی تھے اس لیے قانون سازی کا کام معاشرہ کے بدترین افراد کے ذمہ ہو گیا وہ کام جو خدا نے اپنے لیے مختص کیا ہوا ہے۔

③ بیوروکریسی ٹیکنوکریسی:

کیونکہ رائے دہندگی اور نمایندگی کے نتیجہ میں غرض ہی عمل کا محرک بن جاتی ہے اس لیے اقداری بحثیں غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ اس طرح معاشرہ میں وہ لوگ بالادست ہوتے چلے جاتے ہیں جو اغراض کے حصول کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں، ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

④ معاشرتی تفاوت:

غرض کی اولیت پر اجماع قائم ہونے کے نتیجہ میں سیاست بے حِسی کا شکار ہو جاتی ہے اقداری بحثوں کا سلسلہ کم سے کم ہو جاتا ہے اور ان مسائل سے دلچسپی صرف قیادت (elite) تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور یہی تہذیب

جمہوریت اور آزادی کا شعور رکھتے ہیں جبکہ عوام آزادی وغیرہ سے اغراض کے حصول کے علاوہ کوئی تعلق نہیں رکھ پاتے اور زیادہ سے زیادہ فوائد کا حصول اور نفس پرستی ہی معاشرے کے بڑے حصہ پر غالب آ جاتی ہے۔

متمدنین (Elite) اور عوام کے نقطۂ نگاہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ متمدنین آزادی کے حصول اور استحکام کے عمومی تقاضوں سے باخبر ہوتے ہیں وہ نظام میں مجموعی طور پر خود غرضی کو عام کرنے کے لیے معاشرتی حکمت عملی تشکیل کرتے ہیں۔ عوام کو صرف اپنے ذاتی اغراض کے حصول سے دلچسپی ہوتی ہے۔ خود غرض معاشرہ کی تعمیر واستحکام سے وابستگی نہیں ہوتی۔ اس قسم کے معاشرہ کی بقا کے لیے عوام عموماً ذاتی قربانی کم کر دیتے ہیں۔

ان چاروں اداروں کے نتیجہ میں جس قسم کی شخصیت تعمیر ہوتی ہے وہ خود غرض شخصیت ہوتی ہے جس کو اپنے مادی نفع کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ بڑے بڑے اقداری مسائل کو گٹر اور سڑک اور گیس پائپ لائن کے نذر کرنے کو ایک تحسین آمیز رویہ خیال کرنے لگتے ہیں اور ایک ایسی شخصیت وجود میں آتی ہے جو اپنی نفس پرستی سے باہر نہیں نکل پاتی۔

جمہوریت کی غرض پرستی اور خاندانی نظام کی تباہی

اس قسم کے خود غرض اشخاص محبت کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہر جمہوری اور لبرل معاشرہ میں خاندانی نظام کی لامحالہ شکست وریخت ہے۔ خاندان محبت کا گہوارا ہے۔ یہاں تمام تعلقات ایثار، خود فراموشی اور احسان کی بنیاد پر قائم رکھے جاتے ہیں۔ جب لوگ خود غرض ہو جاتے ہیں اور انفرادی آزادی کو تحفظ اور فروغ دینے لگتے ہیں تو وہ ماں، بیوی، بچوں اور بزرگوں کو حق نہیں دے سکتے کہ ان کی انفرادی آزاد زندگی میں دخل اندازی کریں اور نہ ان کے لیے قربانیاں دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ خاندانی نظام کے تباہ ہونے کا سب سے المناک اثر عورت پر پڑتا ہے وہ اپنی نسوانیت سے محروم (Defeminise) ہو جاتی ہے اور مرد بن کر نوکری کرتی ہے اس کا کوئی ولی نہیں رہتا۔ وہ اپنے ''حقوق'' مانگتی ہے اور معاشرہ ان ''حقوق'' کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عورت گھر سے باہر آ جائے تو تربیت کا وہ پورا نظام مسمار ہو جاتا ہے، جس پر دین اسلام کی عمارت قائم ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی جمہوری معاشرہ اسلامی اقدار کو فروغ نہیں دے سکتا۔ اسلام محبت کو عام کرتا ہے اور جمہوریت غرض کو۔ یہ دو ایسے اقداری نظام ہیں جو لازماً ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔

جمہوری عمل اور نظریہ میں تضاد:

جمہوری نظریہ کے بعد اور چار اہم جمہوری اداروں کی تشکیل اور عمل کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہمیں اس بات کو سمجھنے لینے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیے وہ کہ جمہوری نظریہ کے دعووں اور جمہوری عمل کے نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس کو ہم ذیل میں مختصر اور تقابلاً واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ جمہوری نظریے کا دعویٰ تھا کہ ہر انسان معیار خیر و شر کے تعین میں ایک اہم کردار ادا کرے گا لیکن حقیقتاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ صرف اپنی اغراض کے حصول میں لگے رہے اور دیگر اہم معاملات مقتدرین کے لیے چھوڑ دیئے گئے جیسے جیسے جمہوری عمل بڑھتا گیا بیوروکریسی میں اضافہ اور عوام کی اقداری معاملات سے لاتعلقی بڑھتی گئی۔ جس کے نتیجہ میں سیاست انتظام (administration) سے بدل گئی۔

۲۔ جمہوری نظریہ کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان پبلک عمل میں شریک ہوگا اور شہری اوصاف کو فروغ ملے گا اور لیکن عملاً یہ ہوا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی پرائیویٹ ہوتی چلی گئی اور صرف چند خاص لوگ (یعنی قیادت) منتخب ہو کر پبلک لائف میں دلچسپی لیتے ہیں۔

۳۔ سیاست دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

۱۔ اعلیٰ سیاست

۲۔ ادنیٰ سیاست

اعلیٰ سیاست مسلسل سیاست کا نام ہے۔ عوام اعلیٰ سیاست سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور صرف اس اعلیٰ سیاست کو ایک محدود عرصے بعد جواز فراہم کرنے کا کام کرتے ہیں جبکہ جمہوری نظریہ کے مطابق جمہوری عمل میں شرکت میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام اہم مسائل۔ مثلاً دستور کی تشریح، قومی نظریہ کا فروغ، خارجہ پالیسی، ملکیت کے نظام کی تشکیل وغیرہ صرف مقتدرین کے لیے دلچسپی کا باعث رہ جاتے ہیں اور ان معاملات میں مقتدرین جو فیصلہ کرتے ہیں عوام کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

۴۔ جوں جوں جمہوری عمل فروغ پاتا ہے۔ سیاست ادنیٰ مسائل کی طرف مرکوز ہوتی چلی جاتی ہے اور سیاست سے بڑے بڑے ایشوز خارج ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سیاست اغراض کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمہوری معاشرہ میں ثقافتی طور پر کم مایہ معاشرے قرار پاتے ہیں۔

۵۔ صرف قیادت ثقافتی زندگی میں شرکت کی اہل رہ جاتی ہے۔ صرف قیادت ثقافت اور تہذیب کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھتی ہے عوام میں یہ قابلیت کم سے کم چلی جاتی ہے۔

اس کے باوجود کہ قیادت elite میں شامل ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہیں۔ قیادت elite کا حجم کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ لبرل اور جمہوری معاشرہ میں ترقی کے لیے جس اعلیٰ درجہ کی حرص، خود غرضی، مطلب پرستی اور مادی یکسوئی کی ضرورت ہے وہ انسان کے فطری میلانات سے متصادم ہے۔ ایسے افراد جو مکمل بہیمیت اور سفاکی اختیار کر کے اپنی فطرت کو مکمل طور پر مسخ کر دیں لازماً بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

عوام نظام کی حمایت صرف افادی نقطہ نظر سے کرتے ہیں صرف قیادت elite نظام کی سچی وفادار ہوتی ہے۔

اثباتی سیاسی مفکرین:

غیر متبدل اقدار کے منکر اور خود غرضی کے قائل

کلاسیکی جمہوری نظریہ اور عمل کی اس دوئی نے مختلف زمانہ کے سیاسی فلسفیوں کو پریشان رکھا کچھ کلاسیکی جمہوری فلسفیوں نے کہا کہ تعلیم کے عام ہونے کے ساتھ یہ رجحان ختم ہو جائے گا۔ کچھ نے اسی قسم کے اور ٹوٹکے بتانے کی کوشش کی لیکن عمل نے یہ ثابت کیا کہ اس دوئی سے کوئی مفر نہیں اور یہ خلیج پاٹنے کے برعکس وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اس سلسلہ میں کلاسک جمہوری طرز عمل کے برعکس ایک دوسرا طرز عمل ہے جسے ہم اثباتی سیاسی مفکرین کا طرز عمل کہتے ہیں۔ اثباتی سیاسی مفکرین کلاسکی جمہوری مفکرین کی آدرشوں اور غیر متبدل اقدار کی باتوں کو لغو قرار دے کر رد کر دیتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ کلیات کی جستجو عبث ہے۔ ہم صرف جزئیات کو جان سکتے ہیں اور انہیں تک اپنے آپ کو محدود کرتے ہیں۔ وہ "کیا چاہنا چاہیے" کی بحث کو مکمل طور پر حذف کر دیتے ہیں اور صرف "انسان کیا چاہتا ہے" تک اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں اس طرح وہ کلاسیکی جمہوری نظریہ کو رد کر کے اپنے آپ کو اس تضاد سے بچاتے ہیں جو نظریہ اور عمل میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان مطلبی، خودغرض، لالچی، اپنی اغراض میں گم ہے اور اسے اقدار سے کوئی غرض نہیں، پبلک لائف سے اکثریت کو کوئی لینا دینا نہیں وغیرہ۔ بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی کا فروغ ایک فطری چیز ہے۔

کلاسیکی اور موجودہ دور کے جمہوری مفکرین میں یہ فرق ہے کہ موخر الذکر نے جمہوریت کو ایک ایسے کردار کی تعمیر کا ذریعہ سمجھنا ترک کر دیا ہے جو Slef Inteasted ہو Selfish نہ ہو اور اہل ہو کہ معاشرہ کے مجموعی اغراض کا تعین کر سکے۔ موجودہ جمہوری مفکرین اقرار کرتے ہیں کہ عوام میں یہ صفات جمہوری عمل کے ذریعہ پیدا نہیں کی جا سکتیں اور عوام لازماً selfish ہی رہیں گے۔ مقتدرین Self interested بنائے جا سکتے ہیں لیکن یہ فریضہ سیاسی عمل انجام نہیں دے سکتا بلکہ اس کے لیے ایک خاص تہذیبی کاوش کی ضرورت ہے جو مقتدرین میں خواہشاتی عقلیت (ratonality bounded by desire) اور تسخیر کائنات کی لگن کو فروغ دے۔

تجزیہ:

جمہوری ادارے (رائے دہندگی، نمائندگی، بیوروکریسی اور معاشرتی تفاوت) جیسا کہ ہم نے تفصیل سے دیکھا ہے، ایک خاص قسم کی شخصیت کو پروان چڑھاتے ہیں اس شخصیت کے بنیادی خدوخال غرض مندی، نفس پرستی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.Kitabosunnat.com

اور نفس پروری ہیں۔ جمہوری اداروں کی ساخت اور خاص قسم کی شخصیت کا یہ تعلق اگر واضح ہو چکا ہے تو ہمیں اسے سمجھنا چاہیے کہ کون سے ادارے لازماً اس شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ کون سے کلی طور پر اور کون سے جزوی طور پر، جو ادارے کلی طور پر یا جزوی طور پر اس شخصیت کو تعمیر کرتے ہیں۔ ان کو ہمیں یا تو رد کرنا ہوگا یا اگر وہ وقتی طور پر جدوجہد کے لیے ناگزیر ہیں تو ان کے اثرات کو زائل کرنے کے طریقے سوچنے ہوں گے۔

ہم جس شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس کا بنیادی محرک محبت ہے۔ خدا سے محبت جو عبادت ہے، بندوں سے محبت جو رفاقت ہے اور کائنات سے محبت جو خلافت ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت ہے جو غرض کی غلام نہیں ہے بلکہ شہادت کی جستجوئے مسلسل کے ذریعہ فنا کا مقام حاصل کرنے کی متمنی ہے تاکہ وہ اللہ سے راضی ہو جائے اور اللہ ان سے راضی ہو جائے۔ ہماری سیاسی جدوجہد کا مقصد غرض یا نفرت نہیں ہے بلکہ محبت کی جستجو اور اس کو عام کرنا ہے تاکہ لوگ جہنم سے بچ سکیں اور جنت کو حاصل کر سکیں۔ ہماری جمہوریت پر تنقید یہ ہے کہ وہ انسان کے باطن کو مسخ کرتی ہے وہ حقیقت اور نفس کے درمیان پردہ ڈالتی ہے، انسان کو نفس اور غرض کا بندہ بناتی ہے جبکہ ہم اسے خدائے واحد و قہار اور قیوم کا بندہ بنانا چاہتے ہیں۔ بحیثیت اسلامی انقلابی ہم اس باطل نظام کو تہ و بالا اور نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ہم اس میں کسی اصلاح کے قائل نہیں ہیں۔ ہم اس شجر خبیثہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنا چاہتے ہیں۔

یہ لازماً ایک تدریجی عمل ہے۔ اس وقت ہم میں یہ قوت نہیں کہ جمہوری عمل کو اس طرح رد کریں کہ وہ کمزور ہو اور اسلامی انقلابی معاشرتی قوت میں اضافہ ہو۔ جمہوری عمل کو کمزور کرنے کے لیے ہمیں اس بات کی کوشش کرنا پڑے گی کہ جمہوری نظام کی ان اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کریں جو یا تو اسلامی شخصیت کے فروغ میں حائل نہ ہوں یا جو معاشرتی نقصان ان اداروں کے کام سے رونما ہو اس کا دوسرے طریقوں سے سدباب کیا جا سکے۔ اس نوعیت کے اداروں کو اسلامی انقلابی جدوجہد میں اس طرح ضم کرنے کی سعی کرنی چاہیے کہ جمہوری نظام کلیتاً کمزور پڑے اور بالآخر منتشر اور نابود ہو جائے۔

جمہوریت کے مفاسد کا توڑ اسلامی معاشرتی تربیت

باب سوم

سرمایہ دارانہ معیشت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سرمایہ دارانہ معیشت

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سرمایہ داری کی نظریاتی اور تاریخی بنیادیں:

سرمایہ دارانہ نظام یورپ کی پیداوار ہے۔ یورپ میں سلطنت روم کے انحطاط کے بعد جاگیردارانہ نظام قائم [illegible] اس نظام کو کلیسا کی بھرپور حمایت اور تعاون حاصل تھا۔ اس نظام میں اقدار کی وقعت کا تعین مذہبی پیمانوں پر کیا جاتا تھا کلیسا اس عمل کو عیسائی اقدار کے حصار میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ دنیا پرستی دولت کے اضافے اور ارتکاز قوت کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور حرص وحسد کو مذہبی قبولیت اور جواز کبھی فراہم نہیں کیا گیا اور معاشرتی اقدار پر ہمیشہ مذہبی رنگ ہی غالب رہا۔ اخروی کامیابی کو دنیاوی ترقی کے مقابلہ پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔ لیکن عیسائیت کے پاس اپنا کوئی قانونی نظام نہ تھا اس لیے روما کے قوانین ہی کو City of man کی عمل داری کے لیے قبول کیا جاتا تھا اور اس کی اپنی اقدار ان قوانین میں بہت مشکل سے منعکس (Reflect) ہوتی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا [illegible] کی پابندی نہ کرسکا۔ معاشی میدان میں بڑے پیمانے پر کرپشن [illegible] عیسوی تک پاپائے روم مغربی یورپ کا سب سے بڑا زمیندار بن گیا۔

[illegible] تحریکیں [illegible] جنہوں نے دنیا پرستی، حرص اور حسد کی

۱۔ احیاء کا دور

۲۔ بادشاہت کا جواز

[illegible] (Protestent Movement) تحریکات نے دنیا پرستی کو [illegible]

[illegible]

[illegible] مطلق بخشی ہے۔ اس نظریہ کو Divine rights of King کہا جاتا ہے۔ بادشاہ کو ملکی معاملات میں خیر و [illegible]

متعین کرنے کا حق بلا شرکت غیرے حاصل ہے اور کوئی اس حق کے استعمال پر حد لگانے کا مجاز نہیں۔

چونکہ بادشاہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے میں عموماً سب سے زیادہ قوت اور دولت کے حریص اور حاسد ہوتے تھے لہٰذا منطقی طور پر بادشاہوں کی بالادستی قبول کر کے پروٹسٹنٹوں نے حرص اور حسد کو مذہبی جواز فراہم کیا۔ وہ احتکار اور ارتکاز دولت کو خدائی نظام تصور کرنے لگے اور خیرات اور صدقہ کی جگہ بخل اور بچت کی تحسین کرنے لگے۔ دنیوی ترقی کو نہ صرف فرض قرار دیا گیا بلکہ دنیوی ترقی اخروی انعام کا مظہر اور پرتو سمجھی جانے لگی۔ سترہویں صدی تک مغربی اور شمالی ریاستوں میں مضبوط قومی ریاستوں کی تعمیر کا عمل زور پکڑ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ تنویر (Enlightenmaent Philosphy) کے بیشتر مباحث اور نتائج کو مذہبی رہنماؤں نے قبول کرلیا۔ خواہشاتی عقلیت Rationality bounded b[illegible] کی بالادستی کو عیسائی حلقوں میں مستحکم کرنے کا کام ST[illegible]
nas [illegible] T[illegible] کے وقت سے فروغ پارہا تھا اور سترہویں صدی تک کی تحریک نے اس رجحان کو بالکل
ہی غا[illegible] کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مفکر دونوں دنیاداری حرص اور حسد کی معاشرتی تقویم کو جواز
فراہم کر[illegible] میں مخالف آوازیں [illegible] ہو گئیں۔ حرص اور حسد کو مذہبی جواز فراہم کرنے
[illegible] پروٹ[illegible] حلیف یورپی [illegible] کے یہاں دنیا پرستی مذہبیت پر ایک ہزار سال قبل
[illegible] آچر[illegible] کو اپنا سب [illegible] تھے۔ بادشاہوں کی معاشرتی بالادستی یہودیوں
[illegible] [illegible] بالخصوص معاشیات اور عمرانیات پر یہودی فکر کی

[illegible] حسد غالب معاشرتی اور انفرادی اقدار کی حیثیت
[illegible] حل سے گزرا ہے۔ سب سے پہلے دور میں حرص
[illegible] اس دور میں سرمایہ دار ریاستی جبر کو استعمال کرکے
[illegible] ودولت حاصل کرتے ہیں۔ اس لوٹ مار اور
[illegible] کسانوں کی زمینیں چھینی جاتی ہے اور زرعی
[illegible] ایسا نظام قائم کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں
[illegible] کر سرمایہ دارانہ مراکز میں جمع ہوجائے۔
[illegible] اور شمالی افریقہ سے تمام عالم اسلام میں لوٹ
[illegible] ملتی۔ دور برّاعظموں کی قدیم آبادی کو تحسر [illegible]

نیست ونابود کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں تقریباً ستر لاکھ سرخ سیاہ فام باشندے (Red Indians) امریکا میں اور ستر لاکھ ابورجینز آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں قتل کیے گئے۔ افریقہ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ محتاط اندازوں کے مطابق بیس لاکھ کے قریب افریقی صرف امریکا کے غلام بردار جہازوں میں مر گئے۔ ہندوستان، چین اور انڈونیشیا کی دولت کا ۶۰ سے ۸۵ فیصد تک یورپ منتقل کیا گیا۔

لامحالہ اس بہیمانہ سفاکی کا اثر یورپی اخلاق پر پڑا کیونکہ لوٹ مار اور قتل وغارت گری تقریباً تین صدیوں تک منظم طور پر جاری رہی اور یہی بہیمیت مغربی تہذیب کی اصل بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر قومی سرمایہ دارانہ فلاحی ریاست (Welfare State) نے جنم لیا۔ یہ سرمایہ داری کا دوسرا دور ہے اور اس دور میں سرمایہ داری چند مراکز سے نکل کر پورے ملک پر چھا جاتی ہے۔ اس ملک کا ایک عام شہری خودغرض، حاسد اور حریص بن جاتا ہے اور اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل ہی مقدم ترین معاشرتی ہدف بن جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ریاست حقوق کی سیاست کو جمہوریت کے ذریعے عام کر کے خودغرضی، حسد اور حرص کو تحفظ بھی دیتی ہے اور فروغ بھی۔

سرمایہ داری کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جب حرص اور حسد پوری انسانیت پر غالب آجائے اور ایک ایسا بین الاقوامی نظام قائم کیا جاسکے جو مکمل طور پر سرمایہ دارانہ اقدار، ترجیحات اور ضابطوں کا عکاس ہو یہ دور ابھی تک تاریخِ انسانی میں نہیں آیا۔

سرمایہ دارانہ نظام:

سرمایہ دارانہ نظام کا قیام اور استحکام اس بات پر منحصر ہے کہ حرص اور حسد عام ہو۔ ہر آدمی حریص ہو وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔ اس کو Accumulation کہتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ دوسرے شخص کو اپنا حریف سمجھے اور اس سے سبقت لے جانے کے لیے Compete کرے۔ Accumu Lation اور Competetion حرص اور حسد کو فروغ دینے کے ذریعہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ اخلاقیات انہی بنیادوں پر قائم ہیں۔ معاشی تھیوری اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ہر شخص فطرتاً خودغرض ہے اور زیادہ سے زیادہ حصول لذت اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ دورِ حاضر کا مغربی سیاسی فلسفہ خودغرضی اور نفس پرستی کو بنیادی انسانی اوصاف حمیدہ تصور کرتا ہے اس کے مطابق انسان نہ صرف خودغرض اور لذت پرست ہے بلکہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انسان کو صرف اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ نوع آدم کے ایک رکن کی حیثیت سے خودغرضی اور لذت پرستی کو بحیثیت اقدار کے قبول کرنا چاہیے۔ اگر انسانیت یا قوم کی مجموعی لذت میں اضافہ کرنے کے لیے انفرادی لذت کو قربانی دینا پڑے تو فرد کو یہ قربانی بخوشی دینا چاہیے۔ کیونکہ فرد کے اغراض کا حصول نوع کے اغراض کے حصول پر منحصر ہے۔ جب فرد اس نوعیت کی قربانی دیتا ہے تو اپنی فطری خودغرضی اور لذت پرستی کا منطقی تقاضا پورا کرتا ہے، اسی کو Rationality

کہتے ہیں۔ bounded by desire سرمایہ داری وہ نظام ہے جس میں خودغرضی اور لذت پرستی اعلیٰ ترین اقدار کے طور پر قبول کی جاتی ہیں، ہر فرد احتکار اور مسابقت کو مقدم ترین اوصاف تصور کرتا ہے۔

Accumulation صرف یا لاگت اور حاصل ریونیو کا فرق ہے۔ یعنی

A=R-C ...... صرف۔ حاصل = جمع

سرمایہ دارانہ عمل حاصل کو بڑھانے اور صرف کو کم کرنے کا عمل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اشیاء کی قدر صرف ان کی قیمت متعین کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں قیمت کا تعین ایک پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ہم گیہوں کی قیمت متعین کرنا چاہتے ہیں تو ان کی قیمت کا تعین ان اشیاء کی قیمتوں سے ہوگا جن کو استعمال کر کے گیہوں پیدا کیا گیا۔ مثلاً زمین کا لگان یعنی لگان۔ اجرت = گیہوں کی قیمت

چنانچہ اس شے (گیہوں) کی قیمت کے تعین میں تین اشیاء کے مالک شریک ہوتے ہیں۔

۱۔ گیہوں کا مالک (تاجر)

۲۔ زمین کا مالک (زمیندار)

۳۔ محنت کا مالک (مزدور)

ہر شے کے مالک کی کوشش سرمایہ دارانہ نظام میں یہ ہوتی ہے کہ جس شے کو وہ خریدے گا اس کی قیمت کم سے کم ادا کرے اور جس چیز کو وہ فروخت کر رہا ہے اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ وصول کرے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ خودغرض اور لذت پرست ہوتا ہے۔ احتکار اور مسابقت کا اسیر ہوتا ہے۔ جن معاشروں میں حرص اور حسد عام نہیں ہوتے وہاں قیمت کا تعین اس قسم کی رسہ کشی سے نہیں ہوتا۔ وہاں شے بنانے والے وہ قیمت چاہتے ہیں جو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو گویا جتنی محنت صرف ہوگی اتنی ہی اجرت طلب کی جائے گی۔ جتنا لگان زمین کی پیداواری لاگت برقرار رکھنے اور زمیندار کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوگا وہ لگان قبول کر لیا جائے۔ اس قسم کے معاشرہ میں عادلانہ اجرت (Just wage) اور عادلانہ قیمت (Just price) کا تصور معنی رکھتا ہے گویا عدل کا قیام ضرورتوں اور خواہشات کے محدود ہونے پر ہوتا ہے۔ جب خواہشات لامحدود ہو جاتی ہیں تو نہ عدل ممکن رہتا ہے اور نہ قیمتوں کا تعین کسی معروضی Objective پیمانہ کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں خواہشات بے لگام ہو جاتی ہیں کیونکہ ہر فرد خودغرض اور لذت پرست ہو جاتا ہے ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ خرید رہا ہے اس کی کم سے کم قیمت دے اور جو فروخت کر رہا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے قیمتیں گویا قوت کی بنیاد متعین ہوتی ہے۔ بازار میں جس کی قوت سب سے زیادہ ہوگی وہ اپنی چیز کی سب سے زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ قیمتوں کے تعین کا کوئی مستقل Objective پیمانہ باقی نہیں رہ

محکم دلائل سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا۔ قیمتوں کا تعین Subjectively ہوتا ہے اس بات کو جدید معاشی نظریہ پوری طرح قبول کرتا ہے لیکن معاشی تھیوری (Economic heory) یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتی ہے کہ قیمتوں کا تعین صارف (Consumer) کی خواہشات کی بنیاد پر ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ معیشت میں صارف (Sovereign) ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں اصل قوت ان کمپنیوں کے پاس ہوتی ہے جو Accumalation میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔ یہی کمپنیاں اشیاء کی طلب کا تعین کرتی ہیں، اس عمل کو Demand Management کہا جاتا ہے اور اس میں ریاست ان کمپنیوں کی مدد کرتی ہے اور انہی کی پالیسیاں اشیاء کی پیداواری مقدار اور ان کی قیمت پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں قیمتوں کا تعین قوت کے ٹکراؤ سے ہوتا ہے۔ قوت ان کمپنیوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتی ہے جو سب سے کامیاب Accumulatir ہوتی ہے Accumulation ایسی اشیاء اور خدمتوں (services) کی پیداوار اور تقسیم Exchange کا نتیجہ ہے جو صرف کی جا سکیں۔ لیکن اشیاء یا خدمتیں Accumalate نہیں کی جا سکتیں۔ ان کا مقصد وجود ہی صرف ہو جاتا ہے Accumulate صرف سرمایہ کو کیا جاتا ہے۔ سرمایہ (Capital) وہ زر (Money) ہے جو اشیاء اور خدمتوں کی پیداوار اور تقسیم کے چکر سے صرف اس لیے گزرتا ہے تاکہ اپنی مقدار مسلسل بڑھاتا رہے۔ سرمایہ کی کوئی اساسی صفت یا حقیقت نہیں ہوتی وہ مقدار محض (Pure.quantity) ہوتا ہے (جیسے دوسری شیطانی قوتوں کی حقیقت نہیں ہوتی وہ محض وسوسہ ہوتی ہیں) جیسے جیسے:

(۱) اشیاء کی انواع (Range of production) (۲) اشیاء کا صرف (۳) اشیاء کی تقسیم تیز ہوگی زر کی گردش تیز ہوگی اور سرمایہ کے احتکار (Accumulation) مواقع زیادہ ہوں گے۔ زر کی گردش کو تیز کر کے Accumulation کے عمل کو وسعت دی جاتی ہے۔ زر کی گردش کو تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ نظام میں پھنسا نہ رہے وہ ایک ایسا سیال مادہ بن جائے جو برق رفتاری سے مسلسل حرکت کرتا رہے۔ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں سرمایہ کی سیالیت (Liquidity and Flecibllity) بہت بڑھ جاتی ہے۔ زر کے بازار اور سرمایہ کے بازار پیداواری نظام سے کہیں زیادہ تیز رفتار Integerated ہوتے ہیں اور ان کا اور پیداواری نظام کا تعلق کمزور ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۳ء کے بعد سے یورپ اور امریکا ایک ایسی طویل المدت کساد بازاری سے دوچار ہیں جس کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ کی شرح ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں کے مقابلے میں آدھی سے بھی کم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس سرمائے کے بازار میں حصص کی قیمتیں عموماً تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہیں۔ مثلاً EBE100 کا انڈکس ۱۹۷۳ء سے لے کر ۱۹۹۲ء کے اختتام تک ساڑھے تین گنا بڑھ گیا) اور بارہا ایسا ہوا کہ

پیداوار میں کمی کے باوجود طویل مدت تک حصص کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

لیکن سرمایہ کا بازار پیداواری نظام سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا کیونکہ پیداواری نظام ہی تقسیمی نظام (Distributive System) کو ممکن بناتا ہے اگر پیداوار اور اس کی تقسیم کی رفتار مستقلاً منجمد ہو جائے تو Accumulation ناممکن ہو جائے جیسا کہ بعد میں زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک بنیادی تضاد یہ ہے۔

(۱) Accumulation صرف، پیداوار اور تقسیم (Distribution) میں کمی کر دیتا ہے۔

(۲) Accuumulation صرف، پیداوار اور تقسیم کے عمل کی بنیاد پر ممکن ہوتا ہے۔

(۳) لیکن پیداواری نظام سرمایہ کو مشینری، زمین، بلڈنگ وغیرہ کی شکل میں منجمد اور قید کر لیتا ہے اور اس سیالت میں کمی کر دیتا ہے۔

لہٰذا سرمایہ ہمیشہ پیداواری نظام سے دوری کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ دوری مکمل کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ Accumulation کی بنیاد پیداوار اور اس کی تقسیم میں اضافہ پر ہے لیکن جتنی یہ دوری بڑھتی ہے سرمایہ کی گردش کی رفتار اتنی ہی تیز ہو جاتی ہے تاریخی طور پر سرمایہ نے پیداواری نظام سے دوری کی دو شکلیں اختیار کی ہیں۔

ا۔ استعماریت (Impercelism):

جب کوئی پیداواری نظام Mature ہو جاتا ہے تو وہاں شرح منافع گھٹ جاتی ہے بڑھوتری کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی گردش کے مواقع بھی کم ہو جاتے تھے۔ لہٰذا زیادہ منافع اور سیالیت Liquidity کی تلاش میں سرمایہ پرانے مراکز چھوڑ دیتا تھا۔ مثلاً انیسویں صدی میں برطانوی سرمایہ دارانہ معیشت جرمنی اور جاپان میں مستحکم ہوئی یہ ممالک برطانیہ اور امریکا کے لیے خطرہ بن گئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان کو تباہ کیا گیا۔ یہ بات ہم کو سرمایہ دارانہ معیشت اور ریاستی قوت کے نظام کے تعلق کے بارے میں ایک اہم اشارہ دیتی ہے جس پر ہم سرمایہ داری کے تضادات والے سیکشن میں گفتگو کریں گے لیکن یہاں اتنی بات سمجھ لینا کافی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی برتری قائم رکھنے کے لیے ریاستی جبر کا استعمال ناگریز ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں استعماری نظام نے وہ نظام جبر فراہم کیا ہے جس سے ان ممالک کا معاشی استحصال ماضی میں بھی کیا اور آج بھی ریاستی جبر کی بنیاد پر یہ استحصال جاری ہے۔

۲۔ زر کے بازار اور سرمایہ کے بازار کا قیام

سرمایہ پیداواری نظام سے آزاد کرانے کے لیے زر کا بازار قائم کیا گیا۔ زر کے بازار کا قیام اس بات پر منحصر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ زر کی قدر کسی شے کی بنیاد پر نہیں بلکہ سرمایہ داروں اور ان کی ریاست کی قوت کے استعمال کے ذریعہ کی جائے۔ چنانچہ پہلے زر کا تعلق سونے اور چاندی سے محدود کیا گیا اور ۱۹۷۱ء کے بعد سے یہ تعلق بالکل ختم کر دیا گیا اب دنیا کے ہر ملک کے سکے کی قدر حکومتوں اور سرمایہ داروں کی قوت کی رسہ کشی کے نتیجہ میں مقرر ہوتی ہے۔ کسی کرنسی کی کوئی متعین اور مستحکم قدر نہیں۔ تمام سکوں کی قدر مستقل قوت کے استعمال کے ذریعہ ہر آن بدلتی رہتی ہے یہی Foreign exchange market کا کام ہے۔

زر کے بازار کے فروغ میں بنیادی کام بینکوں نے انجام دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بینکوں کو خود سرمایہ پیدا کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں بخل عام ہوتا ہے اور لوگ اپنی بچت کو محفوظ رکھتے ہیں اس کا صرف قلیل حصہ استعمال میں لاتے ہیں بینکاری کا نظام اس بات کا اندازہ لگاتا ہے کہ بچت میں سے ایک متعین مدت میں کتنا خرچ ہوگا۔ مثلاً یہ شرح پچیس فیصد ہے تو ایک بینک ان سو روپوں میں سے جو اس کے پاس رکھوائے گئے صرف پچیس روپیہ محفوظ رکھتا ہے اور ۷۵ روپے کسی کو قرضہ دیتا ہے۔ یہ ۷۵ روپے کسی دوسرے بینک میں جمع ہوتے ہیں اور وہ بینک ۷۵ روپوں کا ۲۵ فیصد محفوظ رکھ کر ۵۶ روپے ۲۵ پیسہ قرضہ دے دیتا ہے اب یہ اس کا بھی بھی ۲۵ فیصد محفوظ کر لیا جاتا ہے اور ۴۲ روپے ۱۹ پیسہ کا قرضہ دیا جاتا ہے لہٰذا ۱۰۰ روپے کی بچت قرضہ کی مقدار.....۷۵+۵۶.۲۵+۴۲.۱۹=۱۷۳.۴۴ صرف تیسرے چکر تک ہو جاتی ہے۔ اگر آپ پورا حساب کریں تو دیکھیں گے کہ بینکاری کا نظام ۱۰۰ روپے کی بچت کی بنیاد پر ۴۰۰ روپے کا قرضہ ۲۵ فیصد کے محفوظات رکھتے ہوئے دیتا ہے۔ یہ چار سو روپے بینکاری نظام کی پیداوار ہیں اور چونکہ ان کے پیچھے کوئی اصل قدر مثلاً سونا چاندی وغیرہ نہیں ہوتی اس لیے اس پیداوار کی صرف شرح بچت ہی حد متعین کرتی ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں زر کی قیمت سود ہے۔ سود کا تعین دیگر تمام قیمتوں کی طرح قوت کی رسہ کشی سے ہوتا ہے۔ بچت کرنے والے سود کو بڑھانے اور قرضہ لینے والے سود کو گھٹانے کی مسلسل جدوجہد کرتے ہیں چونکہ اشیاء کی پیداوار اور ان کی تقسیم زر کے استعمال کے بغیر ناممکن ہے اور چونکہ زر کی قدر اور قیمت کا تعین بینکاری نظام کرتا ہے لہٰذا سود ربوا الفضل کی شکل میں ہر شے اور ہر خدمت کی قیمت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بینکاری نظام کو یکسر ختم کیے بغیر ربوا الفضل سے نجات ممکن نہیں جیسے جیسے بینکاری کا نظام وسعت پاتا ہے ویسے ویسے حرام خوری عام ہوتی ہے اور فرد سرمایہ دارانہ معیشت میں ضم ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

فرد کی اس مجبوری میں اضافہ سرمایہ کا بازار بھی کرتا ہے۔ سرمایہ وہ زر ہے جو اپنی مقدار میں اضافہ کی خاطر مستقل پیداواری اور تقسیمی (Distributive) چکر سے گزرتا رہتا ہے۔ سرمایہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں اور ان

کے حصص کی شکل میں تجسیم (Subjtctivity) اختیار کرتا ہے۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں شخصی ملکیت بتدریج ختم ہو جاتی ہے۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں پورے پیداواری اور تقسیمی نظام پر حاوی ہوتی ہیں۔ انہی کی آپس کی قوت کی رسہ کشی کے نتیجے میں بیشتر اشیاء اور خدمتوں کی قیمتیں اور پیداواری مقدار مقرر ہوتی ہیں۔ ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے لاکھوں قانونی مالک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ملکیت محض افسانوی (Fictional) حیثیت کی ہوتی ہے۔ کمپنی کو چلانے والے اور اس کی پالیسی متعین کرنے والے اس کے قانونی مالک نہیں بلکہ اس مینجمنٹ کے ارکان ہوتے ہیں جن کے پاس عملاً کمپنی کے ایک فیصد حصص بھی نہیں ہوتے۔ کمپنی کی کامیابی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ مینجمنٹ سرمایہ کے احتکار (Accumulation) میں کتنا اضافہ کرتی ہے۔ اس اضافہ کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے لازم ہے کہ مینجمنٹ کمپنی کے ہر کارکن کو زیادہ سے زیادہ خودغرض، دنیا پرست، سفاک اور ظالم بنائے یہی سرمایہ دارانہ عقلیت (Rationality of Capitalist) کا فطری تقاضا ہے۔ جب سرمایہ کا بازار وسعت حاصل کرتا ہے۔ تو جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں معیشت پر غالب آ جاتی ہیں۔ شخصی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ عقلیت نفس انسانی کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لذت پرستی، خود غرضی اور استحصال ایک وبا کی طرح تمام انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ کی بنیادی خصوصیات:

جیسا کہ بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ سرمایہ داری کی اصل روح خودغرضی اور لذت پرستی ہے جب حرص اور حسد عام ہو جاتے ہیں اور خواہشاتی عقلیت (Rationalty bounded by desire) معاشرے پر غالب آ جاتی ہے تو سرمایہ دارانہ ادارے مستحکم ہو جاتے ہیں۔ یہ ادارے ہر فرد کو ایک بے بس اور لاچار شے بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہر شخص اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ خواہشاتی عقلیت کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے۔ وہ جتنا خودغرض، حریص، حاسد اور سفاک ہوگا معاشرہ میں اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوگا۔ اگر وہ حرص، حسد اور دنیا طلبی سے دامن بچانے کی کوشش کرے گا تو اس کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اس کا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے ماں، باپ، بیوی بچے اس کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر شخص خواہشاتی عقلیت کا پیمانہ اور معیارات قبول کرنے پر مجبور ہے، سرمایہ داری وہ نظام جبر ہے جس میں ذاتی ملکیت کو ختم کر کے ہر شخص کو سرمایہ کا مزدور بنا دیا جاتا ہے۔ سرمایہ وہ زر ہے جو مستقل اپنی مقدار میں اضافہ کی غرض سے پیداواری نظام سے گزر رہا ہے اور جو جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی شکل میں تقسیم ہو رہا ہے۔ سرمایہ ہر شخص کا اصل مالک بن جاتا ہے اور سرمایہ کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ اس کے صرف منیجر ہوتے ہیں جن کی بقا صرف اس پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے تقاضوں کے کتنے پابند ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہر شخص مزدور ہوتا ہے اور سرمایہ کی مسلسل خدمت پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں طبقات ختم ہوجاتے ہیں اور بھرپور (Mature) سرمایہ دارانہ معاشرہ میں طبقاتی کشمکش ناممکن ہوجاتی ہے۔ چونکہ ہر شخص اپنی محنت کو ایک شے (Objectified) کی شکل میں سرمایہ کی خدمت میں پیش کرنے پر مجبور ہے اور چونکہ سرمایہ جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے ہیولے میں تجسیم ہوچکا ہے لہٰذا معاشرہ یک رنگ ہوجاتا ہے۔ ترقی کا معیار صرف سرمایہ دارانہ عقلیت کی پیروی بن جاتی ہے اور غریب سے غریب شخص اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ سرمایہ دارانہ عقلیت کو مکمل طور پر اپنانے کی اہلیت رکھتا ہے اور سرمایہ دارانہ اہداف کا حصول اپنی زندگی کا سب سے اہم مقصد سمجھتا ہے۔ سرمایہ دارانہ عقلیت میں مذہبی، نسلی، لسانی اور طبقاتی امتیازات کو رد کیا جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرت میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شخص کو سرمایہ کی خدمت کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اور یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ سیاسی فلسفہ میں اس نظریہ کو (Equality of opportunity) کہا جاتا ہے یعنی یکساں مواقع سب کے لیے اور فلاحی ریاست کا قیام اسی (Equality of opportunity) کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست سرمایہ دارانہ معاشرت کی پشت پناہی کرتی ہے۔ یہ آزادی اور مساوات کی اقدار کو عام کرتی ہے اور ہر شخص کو ایک ایسا یکا اور تنہا فرد گردانتی ہے جس کی خواہشات کی تکمیل ہر دوسرے کی خواہشات کی تکمیل کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ فرد کتنے وسائل حاصل کرتا ہے اور وسائل کا حصول صرف سرمایہ دارانہ عقلیت کے پیمانوں کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے لہٰذا جو سیاسی نظام سرمایہ دارانہ معاشرت کو تقویت دیتا ہے وہ انسان کو خود غرض، حریص، حاسد اور سفاک بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جتنا جتنا آزادی اور مساوات کو بحیثیت معاشرتی اقدار کے قبول کرلیا جائے گا اور جوں جوں سیاسی عمل حقوق کے حصول کے محور کے گرد مرتکز ہوگا سرمایہ دارانہ معیشت اتنی ہی زیادہ استحکام اور تقویت حاصل کرے گی اور فلاحی ریاست بآسانی بنیادی سرمایہ دارانہ اداروں زر کے بازار، سرمایہ کے بازار، جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں، ذاتی ملکیت کا خاتمہ اور نظام اجرت کی عمومیت کو تحفظ دے سکے گی۔ جمہوری فلاحی ریاست وہ فطری سیاسی خول ہے جس میں سرمایہ دارانہ معیشت پنپتی ہے اور جس میں نفس پرستی، خود غرضی، حسد اور حرص فروغ پاتی ہیں۔

لیکن جو لوگ جمہوری ریاست اور سرمایہ دارانہ معیشت کو رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ فطرت انسانی سے جنگ کرتے ہیں۔ فطرتاً انسان خود غرض، حاسد، حریص اور سفاک نہیں ہے۔ انسان کی سب سے بڑی فطری ضرورت یہ ہے کہ وہ محبت کرے اور اس سے محبت کی جائے۔ محبت فنائے ذات کی متقاضی ہے نفس پرستی اور لذت پرستی کی نہیں محبت کرنے والا شخص ایثار، انفاق اور احسان کی صفات کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ حرص، حسد، دنیا

طلبی اور سفاکی کو عیب جانتا ہے۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کی نفی فطرت انسانی خود کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے بھرپور Mature سرمایہ دارانہ معاشرہ میں بھی اس عقلیت کے تقاضوں کو بہت کم افراد پورا کر پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام لاتعداد تضادات کا شکار ہے اور خود اپنی تباہی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ذیل میں ہم ان تضادات کو مختصر بیان کریں گے۔

سرمایہ داری کے تضادات:

سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ احتکار کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو لیکن احتکار کی بنیاد نظام پیداوار ہے لہٰذا احتکار (Accumaulation) کی رفتار میں مسلسل اضافہ ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیداوار میں اضافہ خواہشات میں اضافہ کے تابع ہے۔ اگر خواہشات میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو تو پیداوار بیکار ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زراعت بالخصوص کئی دہائیوں سے زائد از ضرورت پیداوار (Over Production) کا شکار ہے اور ہر سال لاکھوں ٹن اجناس تباہ کی جاتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ پیداوار کئی صنعتی شعبوں میں بھی پھیل جاتی ہے۔

لہٰذا سرمایہ دارانہ پیداواری نظام ضرورتوں اور خواہشات کو بڑھانے کی سعی کرتا ہے۔ سب سے زیادہ منافع بخش وہ صنعتیں ہوجاتی ہیں جو خواہشات کو ابھارنے کے لیے اشیاء پیدا کریں مثلاً تفریحی صنعتیں، معلوماتی اور مواصلاتی صنعتیں اشتہاری صنعتیں وغیرہ۔ جو لوگ ان صنعتوں سے وابستگی نہیں رکھتے وہ سرمایہ دارانہ ترقی میں حصہ لینے سے قاصر رہیں اور سرمایہ دارانہ نظام ان افراد کو اپنے اندر جذب کرنے کا کوئی مؤثر طریقہ نہیں رکھتا۔ یہ سرمایہ دارانہ تعلق کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ فلاحی ریاست کے قیام کے باوجود سرمایہ دارانہ مراکز تک میں کروڑوں افراد سرمایہ دارانہ معیشت میں شمولیت نہیں اختیار کر پاتے۔ بے روزگاری عام ہوجاتی ہے ریاست کے وسائل محدود ہوجاتے ہیں اور فلاحی ریاست کے دائرہ کو مجبوراً کم کرنا پڑتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پیداواری نظام بازار زر اور سرمایہ کے بازاروں کی رفتار ترقی کا ساتھ نہیں دے پاتے اور سرمایہ دارانہ معاشی ڈھانچہ غیر متوازن ہوتا چلا جاتا ہے Finacial مارکیٹ کے ارتقاء کے لیے جن اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان پالیسیوں سے متصادم ہوتے ہیں جو پیداواری معیشت کی ترقی اور استحکام کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ احتکار کا مقصد بیان نہیں کرپاتی۔ کارخانہ میں کام کرنے والا مزدور فطرتاً اس نظام جبر کے خلاف بغاوت کرتا ہے جس کا مقصد محض احتکار ہے۔ ریاست کا شہری جمہوری عمل سے لاتعلق ہوجاتا ہے کیونکہ یہ عمل ایک ایسا یکا اور تنہا فرد بنانا چاہتا ہے جو آزادی اور مساوی حقوق کے حصول اور فروغ کے ذریعہ اپنی تنہا اور خود مختاری کا طالب ہے لیکن انسان نہ تنہائی ہے نہ خود مختار، فطرتاً اس کی نظر میں آزادی

www.KitaboSunnat.com

اور مساوی حقوق کوئی وقعت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ الہامی ادیان نے مساوات کو کبھی بھی اقداری اہمیت نہیں دی۔

انسان آزادی اور خود مختاری نہیں چاہتا بلکہ وہ محبت کرنا چاہتا ہے۔ خدا سے محبت اور بندوں سے محبت معاشرہ کی بنیادیں محبت فراہم کرتی ہے۔ چونکہ سرمایہ داری اور لبرلزم آزادی اور مساوی حقوق کی پرستش کرتے ہیں لہٰذا وہ کسی معاشرہ کی تعمیر کی بنیاد فراہم نہیں کر سکتے۔ تاریخی طور پر سرمایہ داری اور لبرلزم نے معاشرتی تعمیر کے لیے قوم پرستی کا سہارا لیا ہے۔ افراد اپنی قوم کے لیے ایثار اور اخلاص کا مظاہر کرتے ہیں لیکن قومی ریاستیں کسی اعلیٰ اور واضح مقصد کے لیے قائم نہیں ہوتیں۔ ان کا مقصد وجود محض ارتکاز قوت اور نفس پرستی کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ وہ نفرت کو عام کرتی ہیں محبت کو نہیں یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری ہمیشہ استحصالی جنگ کو فروغ دیتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں ہمیشہ اقوام برسرپیکار رہتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ داخلی بحران اور بین الاقوامی جنگ کے خطرات سے گھرا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داری فطرت انسانی کے خلاف جنگ ہے اور وہ حرص، حسد، لذت پرستی اور سفا کی جیسے منفی جذبات کو فروغ دیتا ہے جو سکون قلب کو تباہ کر کے انسان کو جہنم کے دہانے تک پہنچا دیتے ہیں۔

سرمایہ دارانظام اور اسلامی انقلابی حکمت عملی:

سرمایہ داری اسلام کی ضد ہے۔ اسلام سراپا محبت ہے۔ سرمایہ داری حرص وحسد کی تجسیم ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اسلامی معیشت دانوں نے سرمایہ دارانہ اداروں کو اسلامیانے کی کوشش کی، اسلامی انقلابی سب سے پہلے سرمایہ دارانہ عقلت کو یکسر رد کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ انسان فطرتاً حریص، حاسد، خود غرض اور لذت پرست ہے وہ محبت، انفاق، صبر، توکل، فقر، زہد اور احسان کو فطری انسانی صفات شمار کرتے ہیں اور ان کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی معاشرتی حکمت عملی انہی صفات کو عام کرنے کی بنیاد پر مروج کرتے ہیں۔

یہ حکمت عملی سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل طور پر تباہ کرنا چاہتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جزوی اصلاح کی خواہش مند نہیں۔ اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے کے لیے تین سطحوں پر کام اشد ضروری ہے۔

(۱) ان بازاروں اور پیشوں میں حلال رزق فراہم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے جو قدیم اسلامی روایت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور جن کا زر کے بازار اور سرمایہ کے بازار سے بالواسطہ تعلق نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی جماعتیں مساجد کو بنیاد بنا کر ایسی معاشی صف بندی کریں جس کے نتیجے میں عام آدمی کے لیے حلال رزق کے وافر مواقع مہیا ہوں۔ اسلامی جماعتوں کو اس کام کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ حرص اور حسد کی بیماریاں اس

میں شریک افراد کو متاثر نہ کر سکیں۔ اس وجہ سے لازم ہے کہ معاشی صف بندی کا کام انفرادی نہ ہو اور سماجی رفاہی تنظیموں کے سپرد نہ کیا جائے۔ یہ خالص دینی کام ہے جس کو مساجد پر مرتکز ہونا چاہیے اور جس کی ذمہ داری اسلامی جماعتوں کو اٹھانا چاہیے یہ ضروری ہے کہ اس کام میں ایسے اداروں سے کوئی مدد نہ لی جائے جو زر کے بازار اور سرمایہ کے بازار سے متعلق ہیں۔ (مثلاً اسلامک بینکس، مضاربہ کمپنیاں، لیزنگ ایجنسیاں وغیرہ) ان احتیاطوں کے بغیر للٰہیت کو فروغ نہیں دیا جا سکتا اور اس قسم کا کام بہت جلد خود غرضی، حرص اور حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔

(۲) اللہ کے فضل وکرم سے آج پاکستان کے ہر بڑے صنعتی اور مالیاتی اداروں میں اسلامی مزدور یونینیں موجود ہیں۔ ہمارے جیالے کارکن تحریک اسلامی کا ہراول دستہ ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آگے بڑھ کر سرمایہ داری کے مضبوط ترین مورچوں پر قبضہ کریں گے اور ان پر اسلام کا سبز ہلالی پرچم بلند کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ظلم اور استحصال کے عینی شاہد ہیں اور سرمایہ دارانہ مکاری کا مدت دراز سے نہایت نامساعد حالات میں دلیرانہ مقابلہ کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری مزدور تنظیمیں حقوق کی سیاست کو شرح صدر کے ساتھ رد کریں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کے حقوق کے تحفظ سے سرمایہ داری مستحکم ہوتی ہے۔ اسلامی مزدور تنظیموں کو تمام سرکاری اور غیر سرکاری جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی مینجمنٹ میں شمولیت کی سعی کرنی چاہیے تاکہ یہ کمپنیاں اسلامی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اپنی پالیسیاں بنائیں۔ زر کے بازار اور سرمایہ کے بازار سے ان کا تعلق کم ہو اور کالے دھندوں اور کرپشن سے دست کش ہوں اور مزدوروں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کا حقیقت میں کوئی ملک نہیں اور مزدور کو مینجمنٹ کے اہداف اور حکمت عملی متعین کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ یہ صورت سرکاری کمپنیوں کی بھی ہے۔

(۳) سرمایہ داری کی قومی سطح پر ضرب کاری اسلامی ریاست ہی لگائے گی اس ضمن میں سب سے پہلی بات جس کو سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلامی انقلابیوں کو آزاد معیشت کو عام کرنے اور نج کاری کی پالیسی کی بھرپور مخالفت کرنی چاہیے۔ آزاد معیشت کی پالیسیاں قومی ریاست کو کمزور کر کے بین الاقوامی سرمایہ کا تسلط ملکی معیشت پر قائم کرنا چاہتی ہیں اور صرف ملک اور قوم کے غدار ہی ان پالیسیوں کے حامی ہو سکتے ہیں (سوائے ان بھائیوں کے جو ان پالیسیوں کی اصلیت سے ناواقف ہوں) اگر بین الاقوامی سرمایہ کا تسلط ملکی معیشت میں پوری طرح ضم ہو گیا تو یہاں اسلامی ریاست کا قیام ناممکن ہو جائے گا۔ اسلامی ریاست استعماری نظام سے تعلقات منقطع کرے گی تاکہ اس نظام کے خلاف مؤثر جہاد ممکن ہو۔ اسلامی ریاست کو لازماً سود کے بازار اور سٹہ کے بازار کو یکسر ختم کرنا ہوگا اور سرمایہ دارانہ تصور ملکیت کو رد کر کے شخصی ملکیت کی اسلامی خطوط پر احیاء کی کوشش کرنا ہوگی۔ یہ ایک طویل المدت کام ہے جو مزدور یونینوں اور عوامی معاشی اداروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ مارکیٹ

محمد یونس قادری

سرمایہ کیا ہے؟

سرمایہ میں اور دولت میں فرق ہے۔ سرمایہ کا تعلق آزادی سے ہے جبکہ دولت کا تعلق جائز اور ناجائز حرام و حلال سے ہے۔ سرمایہ نفس کی وہ خواہش ہے کہ سرمایہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ سرمایہ دراصل بڑھوتری برائے بڑھوتری ہے۔ یہ تکاثر ہے۔ سرمایہ نفس کی خواہش کہ دنیا کا حریص ہو اور اس کے حصول کے لئے آپس میں حسد کرے۔ سرمایہ آزادی کا دوسرا نام ہے۔ سرمائے میں آزادی کا مطلب ہے کہ حلال وحرام اور جائزہ وناجائز کی تمیز نہ رکھی جائے۔ آزادی کن کو حاصل ہوتی ہے ان کو جن کے پاس سرمایہ زیادہ ہو۔ جب آپ آزادی کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں تو آپ اپنی خواہشات کی اتباع اس دنیا میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے عملی طور پر جس خواہش کے لئے کارفرما ہوتے ہیں اور جس مقصد کے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پروان چڑھاتے ہیں وہ سرمائے کا حصول ہے۔ سرمائے کی خواہش کے بغیر آزادی کی خواہش ناممکن ہے۔ اس لئے مغربی تصور آزادی کی عملی تعبیر سرمائے کی خواہش ہے۔ ایک آزاد شخص یا گروہ جس چیز کا طالب ہوتا ہے وہ سرمایہ ہے اس کی زندگی کا مقصد سرمایہ ہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے ہی وہ آزادی کو ممکن بنا سکتا ہے۔

سرمائے اور دولت میں فرق:

سرمایہ جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ خواہش کا نام ہے یہ وہ خواہش ہے جو خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہوتی ہے۔ وہ سرمایہ جو کہ متشکل ہو کسی بھی اجزا میں وہ دولت بن جاتی ہے۔ یہ دولت جو کہ سرمائے کی بڑھوتری کے نتیجے میں حاصل ہوگی یہ حرام دولت اور سودی دولت ہوگی۔ اس کے برعکس اگر حلال طریقہ اور ذرائع سے حاصل ہو تو وہ دولت حلال دولت ہوگی۔

مارکیٹ کیا ہے؟

مارکیٹ وہ جگہ ہے جہاں پر سرمائے کے طلب گار آزادی کے حصول کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں اسی لئے مارکیٹ کا تعلق سرمائے سے ہے۔ اس کی خصوصیت میں ہم تفصیل سے دیکھیں گے کہ مارکیٹ پورے معاشرے کو کس طرح اپنے تابع کر لیتی ہے۔ مارکیٹ کا تعلق اس خاص قسم کے معاشرے سے ہے اور اس میں نشوونما پانے والے اداروں سے ہے۔

مارکیٹ اور بازار میں فرق:

ہم جس اصطلاح کو عام طور پر مارکیٹ کے مماثل سمجھتے ہیں وہ بازار ہے۔ بازار اور مارکیٹ میں بنیادی فرق ہے۔ بازار کا تعلق سرمایہ داری سے نہیں ہے بلکہ ماقبل سرمایہ داری بھی اسکا وجود تھا۔ بازار وہ ادارہ ہے جس کا تعلق مخصوص تہذیب' اخلاقیات اور مذاہب سے ہے۔ بازار معاشروں کی تعمیر نہیں کرتا بلکہ بازار پہلے سے قائم معاشرتی قدروں کے تابع ہوتا ہے۔ بازار مارکیٹ کے مقابلے میں معاشرتوں کا ایک بہت قلیل حصہ ہوتا ہے۔ جبکہ مارکیٹ پورے معاشرے کے اندر غالب قدر ہوتی ہے اور وہ ہی معاشرتی قدروں کو متعین کرتی ہے۔ اسلامی معاشروں میں بازار ہوتے ہیں۔ جن میں حرام وحلال کی تمیز ہوتی ہے۔ اسلامی مارکیٹ کبھی نہیں ہوسکتی کیونکہ مارکیٹ کے معیارات سرمایہ داری سے متعلق ہیں۔ اسلامی مارکیٹ ایک غلط عقیدہ ہے۔ اب ہم مارکیٹ کے خواص کا جائزہ لیں گے کہ مارکیٹ کن خواص رویوں کو پروان چڑھاتی ہے۔

مارکیٹ کی خصوصیت:

1۔ مارکیٹ کا غلبہ

مارکیٹ پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے مارکیٹ جہاں پر آزادی کو فروغ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے رجحان کو پورے معاشرے پر غالب کر دیتی ہے۔ اور معاشرتی قدریں کسی اور بنیاد پر نہیں طے ہوتیں بلکہ وہ مارکیٹ کے نافذ کردہ اقدار پر استوار ہوتی ہیں۔ مارکیٹ برخلاف بازار کے صرف معاشی اداراتی صف بندی نہیں کرتی بلکہ معاشرے کے ہر پہلو کو اپنے تابع کر لیتی ہے ایک مذہبی معاشرہ جس کی بنیاد محبت اور بھائی چارہ پر استوار ہوتی ہے۔ مارکیٹ ان اقدار کی جگہ غرض' حرص وحسد کو پروان چڑھاتی ہے۔ ان بنیادوں پر جو معاشرہ استوار ہوتا ہے اس کو سول معاشرہ (Civil Society) کہتے ہیں۔ مارکیٹ جس معاشرے کو جنم دیتی ہے وہ سول معاشرہ ہوتا ہے سول معاشرے میں پورا معاشرہ دراصل مارکیٹ بن جاتا ہے جہاں پر تعلقات کی بنیاد معاہدوں پر رکھی جاتی ہے۔ ایسے معاشرے میں خاندانی رشتے ناتے ٹوٹ جاتے ہیں اس لئے کہ خاندان کی بنیاد غرض اور معاہدہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد محبت وایثار ہوتی ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی شوہر یہ تمام رشتے جب غرض کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیاد پر قائم ہوتے ہیں تو خاندانی نظام تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ مغربی ممالک میں ہو رہا ہے اور ہر اس ملک میں ہوتا ہے جہاں سرمایہ داری کو فروغ ملتا ہے۔

2۔ مارکیٹ میں ہر خواہش مساوی اور جائز ہوتی ہے مگر ترتیب سے نہیں ہوتی

مارکیٹ میں آزادی کے فروغ کا مطلب یہ ہوا کہ آپ آزاد ہیں جو چاہنا چاہیں چاہ سکیں۔ اس طرح مارکیٹ میں ہر شخص مساوی ہے وہ چاہے نماز پڑھے یا شراب پیے یا بیچے، دونوں عمل اس لئے جائز ہیں کہ انہیں آپ نے آزادانہ خواہش کی اتباع کرتے ہوئے کیا ہے۔ جب ہر خواہش جائز اور مساوی ہوئی تو پھر کسی خواہش کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ آپ خواہشات کی کوئی بھی ترتیب رکھ سکتے ہیں۔ مگر عملی طور پر آپ ہر اس خواہش کو اولیت دیتے ہیں جو کہ سرمائے کے ارتکاز میں معاون و مددگار ہو۔ مثلاً آپ اپنا تمام وقت تفریحات میں نہیں گزار سکتے کہ اس کی بنیاد پر آپ کو سرمائے میں بڑھوتری کے مواقع کم ملیں گے اس لئے آپ پابند ہیں کہ آپ کاروبار دفتر اور تعلیم پر بھی اپنا وقت صرف کریں۔ مارکیٹ میں آپ سرمائے کے غلام ہو کر اس خواہش کو کرنے کے پابند ہیں جو کہ آپ کے سرمائے میں اضافہ کرے۔

3۔ مارکیٹ نجی ملکیت کو ختم کر دیتی ہے:

سرمایہ داری یہ دھوکہ دیتی ہے کہ وہ نجی ملکیت کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہ تصور ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ نجکاری اور نجی ملکیت میں فرق ہے۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مارکیٹ کے اداروں کا جائزہ لیا جائے جو کہ نجکاری کے عمل کو پروان چڑھاتے ہیں۔ سرمایہ داری ایک فنانشل مارکیٹ کو پروان چڑھاتی ہے کارپوریشن اس فنانشل مارکیٹ کی روح رواں ہوتی ہے۔ سرمایہ داری میں جب بھی کوئی شے یا خدمات مارکیٹ میں آتی ہیں تو وہ کارپوریشن کے تحت پیداوار یا خدمات انجام دیتا ہے۔ کارپوریشن کے بغیر مارکیٹ تک رسائی نہیں ہوتی۔ کارپوریشن میں یا تو ملازمین ہوتے ہیں یا اس کے شیئر ہولڈرز۔

شیئر ہولڈرز وہ ہوتے ہیں جو اس کمپنی کے مالک تصور کیے جاتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے کہ جو بھی اسٹاک مارکیٹ سے اس کمپنی کے شیئرز خرید لے وہ شیئر ہولڈر کہلائے گا۔ ان کے علاوہ ملازمین میں ایک مینیجر اور دوسرے دیگر عملہ یا مزدور شامل ہیں اس کارپوریشن کو چلانے کی تمام ذمہ داری مینیجرز پر ہوتی ہے۔ وہی دیگر ملازمین رکھتے اور نکالتے ہیں اور وہی فیصلہ کرتے ہیں۔ شیئر ہولڈر کا کمپنی کے معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ زیادہ تر بیچارے شیئر ہولڈرز کو کمپنی کے بارے میں بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ کہاں ہے اور کام کیسے انجام دیتی ہے۔

مینیجرز جو تمام کمپنی کو چلانے کا مجاز ہوتا ہے وہ فیصلے ان بنیادوں پر کرتا ہے کہ کمپنی کے منافع/سرمائے میں اضافہ ہوا، گر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر وہ بھی ملازمت سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ شیئر ہولڈرز، مینیجر اور مزدور تمام

کے تمام اسی جستجو میں ہوتے ہیں کہ سرمائے کو کس طرح بڑھائیں۔ حلال اور حرام کی تمیز کے بغیر اصل مقصد کارپوریشن کے منافع محض کو بڑھانا ہوتا ہے اس طرح ملکیت نہ تو شیئر ہولڈرز کی ہوئی نہ ہی مینیجرز کی اور نہ ہی مزدوروں کی تو پھر مارکیٹ میں ملکیت کس کی ہوتی ہے؟ دراصل مارکیٹ میں ہر شخص ایک ہی کا غلام بندہ ہوتا ہے اور وہ سرمایہ ہے اسی لئے ملکیت بھی سرمائے کی ہوئی۔ کارپوریشن جو کہ سرمائے کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ وہ ایک نئی قسم کی شخصیت کو قائم کرتی ہے جس کو شخص قانونی (Corporate Porsonality) کہتے ہیں۔ یہ ایسا شخص قانونی ہے جو قلاش تو ہو سکتا ہے مر نہیں سکتا ذاتی ملکیت میں کسی شخص کی ملکیت ہوتی ہے وہ اگر مر جائے تو ملکیت تقسیم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تصور ملکیت میں یہ ناممکن ہے۔ اس طرح ذاتی ملکیت کا خاتمہ کارپوریشن کے ذریعہ ہوتا ہے۔

4۔ مارکیٹ میں ہر شخص مزدور بن جاتا ہے:

جب ملکیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر ہر شخص ملازم بن جاتا ہے اور کارپوریشن میں ہر شخص ملازم ہوتا ہے یعنی ہر شخص اجرت کمانے والا بن جاتا ہے۔ سرمایہ داری میں ہر شخص مزدور بن جاتا ہے اور اپنی خدمات کو بیچتا ہے جس کے عوض اس کو اجرت ملتی ہے جب سب لوگ مزدور بن گئے تو وہ غلام بن گئے اس کے جس نے اس کے وقت کو خریدا۔ وہ اس وقت کے اندر آپ سے جو چاہے کروائے آپ اس کے پابند ہیں۔

5۔ اصل بازار سود اور سٹے کا بازار ہوتا ہے:

مارکیٹ دو طرح کی ہوتی ہے ایک فنانشل مارکیٹ اور دوسری اشیاء کی مارکیٹ: فنانشل مارکیٹ وہ مارکیٹ ہے جہاں سود اور سٹہ کے بل بوتے پر زر اور اسٹاک کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اشیاء کی مارکیٹ میں اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ مارکیٹ میں فوقیت چونکہ سرمائے کی بڑھوتری کو حاصل ہوتی ہے اس لئے سرمایہ خود اپنی تلاش میں سرگرداں فنانشل مارکیٹ کو اپنا محور اور مرکز بناتا ہے۔ اس لئے کہ زر اور اسٹاک دونوں ہر لمحے بغیر پیداوار کے عمل میں شریک ہوئے تیزی سے سود اور سٹہ کی بنیاد پر بڑھتے ہیں۔ پیداوار جو کہ سرمایہ دار کی مجبوری ہوتی ہے اس کے لئے بھی اس کو سودی قرضے اور اسٹاک مارکیٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جتنا مارکیٹ کا رجحان غالب ہوگا اتنا ہی سود اور سٹہ کا بازار پیداواری عمل پر غالب آ جائے گا اور فنانشل مارکیٹ کی فوقیت پیداواری مارکیٹ کے اوپر ہوتی جائے گی۔ جیسا کہ کسی بھی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں دیکھ سکتے ہیں۔ فنانشل مارکیٹ پیداوار کی مارکیٹ سے کئی گنا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

6۔ سود اور سٹے کے بازار کا غلبہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب فنانشل مارکیٹ کا غلبہ ہوگا تو اس کا مطلب ہی یہ ہوگا کہ سود اور سٹے کے تحت ہی مارکیٹ میں قدر طے ہوگی۔ فنانشل مارکیٹ جو کہ زر اور سرمائے کی مارکیٹ کا مرکب ہے۔ زر کی مارکیٹ میں زر کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اور زر کی قدر و قیمت سود کی ہوتی ہے۔ اور سرمائے کی مارکیٹ میں شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور یہ خرید و فروخت سٹے کی بنیاد پر ہوتی ہے اس طرح سود اور سٹہ کا غلبہ پورے معاشرے پر ہوتا ہے کہ مارکیٹ کا رجحان پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

سرمایہ داری میں ہر شے کی قدر قیمت سے متعین ہوتی ہے وہ شے زیادہ قابل قدر ہوگی جس کی زیادہ قیمت ہوگی۔ شے کسی بھی جگہ ہو اس کی قدر فنانشل مارکیٹ میں طے ہوگی اور اس طرح ہر شے کی قدر سود اور سٹے کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے۔

یہ تو مارکیٹ کے چند خواص تھے اب ہم مارکیٹ کی تاریخ کو دو ادوار میں بانٹ کر دیکھتے ہیں ایک دور کو فورڈ ازم اور دوسرے دور کو پس فورڈ ازم کہتے ہیں۔

فورڈ ازم کا دور 1933 سے 1980 تک کا دور

یہ سرمایہ کاری کا ابتدائی دور ہے یہ دور دونوں جنگ عظیم اور یورپ کے اندر عظیم کساد بازاری 1930 کے بعد کا دور ہے۔ اس دور کا عروج 1945 جنگ عظیم دوئم کے بعد ہوا۔ سرمایہ داری جیسا کہ ہم نے دیکھا اس کا تعلق مغربی ثقافت سے ہے۔ مغربی ثقافت کے عروج کے ساتھ ہی سرمایہ داری کو عروج حاصل ہوا اس سے پہلے نہ ہی مارکیٹ کا تصور تھا اور نہ ہی سول معاشرہ تھا۔ تاریخ کے اس مطالعہ میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح سرمایہ داری اپنے اندر سے پھوٹنے والے چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی ساخت میں تبدیلیاں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر یہ بھی دیکھیں گے کہ سرمایہ داری خود جن اقدار کے اوپر پرورش پاتی ہے ان اقدار کو امر بیل کی طرح خود اپنے ہاتھوں برباد کر کے نئے ادارے اور اقدار قائم کرتی ہے۔ اس طرح سرمایہ داری خود اپنی بربادی (Self distruction) کا سامان کرتی ہے۔ اور پس فورڈ ازم اس کی شکست اور بربادی کا ہی دور ہے۔

فورڈ ازم کے دور میں اس کو جس سب سے بڑے چیلنج کا سامنا تھا وہ اشتراکیت تھا۔ اور اشتراکیت میں بھی مزدور اجتماعیت سے اس کو اصل خطرہ تھا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا کہ سرمایہ داری ہی کی وجہ سے مزدور اجتماعیت پیدا ہوئی اشتراکیت جو کہ مغربی ثقافت سے ہی نکلنے والا شجر تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ آزادی کا حصول اس وقت ممکن ہے جب مزدوروں کو کارپوریشن کے منافع میں برابر کا حصہ ملے۔ وہ سرمایہ دار کو مزدوروں کے حق میں ڈاکہ ڈالنے والا تصور کرتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے ملاحظہ کریں گے۔

اس دور میں عیسائی اجتماعیت کی جگہ جن دو اجتماعیتوں کو سرمایہ داری نے مارکیٹ کے فروغ کے لیے استعمال

کیا ایک مزدور اجتماعیت اور دوسری قومی اجتماعیت (Nationalism) تھی۔

پس فورڈ ازم 1980 کے بعد کا دور

پس فورڈ ازم کا دور سرمائے کی مکمل آزادی کا دور ہے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی قائم کردہ دو اجتماعیتوں کو خود اپنے ہاتھوں ختم کر دیا۔ ایک مزدور اجتماعیت جو کسی نہ کسی صورت میں سوشل ڈیموکریٹک کی صورت میں موجود تھی وہ مکمل ختم ہوگئی اور دوسرا بریٹن ووڈ سسٹم ناکام ہوگیا اور سرمایہ ریاست کے تابع ہونے کے بجائے ریاست سرمائے کے تابع ہوگئی۔

مزدور اجتماعیت:

"یورپ میں سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اثرات کو زائل کرنے کے لیے جو اجتماعیت قائم ہوئی اس کو سوشل ڈیموکریٹ کہتے ہیں۔"

یہ ایک سیاسی صف بندی تھی جو مزدوروں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگئی کہ سرمایہ داری تمہارے لیے خطرہ نہیں ہے۔ تم سرمایہ داری میں رہتے ہوئے اجتماعی سودے بازی کے ذریعے اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہو۔ اس طرح اس تحریک کے نتیجے میں مزدور نے اپنی بقا سرمایہ داری میں جانی اور سرمایہ داری میں شمولیت کے نتیجے میں مزدور اجتماعیتیں سیاسی طور پر کمزور ہوگئیں۔ سرمایہ داری نے اس دور میں اپنا دوسرا حلیف بنایا جو کہ ریاست تھی اس دور میں ریاست کی ذمہ داری تھی کہ وہ سرمائے کی پشت پناہ ہو۔ سرمایہ کی بڑھوتری برطانیہ جرمنی جاپان کے اندر ہوتی اور سرمایہ جاپانی، برطانوی سرمایہ کہلاتا۔ سرمائے کے پیچھے ایک سرمایہ دارانہ ریاست ہوتی جو کہ سرمایہ کا دفاع کرتی۔

فورڈ ازم کے دور میں مزدور اجتماعیتیں سوشل ڈیموکریٹ کی وجہ سے باقی رہیں بس ان کی حیثیت تبدیل ہوگئی ان کی حکومت میں شرکت کے نتیجے میں مزدور انقلابی عمل سے دور ہوگئے اور وہ مکمل طور پر سرمایہ داری میں شریک ہو گئے ایسی حکمت عملی کے نتیجے میں اشتراکیت کو مغرب میں شکست ہوئی۔ اشتراکیت مزدور اجتماعیتوں کو متحرک ہونے اور قربانی دینے پر آمادہ نہ کر سکی اس لیے یہ تحریکیں پرامن اور بے جان ہو کر رہ گئیں۔

ریاست کی سطح پر جو نظام قائم تھا اس کو بریٹن ووڈ نظام کہتے ہیں اس میں مالیاتی نظام کو چلانے کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا گیا جس کو آئی ایم ایف کہتے ہیں اس ادارہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ ممبر ممالک کو اس مالیاتی نظام کے تابع کریں جس کے نتیجے میں سرمایہ ان ممالک میں پروان چڑھ سکے۔ مگر جب سرمایہ ریاست میں پروان چڑھنے لگا تو پھر وہ آزاد نہ رہا اور وہ مقید ہوگیا ریاست کی چار دیواری میں۔ ریاست اس سرمائے کو ایسے استعمال کرتی جس سے ریاست کو فائدہ ہو نہ کہ سرمایہ جس میں اضافہ ہو۔ سرمایہ چونکہ کسی کا پابند نہیں ہے تو 1980

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک ریاست اور مزدوروں کے ساتھ مجبوری کے تحت رہا مگر یہ مجبوری سوشلزم اور قوم پرستی کی کمزوری کے نتیجے میں رفع ہوگئی اور 1980 کے بعد کا پس فورڈازم دور اس کی مکمل آزادی کا دور ہے۔

مزدور اجتماعیت کا خاتمہ:

مزدور اجتماعیت جو کہ اجتماعی سودے بازی کے ذریعہ اپنا حق سرمایہ دار سے لیتی تھی۔ اس پس فورڈازم کے دور میں وہ اس سرمایہ دارانہ نظام میں شامل ہوگئی اور اجتماعی سودے بازی کی جگہ ہر مزدور انفرادی طور پر اپنی اپنی اجرت کمپنی میں طے کرنے لگا جس کو مکمل معیاری مینجمنٹ یا انسانی ذرائع کی مینجمنٹ کہتے ہیں۔ اس میں ہر کمپنی خود اپنے مزدور کو منظم کرتی ہے۔ مزدور بذات خود سرمایہ بن جاتا ہے اسے آپ انسانی سرمایہ کہتے ہیں انسانی سرمایہ کا مطلب یہ ہے کہ مشین اور زمین کی طرح انسان بھی سرمایہ ہے۔

ان نظریات کی پذیرائی کے نتیجے میں مزدور اپنے آپ کو سرمائے میں ضم کرلیتا ہے اور ہر شخص کا ذاتی فائدہ اس میں ہوتا ہے کہ سرمائے میں اضافہ ہوتا رہے دونوں مزدور اور آجر سرمائے کے خادم اور غلام بن جاتے ہیں اور اس طرح اجتماعی سودے بازی اور اجتماعی حقوق وغیرہ بالکل لاحاصل ہوجاتے ہیں۔ مارکیٹ ریاست کی سطح سے بلند ہوجاتی ہے۔ اور کارپوریشن کے اثرات ریاستی پالیسیوں پر بڑھتے جاتے ہیں۔ نجکاری کے نام پر سرمائے کی حاکمیت ہر ادارے پر قائم ہوجاتی ہے۔ ریاست ان منصوبوں کی توثیق کرتی ہے جس سے سرمائے میں اضافہ ممکن ہو تمام ریاستیں ماسوائے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سرمائے کی باجگزار اور محکوم ریاستیں بن جاتی ہیں۔ یہ دور ایک طرح ریاستوں کی کمزوری کا دور ہے سرمائے کی آخری اجتماعیت ریاست کے کمزور ہونے کے ساتھ سرمایہ کوئی دوسری ایسی اجتماعیت قائم کرنے سے قاصر رہی جس کے ذریعہ وہ اپنا دفاع کرسکے۔ کارپوریشن جو کہ خود اجتماعیت کو ختم کرتی ہیں سرمائے کے دفاع سے قاصر ہیں۔ اس لیے سرمایہ داری اپنے آپ کو خود تباہی سے دوچار کررہی ہے۔ ان تاریخی حقائق سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے آپ کو سرمائے (مارکیٹ) کے سپرد کردیا تو پھر ہم بھی سرمائے کے مطیع اور بندے بن جائیں گے اور تباہی و بربادی ہمارا مقدر بن جائے گی۔ اس لیے ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ ہم مارکیٹ کی جگہ اسلامی بازار کو فروغ دیں۔ زر اور اسٹاک کی مارکیٹ سے ناتا توڑ کر اپنے لیے ایک جداگانہ مالیاتی نظام کو کھڑا کریں جو کہ مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے زیر اثر ہو۔

www.KitaboSunnat.com

معاشیات ایک مضمون اور سرمایہ داری ایک عالمی تہذیب / نظام

معاشیات اور سرمایہ داری

سید محمد یونس قادری

سوشل سائنسز کی طرح معاشیات کا تعلق بھی سرمایہ داری کی علمیت سے ہے۔ اسی تناظر میں ہم سب سے پہلے معاشی نظریات کو پرکھیں گے اور ان کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں گے نیز اس سے پھوٹنے والے اداروں پر نظر ڈالیں گے۔ آخر میں سرمایہ داری کے سائے میں پروان چڑھنے والی اسلامی معیشت کا تنقیدی جائزہ بھی لیں گے۔

جدید معاشیات کی بنیاد بحیثیت سوشل سائنس کی علمیت کے اٹھارویں صدی میں رکھی گئی۔ اس کا سہرا مشہور معیشت دان ایڈم اسمتھ کے سر ہے۔ ایڈم اسمتھ جو کہ دور تنویر کا ایک مفکر ہے اس نے لاک اور ہیوم جو دور تنویر کے بہت اہم فلسفی ہیں سے متاثر ہوکر معاشیات پر اہم تصانیف مرتب کیں۔ جس میں "The theory of moral sentiment", "Inquiry into the nature causes of wealth of nation" قابل ذکر ہیں۔ دور تنویر کے اس ابتدائی دور کو معاشیات کلاسیکل دور تصور کرتی ہے اس کا دورانہ 1729-1930 تک کا ہے۔ اس دور کے دیگر مشہور مفکرین میں ڈیوڈ ریکارڈو (1772-1823) جس نے نظریہ پیداوار نظریہ قدر پر قابل ذکر کام کیا۔ ماتھیوس نے رکارڈو کے نظریہ پیداوار کو مدنظر رکھ کر آبادی کو مسئلہ بناتے ہوئے نظریات پیش کیے اور جون اسٹیورڈ مل نے افادے کے نظریات کے ذریعے تسکین اور لذت پسندی کو معیشت کی بنیاد بنایا۔ الفرڈ مارشل (1842-1924) نے افادہ کو بنیاد بنا کر طلب اور رسد کے نظریات کی داغ بیل ڈالی۔ کلاسیکل دور میں ایک تبدیلی رونما ہوئی جب اولالذکر مفکرین جو کہ لبرل نظریات کے حامل ہیں ان کے نظریات پر اشتراکیت اور کمیونزم کے نظریات نے بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان نظریات پر علمی کام کا سہرا کارل مارکس (1818-83) کے سر ہے۔ کارل مارکس نے انجلز کے ساتھ مل کر 1840 میں کمیونزم کا دستور بھی لکھا اور 1867 میں اس نے اشتراکیت پر مشہور زمانہ کتاب ''ڈاس کیپٹل'' تحریر کی۔ اس کے نظریات کا مکمل جائزہ اگلے ابواب میں آئے گا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتداء میں روبن سن (1898-1971) نے معاشیات کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جامع تعریف کی اور معاشیات کو سائنسی علوم گردان کر اس بات پر ایمان مستحکم کیا کہ اصل مقصد حیات زیادہ سے زیادہ خواہشات کا حصول ہے اور ان کے حصول کے ذرائع کو بڑھانا اصل میں مقصود معاشیات ہے۔

کلاسیکل دور جو کہ 1730 سے 1930 تک جاری رہا ان مفکرین میں کارل مارکس کو نکال کر معاشیات کو لبرل سرمایہ داری کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ یہ مفکرین دور تنویر کے نظریات ہی کے مطیع تھے۔ اس دور میں معاشیات کو بحیثیت مغربی افکار اور علم کی اس سطح پر مرتب کیا کہ لوگوں کا ایمان مغربی افکار پر مستحکم ہو جائے اور وہ فردی کی سطح پر معاشرتی سطح پر اور ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ عقلیت پر ہی ایمان لے آئیں جس میں اوپر دیے گئے تمام مفکرین کافی حد تک کامیاب رہے۔ اس دور میں مغربی عوام کا ایمان عیسائیت سے ختم ہو کر تنویری افکار پر ہو گیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ فردی معاشرتی اور ریاستی سطح پر معاشیات کا مضمون کیا نظریات پیش کرتا ہے۔

فردی کی سطح:

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ مغربی تنویری مفکرین اس بات پر ایمان لے آئے تھے کہ فرد انفرادی طور پر لذات کا پیروکار ہے اور وہ اپنی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنا چاہتا ہے معاشیات میں جو مفروضات اور نظریات اس کو حق ثابت کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

تعقل (Rationality):

یہ عقلی تقاضہ ہے کہ ہر شخص اپنی خواہشات کی اتباع کرے۔ اس مفروضے کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشیات میں جو نظریات قائم کیے ہیں ان کو صارف کا رویہ یا نظریات کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو سب سے پہلے ایڈم اسمتھ اور بعد میں تفصیل کے ساتھ بینتھم اور ملز نے نظریہ افادہ میں بیان کیا۔ بینتھم لذات کی بڑھوتری اور تکالیف میں کمی (Maximization Of Pleasure And Minimization Of Pain) کو بنیادی مقصد حیات تصور کرتا ہے۔ ملز نے تسکین کی مقدار پر زور دیا کہ کون سا عمل زیادہ تسکیل دیتا ہے اور کونسا کم۔ نظریہ طلب و رسد کو الفرڈ مارشل اور ملز نے اسی نظریہ افادے کے ذریعہ وضع کیا ہے اس کے مطابق ہر شخص اپنی لذات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنا چاہتا ہے مگر اس کی خواہشات میں وہ مسائل رکاوٹ ہیں جن کی وجہ سے فرد اپنی خواہشات پوری نہیں کر سکتا ہے۔ آپ اچھے سے اچھا مکان، گاڑی اور پرتعیش چیزیں لینا چاہتے ہیں مگر آپ کے پاس اس کی قوت خرید نہیں ہے یعنی آمدن اور قیمت وہ دو بنیادی رکاوٹیں ہیں جو آپ کی خواہشات کے آڑے آتی ہیں۔ قیمت جتنی کم ہو گی اتنی آپ زیادہ اشیاء کو طلب کر سکتے ہیں اس کے برخلاف کم۔ اس طرح سے اس نے نظریہ طلب کو ثابت کیا، کہ قیمتوں اور طلب میں منفی رجحان ہے۔ نظریہ طلب نظریہ افادہ سے نکلا ہے۔ یہ کوئی آفاقی قانون نہیں ہے۔ نظریہ

طلب ان معاشروں میں کبھی کارفرما نہیں ہو گا جہاں پر آپکا مطمع نظر لذات میں اضافہ نہ ہو۔ آپ حرام شے کو کبھی بھی استعمال نہیں کریں گے چاہیے آپ کو اس کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ ہو اور وہ کتنی سستی کیوں نہ ہو۔ اس کی طرح ایک اسلامی ریاست حرام و حلال کی تمیز کرے گی نہ کہ خواہشات کو پروان چڑھائے گی۔ ان نظریات کو ماننے اور تسلیم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ عقل اور نفس کو حلال و حرام کے متعین کرنے کا حقدار تسلیم کرتے ہیں اور وحی اور الہام سے انکار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ معاشیات میں دوسرا نظریہ رسد سے متعلق ہے یہ نظریہ سرمایہ داری کے اس تصور کا آئینہ دار ہے کہ بحیثیت سرمایہ دار آپ کا مقصد زیادہ سے زیادہ سرمائے کی بڑھوتری ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہر سرمایہ دار اس مقصد سے پیداواری عمل میں شامل ہو اور منافع محض میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکے۔ ہر پیداوار کنندہ منافع خور منافع میں اسی صورت زیادہ سے زیادہ اضافہ کرے گا جب کہ قیمت فروخت زیادہ ہو یا پیداواری لاگت کم سے کم ہو۔ یعنی سرمایہ دار رسد اس وقت زیادہ کرے گا جب قیمتیں زیادہ ہوں یا لاگت کم ہو اس کے برخلاف رسد کم کرے گا اس کو قانون رسد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو قانون طلب و رسد کا تعلق قیمت سے ہوا۔ وہ مقام جہاں پر طلب کرنے والے صارف اور رسد کرنے والے پیدوار کنندہ ملتے ہیں اس کو مارکیٹ کہتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں اشیاء و خدمات کی قدر متعین ہوتی ہے۔ قدر کو متعین کرنے میں ریکارڈو اور کنیز اس بات پر اتفاق کرتے تھے کہ قدر کو متعین کیا جاتا ہے مزدوری کی بنیاد پر۔ وہ شے جو کہ زیادہ مزدور لگا کر پیدا ہو زیادہ قدر یا قیمت والی ہے اس کے مقابلے میں جو کم مزدوری سے بنائی جائے۔ مگر نیو کلاسیکل مفکرین ملز مارشل اس نظریہ کو رد کرتے ہیں ان کے نزدیک قدر یا قیمت معین ہوتی ہے طلب و رسد کی رسہ کشی کے نتیجے میں، طلب کرنے والا کم قیمت پر زیادہ اشیاء لینا چاہتا ہے اور رسد کرنے والا کم قیمت پر کم رسد کرنا چاہتا ہے، مارکیٹ میں قیمتیں وہاں طے ہوں گی جہاں پر طلب اور رسد یکساں ہوں اس جگہ مارکیٹ توازن کی حالت میں ہو گی۔ اس نظریے کے تحت جو قیمت طے ہو گی اس کو مارکیٹ قیمت کہتے ہیں ان قیمتوں میں منصفانہ قیمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے کہ چاہے کوئی شے کتنی ہی سستی کیوں نہ پیدا کی جائے اس کی قیمت کا تعلق طلب و رسد پر ہے اگر پیداوار کنندہ اشیاء کی رسد کو کم کر دیں تو قیمتیں بڑھ جائیں گی اور اگر طلب کو بڑھا دیا جائے تو بھی قیمتوں میں اضافہ ہو گا یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں عادلانہ قیمتوں کے موجود نہ ہونے سے قیمتوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے کہ اصل طاقت کا سرچشمہ سرمایہ داری میں سرمایہ دار ہوتا ہے۔ قیمتیں طلب و رسد کی بنیاد پر طے نہیں ہوتیں بلکہ سرمایہ دار قیمتیں خود متعین کرتا ہے جو کہ بڑھتی رہتی ہیں، اس کی وجہ سے افراط قیمت (Inflation) ہمیشہ سے سرمایہ دارانہ ممالک میں ایک مسئلہ رہتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرہ:

ان نظریات کو ماننے کی وجہ سے جو اجتماعیت قائم ہوگی اس میں حرص وحسد، خودغرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی۔ معاشیات کے نظریات ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالیں گے جہاں درج بالا خصوصیات کو تقویت ملے گی اور جیسا کہ مارکیٹ کے باب میں دیکھا کہ اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ مارکیٹ کے تابع ہو کر سول معاشرہ تعمیر کرے گا۔

ریاست: (عدم مداخلت اور فنانشل مارکیٹ کا غلبہ)

ریاست سے متعلق کلاسیکل مفکرین کا خیال ہے (ماسوائے مارکس کے) ریاست کو معاشی معاملات میں عدم مداخلت کرنی چاہئے۔ مارکیٹ کے پورے معاشرے اور معیشت میں غلبے کے نتیجے میں فنانشل مارکیٹ کا غلبہ ہوگا جہاں سود اور سٹہ کی بازی گری ہوگی جب بھی معیشت عدم استحکام کا شکار ہوگی تو وہ خود بخود استحکام پر آجائے گی جس میں کلیدی کردار فنانشل مارکیٹ ادا کرے گی۔ کلاسیکل معیشت دان لبرل افکار سے متاثر ہو کر مارکیٹ کی آزادی کے قائل ہیں اور حکومت کی عدم مداخلت کو معیشت کے استحکام کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔

(دوسرا مرحلہ) کینزین معیشت:

1930 اور جنگ عظیم دوئم کے بعد جیسا کہ مارکیٹ میں دیکھا مغربی معاشروں میں تبدیلی آئی اور کلاسیکل نظریات کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ 1930 میں مغربی ممالک کو عظیم کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا۔ معیشت عدم استحکام کا شکار رہی اور استحکام خود بخود قائم نہ ہوسکا۔ سرمایہ داری اپنے زوال کے قریب تھی کہ لارڈ کینز نے معیشت سے متعلق انقلابی تصورات پیش کیے جن کی روشنی میں سرمایہ داری کو ایک نئی زندگی ملی۔ اسی لئے کینز کو سرمایہ داری کا دیوتا تصور کیا جاتا ہے جیسے کینز نے ثابت کیا کہ 1930 کی کساد بازاری سے نکالنے کے لیے ریاست کو مالیاتی پالیسی مستحکم کرنی ہوگی۔ معیشت میں سٹہ بازی تخمینہ گوئی کی وجہ سے بے روزگاری اور پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کساد بازاری سے نکالنے کے لیے سرمایہ دارانہ ریاست کی ضرورت ہے۔ 1930 سے 1970 کی دہائی تک سرمایہ دارانہ ریاست ہی سرمائے کے ارتکاز کو ممکن بناتی تھی اور جیسا کہ مارکیٹ میں دیکھا کہ سرمایہ ریاستی سرمایہ کہلاتا ہے جیسے برطانوی سرمایہ جرمن سرمایہ وغیرہ۔ فرد سے متعلق اور معاشرے سے متعلق کینزین کلاسیکل نظریات کا ہی حامل تھا مگر وہ برخلاف لبرل سرمایہ داروں کے سرمائے کو مرتکز کرنے کے لیے ریاست کی ضرورت کو اہمیت دیتا تھا۔ عالمی سرمائے کو مرتکز کرنے کے لیے عالمی زر کو قابو میں کرنے کے لیے عالمی ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ کینز کے ہی مشورے پر بریٹن ووڈ کانفرنس میں آئی ایم ایف کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا

گیا۔ آئی ایم ایف کا مقصد ممبر ممالک کو زر مبادلہ کے ذخائر میں کمی کو پورا کرنا ہے تاکہ شرح مبادلہ کو استحکام حاصل ہو۔ اس وقت تک شرح مبادلہ کا تعین کرنا ہر ملک کے مرکزی بینک ہی کی ذمہ داری تھی وہ اپنی معاشی صورتحال کے پیش نظر رکھتے ہوئے شرح مبادلہ متعین کرتا تھا۔ بریٹن ووڈ سسٹم کی کوشش تھی کہ زر مبادلہ کے تعین میں آئی ایم ایف کردار ادا کرے اور اس کے لیے ایس ڈی آر محفوظات کا اجراء کیا جو کہ سونے کے مبادلے کی جگہ استعمال ہوں گے۔

نیوکلاسیکل نظریات: (تیسرا دور)

کینزین معیشت کا یہ دور 1960ء کے بعد سرمایہ دارانہ معیشت کو استحکام دینے سے قاصر رہا بریٹن ووڈ سسٹم تباہی سے دوچار ہوا اور اس کی جگہ جس نظام معیشت نے لی اس کو نیوکلاسیکل سسٹم کہتے ہیں۔ یہ دور پس فورڈ ازم کے ساتھ کا دور ہے اور اب تک جاری ہے اس کے مفکرین میں فریڈمین، لوکاس اور سارجنٹ ہیں۔ نیوکلاسیکل مفکرین کلاسیکل معیشت دانوں کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ معیشت میں حکومتی عدم مداخلت ضروری ہے۔ اس دور میں سرمایہ ریاست کی سطح سے بلند ہو کر آزاد ہوجاتا ہے اور کارپوریشن کی بالادستی قائم ہوجاتی ہے چناچہ یہ دور معیشت کی آزادی کا دور ہے۔ اس دور میں فنانشل مارکیٹ مملکتوں کی حدود کو پار کر کے اپنے منافع محض کے لیے کام کرتی ہیں۔ سرمائے کی محافظ ریاستیں، عیسائیت کی طرح اس دور میں کمزور کر دی جاتی ہیں سرمایہ داری اپنی اس خصوصیت کو برقرار رکھتی ہے کہ جس کے بل بوتے پر وہ مستحکم ہوتی ہے اس ہی ادارے کو آخرکار ہضم کرجاتی ہے۔ پہلے عیسائیت جس نے سرمایہ داری کو جلا بخشی اس کو مغربی معاشرے سے بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد مغربی ریاستوں نے اس کو سہارا دیا نیوکلاسیکل دور میں اس کو بھی تباہ کیا جارہا ہے۔ ریاستوں کی جگہ سرمایہ داری اب کسی اجتماعیت کو قائم کرنے سے قاصر ہے جو کہ اس کا دفاع کرسکے۔ کارپوریشن تو انفرادیت کو جنم دیتی ہیں اس لیے یہ دور سرمایہ داری کی پسپائی کا دور ہے چنانچہ مملکت کو سرمائے پر بالادست کیا جائے گا بلکہ کارپوریشن کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ سرمائے کو سیال کر کے جہاں منافع زیادہ ہو وہاں لے جائے۔ ریاست کی عدم موجودگی میں سرمائے کو ایک محافظ کی ضرورت ہوگی وہ محافظ عالمی سرمایہ دارانہ ریاست امریکہ کو تصور کیا گیا۔ اس کو تفصیل کے ساتھ ''عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکا'' میں دیکھیں گے۔

فرد کی سطح پر نیوکلاسیکل جس نظریہ کو پروان چڑھاتی ہے کہ فرد کی آزادی ہی ہے مگر فرد کی تعقل اس کو کسی تجربہ سے یا کسی مشاہدے سے حاصل نہیں ہوتی جس کا قائل کینز تھا اس کو (Adaptive expectation) کہتے ہیں۔ نیوکلاسیکل حضرات چوں کہ انسان کو خدا تصور کرتے ہیں اس لیے جو بھی فیصلہ یہ انسان کرنے گا وہ درست ہوگا اس کو Rational expectation کہتے ہیں۔ نیوکلاسیکل جس قسم کی سرمایہ داری کے فروغ کی خواہاں ہے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں فرد آزاد ہے۔معاشرہ سول معاشرہ اور معاشی معاملات کارپوریشن کے زیر اثر آزاد ہیں۔اس دور میں تینوں فرد معاشرہ اور ریاست مکمل طور پر سرمائے کے غلام ہیں۔

یہ تو سرمایہ داری سے معاشیات کا تعلق تھا۔معاشیات اپنے مختلف ادوار میں سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے مختلف نظریات پیش کرتا ہے کبھی عیسائیت' کبھی ریاست کبھی کارپوریشن اور امریکا کا سہارا لیتا ہے معاشیات اسی لئے کوئی غیر اقداری مضمون نہیں ہے بلکہ یہ سرمایہ داری کے فروغ کا علم ہے،اس تناظر میں اب ہم اسلامی بینکاری کو فروغ دینے والے معیشت دانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس مغالطے کی وجہ سے کس طرح سرمایہ داری کو فروغ دے رہے ہیں۔

اسلامی معاشیات:

دو طرح کی سرمایہ داری کا تذکرہ ہم اس کتاب میں کر رہے ہیں ایک لبرل سرمایہ داری اور دوسری ریاستی سرمایہ داری یہاں میں ایک اور قسم کی سرمایہ داری کا ذکر کروں گا اس کو اسلامی سرمایہ داری کہتے ہیں جس کو عام طور پر اسلامی معاشیات کا نام دیا جاتا ہے۔جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا کہ سرمایہ داری مختلف ادوار میں کبھی مذہب کا سہارا لیتی ہے کبھی قوموں کا سہارا لیتی ہے اور آخر میں ان سے اپنا کام نکالنے کے بعد اپنے ہدف آزادی کے حصول کے بعد ان اجتماعیتوں سے جان چھڑاتی ہے۔سرمایہ داری نے جس طرح اپنے مغربی معاشرے میں اپنے ابتدائی دور میں پروٹسٹنٹ عیسائیت کا سہارا لیا اسی طرح وہ اسلامی معاشروں میں اسلام کا سہارا بھی لے رہی ہے۔اس کے لیے اس نے اسلامی معیشت اور اسلامی بینکاری کو فروغ دیا ہے۔

اسلامی معیشت کی ابتداء بیسویں صدی کے اواخر میں رکھی گئی ،اس کا سہرا سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل اور پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے سر ہے۔اسلامی معیشت دان سرمایہ داری کے اصولوں کو غیر اقداری تصور کر کے ان میں اسلامی اصولوں کو خاص کر بلا سودی فنانشل سسٹم کی پیوند کاری کرتے ہیں۔جیسا کہ ہم نے مارکیٹ میں دیکھا کہ سود تو سرمایہ دارانہ نظام کی رگ و پے میں سرائیت کر رہا ہے اس کا خاتمہ جب ہی ممکن ہے جب سرمایہ دارانہ نظام کو مجموعی طور پر تباہ کیا جائے۔ابھی ہم نے اس باب میں تفصیل سے دیکھا کہ معاشیات کا تعلق دور تنویر کے افکار سے ہے۔اسی معنی میں معاشیات ایک خاص علمیت ہے کہ اس کا مقصد سرمایہ داری کا غلبہ ہے۔اسلامی معیشت دانوں کی اصلی غلطی یہ ہے کہ وہ سرمایہ داری کو باطل نظام تصور نہیں کرتے ، بلکہ اسکو ایک معاشی نظریہ تصور کرتے ہیں،اور نہ ہی اسلام کو کوئی نظام تصور کرتے ہیں۔وہ اسلام کو برتنے کا طریقہ تصور کرتے ہیں اسی لئے کسی بھی نظام میں اس کی پیوند کاری کو جائز تصور کرتے ہیں۔

اسلامی معیشت دان جیسا کہ ہم نے معیشت میں دیکھا اس کے اصولوں پر جو کہ فرد، معاشرے اور ریاست

کی سطح پر ہیں سے بالکل سہو نظر کرتے ہیں۔وہ سرمائے کو دولت تصور کرتے ہیں اور نج کاری کو نجی ملکیت سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ ہم نے مارکیٹ میں دیکھا کہ سرمایہ داری تو نجی ملکیت کو فروغ نہیں دیتی بلکہ نج کاری کا مقصد نجی ملکیت کو ختم کر کے کارپوریشن کو مکمل اختیارات دینا ہے۔جس کی تفصیل ہم دیکھ چکے ہیں۔

اسلامی معیشت دان معاشی اصولوں کو غیر اقداری تصور کرتے ہیں اسی لئے وہ فرد کو حریص و حاسد تصور کرتے ہیں اور پیداوار کنندہ کے منافع کے زیادہ سے زیادہ حصول کو جائز تصور کرتے ہیں۔تمام معاشی نظریات کو حق تصور کر کے ان کے لیے اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں مثلاً قیمتوں کے تعین میں طلب و رسد کے نظریات کو عین اسلامی اور مارکیٹ کے قدر کے متعین کرنے کا اسلامی پیمانہ تصور کرتے ہیں۔وہ سرمایہ داری کو ایک معاشی نظریہ تصور کرتے ہیں اور اس میں رہتے ہوئے سرمایہ داری کا فروغ چاہتے ہیں۔

معاشیات کے اصولوں کو من و عن تسلیم کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم سرمایہ دارانہ اصول کو حق بجانب تصور کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ تسکین کا حصول ہے۔تو اس صورت میں جو شخصیت پروان چڑھے گی وہ کبھی بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا پیکر نہیں ہوگی اور جو معاشرہ تعمیر ہوگا وہ سول معاشرہ ہوگا نہ کہ اسلامی معاشرہ جو ریاست ہوگی وہ جمہوری ہوگی نہ کہ اسلامی۔

اسلامی معیشت کے حوالے سے نظریات پر کام تو کم ہوا ہے البتہ جو کام اسلامی معیشت دانوں نے سب سے زیادہ اور پر زور طریقہ سے کیا ہے وہ اسلامی بینکاری پر ہے۔اسلامی بینکاری جس کی ابتداء مصر میں جمال عبدالناصر نے ناصر سوشل بینک قائم کر کے کی اور سعودی عرب میں پرنس محمد الفیصل نے دارالمال کی صورت میں رکھی۔ان دونوں اداروں کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمون کی اسلامی تحریک کے سیاسی غلبے کو ختم کرنے کے لیے اور عرب دنیا میں اسلامی تحریکات کو کچلنے کے لیے دارلمال کی بنیاد رکھی گئی۔اسلامی بینکاری کو 1980 کی دہائی میں عوامی پذیرائی حاصل نہ رہی اور اسلامی بینکاری مسلمان سرمایہ داروں تک ہی محدود رہی اور اس میں علماء کرام کی شرکت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

1976 میں شریعت کے ماہرین علماء کرام اور بینکاروں کے درمیان معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں مصر میں فیصل اسلامک بینک کا قیام عمل میں آیا 1990 کی دہائی کے وسط سے عام علماء کرام کو بینکوں نے اپنا شریعہ ایڈوائزر بنایا اور ایک شریعہ ایڈوائزری بورڈ تشکیل دیا گیا۔اس طرح عام مسلمانوں کا اعتبار اسلامی بینکاری پر قائم ہوا اور اس کے بعد سے مسلم ممالک میں اسلامی بینکاری کا جال بچھ گیا۔21 ویں صدی کی ابتداء میں جب مالیاتی نظام کی نجکاری کی گئی اور پاکستان میں خاص کر نجی بینکاری کو اور بیرونی بینکاری کو کام کرنے کی اجازت ملی تو اس کے ساتھ نجی اسلامی بینکوں کا قیام عمل میں آیا جس میں قابل ذکر المیزان بینک ہے۔اس کے علاوہ تقریباً ہر بڑے بیرونی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستانی بینک نے اسلامی ونڈو بھی قائم کی جس میں حبیب بینک/اے بی ایم ایمبر و بینک قابل ذکر ہیں۔

اسلامی بینکاری کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

1۔اسلامی بینک مالیاتی اداروں کو غیر جانبدار ادارے تصور کر کے اس میں اسلامی تمویلی آلات کی پیوند کاری کرتا ہے۔سود کی جگہ مرابحہ‘ اجارے کو زیادہ تر استعمال کرتے ہیں اور محدود پیمانے پر مشارکت اور مضاربہ کو استعمال کرتے ہیں اس طرح سود کو اسلامی جواز فراہم کیا جاتا ہے خود اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صراحت کے ساتھ درج ہے کہ مرابحہ، اجارہ اور دیگر کرائے اور خرید و فروخت کے ذرائع سود کو پچھلے دروازے سے داخل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے ان ذرائع کا استعمال نہایت مجبوری میں اور محدود پیمانے پر کیا جائے جبکہ اسلامی بینکاری میں 80 فیصد سے زیادہ مرابحہ اور اجارہ پایا جاتا ہے۔

2۔بینک ایک ثالث ہے جس کا کام زر کو ایک ضرورت مند سے دوسرے ضرورت مند کو فراہم کرنا ہے۔ بینک بحیثیت ثالث جب بھی زر کے تبادلے اور زر کی تجارت کا منافع لے گا وہ منافع سود کے سوا کچھ نہیں ہوگا اسی لئے اسلامی نظریاتی کونسل نے جو سفارشات مرتب کیں اس میں نجی بینکاری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

3۔اسلامی بینکاری میں شریعہ ایڈوائزرز کو سرمایہ دار بطور ایجنٹ استعمال کر رہے ہیں۔اس میں جو فتویٰ دیے جاتے ہیں وہ کل نظام پر نہیں دیئے بلکہ جزو پر دیتے ہیں اسلامی تمویلی ذرائع کے استعمال پر فتویٰ ہونا چاہئے اسی لئے ان کی مرتب شدہ شرائط صرف کاغذ پر اگریمنٹ تک محدود رہتی ہیں اور عملی طور پر سودی بینکاری اور اسلامی بینکاری میں بالکل فرق نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں سود خور سرمایہ داروں کو دہرا فائدہ ہے ایک اسلامی بینک کم شرح پر قرضہ فراہم کرتا ہے دوسرا اپنے کھاتے داروں کو کم شرح پر منافع/سود دیتا ہے۔

4۔منظر کیف لکھتے ہیں کہ ان شریعہ ایڈوائزر کے ذریعہ سرمایہ دار درج ذیل فائدہ اٹھاتے ہیں۔

1۔شریعت کو جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے ادھر مالیاتی اور تمویلی میدان میں اسلامی اسکالرز پیدا ہو رہے ہیں اس فیلڈ میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جا رہی ہیں۔

2۔فقہ سے متعلق فیصلوں اور آراء کو جدید بنایا جا رہا ہے جس کا مقصد سود کو جائز کرنا اور اسلامی سرمایہ داری کا فروغ ممکن بنانا ہے۔

3۔علماء کرام کے طرز زندگی کو پر تعیش بنانے کا ذریعہ ہے بڑی بڑی تنخواہیں فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام وغیرہ سفر بڑے بڑے سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں سے براہ راست ملاقاتیں

4۔علماء کرام کو بینکاری سے منسلک کر کے سرمایہ داری اور سودی نظام کی اسلام کاری کی جا رہی ہے۔

5۔علماء کرائم کو سرمایہ داروں کا مشیر بنا کر ان کی وقعت‘ قدر و منزلت عام مسلمانوں میں کم کی جا رہی ہے۔

مسلم معیشت دان اور بینکار دونوں سرمایہ داری کے فروغ میں براہ راست اور بلا واسطہ شریک ہیں۔اور سرمایہ داری کو اسلامی جواز پہنایا جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اچھی طرح سمجھیں کہ معاشیات سرمایہ داری کی ایک علمیت ہے اس کے ذریعے سرمایہ دارنہ نظام کو معاشرہ میں غالب کیا جا رہا ہے۔اس سرمایہ دارانہ معاشرے میں معاشیات ایک غالب قدر ہو جاتی ہے جس کے ذریعے سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری کو مقصد حیات بنایا جاتا ہے اور پورا معاشرہ سرمائے کے گرد گردش کرتا ہے۔اسلامی معاشرے میں معاش تابع ہوتا ہے اسلامی نظام کے اور وہ قدر متعین نہیں کرتا بلکہ اسلامی اقدار کے تابع ہو کر زندگی میں اس کی اہمیت کم ہوتی ہے۔نہ ہی فرد معاشرے اور ریاست میں اسکو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں افراد معاشرے اور ریاست میں معاشیات کو کلیدی مقام حاصل ہوتا ہے۔

تکملہ:

اسلامی معیشت دان سرمایہ داری کو معاشیات تک محدود کرتے ہیں جو کہ ایک غلط نظریہ ہے۔سرمایہ داری کا دائرہ کار پورے معاشرے پر محیط ہے۔دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ سرمایہ داری نجی ملکیت کو فروغ دیتی ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔سرمایہ داری سرمائے کی ملکیت کو فروغ دے کر ہر فرد کو سرمائے کا غلام بنا دیتی ہے۔سرمایہ داری کا تعلق مغربی اقدار سے ہے جس میں معاشیات بطور علم کے اس نظام کو فروغ دینے کا ضامن ہوتا ہے۔

☆☆☆

نوٹ:اسلامی بینکاری پر فقہی نقد جامعہ بنوری ٹاؤن سے شائع شدہ فتویٰ ’’مروجہ اسلامی بینکاری‘‘ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشتراکیت یا ریاستی سرمایہ داری

جاوید اقبال

اشتراکیت کے علم بردار بڑی فنی مہارت سے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک خاص نوعیت کی معاشی ہیئت ہے جس میں معاشرے کے کمزور اور مفلوک الحال طبقات کو سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ محض اشتراکیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ نظام سرمایہ دارانہ نظام سے مختلف کوئی نظام ہے حالانکہ اگر گہری نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ اشتراکیت سرمایہ داری سے الگ کوئی نظام نہیں اور نہ یہ اس کے خلاف کوئی ردعمل ہے بلکہ دراصل یہ اشتراکیت سرمایہ دارانہ مقاصد اور اہداف کو حاصل کرنے کا محض ایک دوسرا طریقہ ہے۔

ہر چند کہ اشتراکیت ایک دم توڑتی ہوئی قوت ہے اور ہمارا اصل مقابلہ لبرل سرمایہ دارانہ نظام سے ہے جو کہ استعمار کی شکل میں اس وقت غالب ہے لیکن اشتراکی سرمایہ داری سے بھی امت مسلمہ کو خطرات ہیں جن کا ادراک کرنا اشد ضروری ہے خصوصاً اس پس منظر میں کہ اشتراکیت نے برصغیر میں خصوصاً اور دیگر مسلم ممالک میں عموماً اسلامی فکر کو بہت متاثر کیا ہے۔ امت مسلمہ کو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے اور غلبہ دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان دونوں باطل نظریات کو شرح صدر کیساتھ بالکلیہ رد کر دیں۔

اشتراکی سرمایہ داری کی اساسی بنیادیں:

جیسا کہ ہم تمہید میں بیان کر چکے ہیں کہ تاریخی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی دو شکلیں ہیں۔

1۔ لبرل سرمایہ داری

2۔ اشتراکی سرمایہ داری

یہ بات ہم اس لیے کہتے ہیں کہ دونوں کے بنیادی ماخذات اور اساسی تصورات میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں کے مابعد الطبیعاتی تصورات اور منہج میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے اور اصولاً دونوں کے اہداف بالکل یکساں

ہیں۔

اشتراکی سرمایہ داری اور لبرل سرمایہ داری دونوں تحریک تنویر کی پیداوار ہیں جو دراصل مغربی تہذیب کی روح رواں تحریک ہے یہ تحریک خدا سے بغاوت کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے کہا کہ انسان قائم بالذات، خود مختار ہستی ہے۔ وہ ان معنوں میں آزاد ہے کہ اسے وحی اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنی عقل کو استعمال کر کے حق کی جو چاہے تشریح بھی کر سکتا اور حق کی تعمیر بھی کر سکتا ہے، گویا تحریک تنویر کی بنیادی دعوت ''آزادی'' کی دعوت ہے۔ فرد ان معنوں میں آزاد ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہے اس پر کوئی خارجی قدغن نہ لگائی جائے بس اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ جو اپنے لیے چاہتا ہے سب کے لئے چاہ سکتا ہے یا نہیں یعنی اپنی چاہت کو سب کے لیے آفاقی کر سکتا ہے یا نہیں مثلاً فرد اگر اپنی ذہنی کسوٹی پر اس بات کو رکھے کہ وہ زنا چاہتا ہے اور اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ زنا عام ہو تو پھر یہ ایک پسندیدہ قدر کہلائے گی گویا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ ہر وہ خواہش جو نفس انسانی کے اندر پرورش پاتی ہے اگر اس خواہش کو آفاقی بنایا جا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ہم ایسے اصول مرتب کر سکیں کہ تمام انسانوں کے لیے یہ ممکن ہو سکتا ہو کہ وہ اپنی اپنی خواہش کو پورا کر سکیں تو یہ کہنا درست نہیں کہ اسے یہ خواہش نہیں رکھنا چاہیے۔ المختصر ہر فرد اپنے لیے پیمانہ معیار خیر و شر چن سکتا ہے بس وہ کسی دوسرے کی تشریح خیر و شر میں رکاوٹ نہ بنے اس لیے تحریک تنویر کو ''آزادی'' کے ساتھ ''مساوات'' کو بھی اساسی قدر کے طور پر اپنانا پڑا۔

آزادی اور مساوات لبرلزم کی دو بنیادی اقدار ہیں اور ان دونوں اقدار کو اشتراکیت نے من و عن قبول کیا ہے۔ اگر ہم کسی اشتراکی سے سوال کریں کہ نظام زندگی کو مرتب کرنے کے اصول کیا ہیں تو وہ ایک لبرل کی طرح جواب دے گا کہ آزادی اور مساوات اساسی اصول ہیں۔ یہ آزادی اور مساوات بنیادی طور پر عبدیت کی رد ہیں قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور سورۃ یٰسین میں ہے۔

''نہ بندگی کرنا شیطان کی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ بندگی کرو اللہ کی کہ یہ سیدھا راستہ ہے'' اور اسی وصف عبدیت کی بنیاد پر معاشرے میں اس کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ اسلام میں بنائے فضیلت تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بزرگی کا حامل وہ شخص ہے جو اس سے ڈرنے والا ہے جو اس کے اوامر پر عمل کرنے والا اور اس کی منہیات سے اجتناب کرنے والا ہے۔ خشیت کا یہ وصف جس انسان کے اندر جس قدر بڑھا ہوا ہوگا اس نسبت سے وہ شرافت و بزرگی کا اہل قرار پائے گا۔

اس لئے اسلام کے علاوہ بھی تمام الہامی مذاہب آزادی اور مساوات کو رد کرتے ہیں اور عبدیت اور ہدایت پر زور دیتے ہیں۔ اسلام میں اس دنیا کے لئے اور اخروی دنیا کے لیے بھی ہدایت کا پورا نظام موجود ہے جو ہم تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انبیاء صحابہ تابعین تبع تابعین علماء اسلام اور صوفیائے عظام کے ذریعے پہنچا ہے اس لیے جس طرح ہم عبدیت پر اصرار کرتے ہیں اسی طرح اس نظام ہدایت پر بھی اصرار کرتے ہیں اور لبرل سرمایہ داری اشترا کی سرمایہ داری کی جو اقدار اس کی نفی کرتی ہیں ان کو بالکلیہ رد کرتے ہیں آزادی اور مساوات کی انہی اساسی قدروں کی وجہ سے ہم لبرل سرمایہ داری اور اشتراکی سرمایہ داری دونوں کو کفر کہتے ہیں اس لیے کہ یہ عبدیت سے انکار اور خدا سے بغاوت پر زور دیتے ہیں، تمام تر فروعی اختلافات کے باوجود جڑ اور بنیاد دونوں کی ایک ہی ہے اس لیے دونوں معاشروں کا جائزہ لیں تو افراد میں یکساں قلبی کیفیات پروان چڑھتی ہیں جتنا باغی اور رذیل ایک فرد لبرل سرمایہ داری میں ہوتا ہے اتنا ہی اشتراکی سرمایہ داری میں بھی ہوتا ہے۔

لبرل سرمایہ داری اور اشتراکی سرمایہ داری میں فروعی اختلاف:

اساسی اقدار کی مماثلت بیان کرنے کے بعد ہم اس سوال کی جانب آتے ہیں کہ ان دونوں میں اختلاف کیا ہے اور کس بنیاد پر ان دونوں کی راہیں جدا جدا محسوس ہوتی ہیں..... اشتراکیت کا لبرل سرمایہ داری پر محض یہ اعتراض ہے کہ سرمایہ درانہ نظام میں آزادی اور مساوات کا حصول ممکن نہیں ہے۔ لبرل سرمایہ داری جس آزادی اور مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں قائم نہیں ہوسکتے اور اس کی وجہ لبرل سرمایہ داری کی ایک علمیاتی غلطی ہے اور وہ غلطی یہ ہے کہ لبرل سرمایہ داری میں سمجھا جاتا ہے کہ فرد بحیثیت فرد خیر کی تشریح کرسکتا ہے جبکہ اشتراکی مفکرین کا دعویٰ ہے کہ خیر کی تشریح فرد نہیں کرتا بلکہ انسانیت بحیثیت مجموعی کرسکتی ہے اور کسی فرد کا یہ فیصلہ کہ حق کیا ہے اور کیا نہیں ہے آفاقی نہیں بنایا جاسکتا۔ حق کی وہ تعبیر آفاقی بنی ہے جو عملاً کسی تاریخ کے اندر تعمیر کی جاتی رہی ہے حق کی تلاش اگر کرنی ہے تو انسان کی تاریخ کے اندر دیکھو تاریخ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ہے انسان ترقی کرتا گیا ہے تاریخ کے اندر وہ نظام موجود ہے جس کے اندر باطل خیالات و تصورات خود بخود ختم ہوتے چلے گئے ہیں اور وہ تصورات جو کہ حق اور خیر ہیں ان کو غلبہ اور عروج حاصل ہوا ہے لہٰذا تاریخی تسلسل ہی وہ ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں حق کی اصلی تعبیر ہوتی چلی آئی ہے اس لیے فرد کو تشریح خیر کے ضمن میں مرکزی حیثیت دینے کے بجائے ہمیں انسانیت کے ایک گروہ کی جدوجہد کے مطالعے کی ضرورت ہے جو تاریخی عمل کے نتیجے میں غالب آتا ہے اس لئے ہمیں حق اور خیر کی تشریح جاننے کے لیے یہ دیکھنا پڑے گا کہ تسلسل تاریخ انسانیت کیا ہے اور وہ کون سے رجحانات ہیں جن کی وجہ سے ایک خاص طرز زندگی غالب آیا ہے۔

مارکس کا مادی نظریہ تاریخ اور طبقاتی نزاع:

مارکس نے ایک خاص تعبیر تاریخ پیش کی ہے جسے جدلی مادیت (Dialectical Materialism) یا مادی

تصور تاریخ کہا جاتا ہے اور اس نظریہ تاریخ سے وہ اپنا طبقاتی نزاع (Class Struggle) کا نظریہ بھی بیان کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ حق کی تعمیر و تشریح کا اصلی ذریعہ ایک طبقہ اور کلاس ہے وہ فرد نہیں ہے اور حق کی تعمیر و تشریح طبقات کی باہمی کشمکش کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بنیادی عمل جو تاریخ میں انسان تسخیر کائنات یا کائنات میں اپنی مرضی مسلط کرنے کے لے یا قدرت پر اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے کرتا ہے مارکس کے بقول وہ پیداواری عمل ہے اس کے بقول ذرائع پیداوار کی نوعیت ہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات اور اس کے تمدن اور علوم و فنون کی بالائی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ پیدائش دولت کے مختلف طریقے ہی کسی دور کی ذہنی سماجی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں انسانیت کے ارتقاء کی اس کے نزدیک صورت یہ ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی ہوتی ہے اس کا براہ راست اثر اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی مادی قدریں ازخود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں جدلی عمل اور کشمکش شروع ہوتی ہے اور بالآخر وہ مصالحت پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزاء شامل ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے بہتر ہوتا ہے اور اسی طریقے سے انسانیت کا ارتقاء ہورہا ہے اس نظریہ تاریخ کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی قرار پاتی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے معاشی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے اس دور کے ختم ہوجانے پر ساقط الاعتبار ہوجاتی ہے اگر کسی چیز کا وجود کسی دور کے معاشی تقاضوں کے لیے ناگزیر ہے تو وہ مستحسن اور پسندیدہ ہے لیکن یہی چیز اگر معاشی تقاضوں کے بدل جانے سے بے کار ہوجائے تو وہ باطل ہوجاتی ہے ایسی کوئی صداقت نہیں اور نہ ہوسکتی ہے جو ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کی دعویدار ہو۔ المختصر اوزار پیداوار اور طرائق پیداوار کے بدل جانے سے تعلقات پیداوار بدلتے چلے جاتے ہیں اور ان میں ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے اور دیگر ساری تبدیلیاں انہی کے مرہون منت ہوتی ہیں۔

تاریخ کی اس مادی تعبیر ہی سے طبقاتی نزاع کے تصور نے جنم لیا۔ مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام جب ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ہی بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہوجاتی ہیں جو اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہوجاتی ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ مروجہ نظام میں جس طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے اسے بدل کر طبقوں کی ازسرنو تقسیم عمل میں لائی جائے اور پرانا ملکیتی نظام بھی تبدیل کردیا جائے۔ یہ مطالبہ ان طبقوں پر بہت شاق گزرتا ہے جنہوں نے مروجہ معاشی تنظیم اور طبقاتی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کرلیا ہے۔ وہ اپنے مفادات کی پوری طاقت کے ساتھ حفاظت کرتے ہیں اس لیے جب کسی معاشی تنظیم میں نئی پیداواری قوتیں ابھر کر مروجہ طبقاتی تقسیم کی بنیادوں کو متزلزل کردیتی ہیں تو یہ طبقے انہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ختم کرنے کے لیے پورا زور لگاتے ہیں۔ پسے ہوئے طبقے جب نئی پیداواری قوتوں کو آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے ایک کشمکش جنم لیتی ہے۔ مارکس کے نزدیک انسانیت کے تمام اہم فیصلے جو زندگی اور اس کی قدروں کو بدلنے والے ہوں اس کشمکش کا نتیجہ سے طے پاتے ہیں۔ مارکس اور اینجلز نے اپنے اشتمالی منشور کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔:

''انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے' غلام اور آقا' امراء و جمہور' سرمایہ دار اور مزدور مختصر یہ کہ ظالم و مظلوم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِ پیکار رہے ہیں۔"

سرمایہ دارانہ نظام پر مارکس کی تنقید:

سرمایہ دارانہ نظام پر مارکس کی تنقید بیان کرنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ مارکس کی چند اصلاحات کو مختصراً سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

1۔سرمایہ:(Captial)

جب اشیاء خرید و فروخت کے لیے بنائی جائیں تو ان پر خرچ آنے والی رقم سرمایہ کہلاتی ہے کیوں کہ یہ رقم اس لیے خرچ کی جارہی ہے کہا کہ اس سے بننے والی اشیاء کی فروخت سے مزید رقم کمائی جائے۔

2۔جنس:(Commdity)

فطرت کے عطا کردہ مادہ پر جب اس لیے محنت کی جائے کہ اسے تجارت کے لیے بیچا جا سکے تو پیدا کی جانے والی چیز کو جنس کہتے ہیں۔

3۔قدر استعمال:(Use value)

قدر استعمال کسی جنس کی صفت یا خصوصیت کا نام ہے مثلاً اناج کی قدر استعمال کھانے سے معلوم ہوتی ہے۔

4۔قدر اصل:(Intrinsic value)

استعمال کی جانے والی جس شے پر نظر ڈالیے وہ اس معیاری سماجی ضروری محنت کا اظہار کرتی ہے جو اس جنس کے بنانے میں صرف ہوتی ہے ہر جنس کے بنانے میں سماجی ضروری محنت کا معیار جدا جدا ہوتا ہے جو اس جنس کی ''قدر اصل'' کہلاتا ہے۔

5۔معیاری سماجی ضروری محنت

(Socially necessarly labour)

اس میں دو مختلف اجناس کی کیفیت یا قسم مدنظر نہیں ہوتی بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان اجناس میں استعمالی قدر

پیدا کرنے کے لیے کس قدر وقت اور اوسط محنت صرف ہوئی ہے۔

6۔قدر تبادلہ:(Exchang value)

نسبت تبادلہ میں اجناس کی قدر کم یابی یا فراوانی یعنی رسد اور طلب کے ماتحت قرار پاتی ہے۔

7۔قدر زائد:(Surpluss value)

مارکس کا یہ کلیدی تصور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مزدور دو گھنٹے کی سماجی ضروری محنت سے وہ سب اجناس پیدا کر لیتا ہے جن سے مزدور اپنی محنت کرنے کی طاقت حاصل کر سکتا ہے مگر سرمایہ دار استحصال کے ذریعہ اس سے آٹھ گھنٹے کی بے معاوضہ محنت لیتا ہے اس غیر ادا شدہ اجرت کا نام قدر زائد ہے۔

ان اصطلاحات کی مختصر وضاحت کے بعد ہم سرمایہ دارانہ نظام پر مارکس کی تنقید بیان کریں گے جو دراصل اس کے مادی تعبیر تاریخ سے ماخوذ ہے۔

مارکس کہتا ہے کہ ایک شخص جو براہ راست اپنی ضرورت کی تسکین کے لیے کوئی چیز بناتا ہے بلاشبہ استعمالی قدر کی چیز تو بناتا ہے' لیکن تجارتی جنس پیدا کرنے کے لیے اسے دوسروں کی استعمالی قدر کی چیز یعنی سماجی استعمالی قدر کی شے بنانی چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ معاشرہ کے مختلف افراد ایسی چیزیں پیدا کریں تو ان تجارتی چیزوں کے باہم مبادلے کے لیے شرح کیسے متعین ہو؟ یعنی جدا جدا تجارتی چیزوں کے باہم مبادلے کے لیے شرح کیسے متعین ہو یا جدا جدا تجارتی چیزوں کی قدر کا تعین کیسے کیا جائے اس کا جواب بقول مارکس کے یہی ہو سکتا ہے کہ چوں کہ یہ تمام اشیاء متفرق ہونے کے باوجود محنت کی پیداوار ہیں اس لیے ان کی قدر اور شرح کے تعین کے لیے اس محنت کے وقت اور اس کی مقدار سے کیا جائے گا جو ان کی اس مادی شکل میں پنہاں ہے مثلاً مختلف بڑھئی اگرچہ مختلف وقت میں ایک ٹیبل تیار کرتے ہیں مگر اوسطاً 24 گھنٹوں میں ایک ٹیبل تیار کر لیتے ہیں۔ یہی 24 گھنٹے کی محنت معیاری سماجی ضروری محنت ہے اور ہر وہ چیز جس کی پیداوار میں اتنی ہی سماجی ضروری محنت صرف ہوتی ہے اس کا تبادلہ اس ٹیبل سے ممکن ہو سکے گا۔

اب یہ دیکھا جائے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں محنت کا استحصال کیسے ہو رہا ہے چونکہ مزدور ذرائع پیداوار سے محروم ہے اور ان کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہے اس لئے مزدور اپنی محنت بیچنے پر مجبور ہے جو کہ درحقیقت چیزوں میں قدر اصل پیدا کرتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مزدور اپنی محنت کی یہ طاقت یا کام کرنے کی صلاحیت کس شرح پر بیچے؟ مارکس کے بقول مزدور کی محنت کی طاقت برابر ہے ان تمام چیزوں کے جو اس کے اور اُس کی بیوی بچوں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ مزدور چار گھنٹے کی محنت سے یہ اجرت حاصل کر سکتا ہے لیکن سرمایہ دار استحصال کے ذریعہ مزید چار گھنٹے کی محنت بھی اس سے بے معاوضہ لیتا ہے اور اس سے قدر زائد پیدا کرتا ہے جو کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب سرمایہ دار کی جیب میں چلی جاتی ہے اور اسی کے ارتکاز سے سرمایہ دار مزید استحصال کے قابل ہو جاتا ہے چونکہ مزدور کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملتا اس لیے اس نظام میں پیداوار سے اس کی مغائرت (alienation) بڑھتی چلی جاتی ہے جس سے لامحدود پیداواری ترقی ممکن نہیں رہتی۔

اس لامحدود پیداواری ترقی کو ناممکن بنانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام نے 'مارکیٹ' کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے مارکیٹ مارکس کے بقول وہ نظام ہے جس میں عوام کو مجبور و بے کس بنا دیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں قوت اور دولت مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے اس ارتکاز کی وجہ سے وہ لامحدود پیداواری ترقی حاصل نہیں کر سکتے جو نئے آلات و ذرائع یعنی ٹیکنالوجی کی وسعت کی وجہ سے ممکن ہو رہی ہے اس لیے کہ سرمایہ دار طبقہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہے اس کو ختم کرنے کے لیے ہمیں ایک انقلاب کی ضرورت ہے اور وہ انقلاب یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر مزدور کا قبضہ ہو جائے اور اس قبضے کے نتیجے میں وہ ایسا معاشرہ قائم کر سکیں گے جس کے اندر تعلقات پیداوار ذرائع پیداوار سے دوبارہ ہم آہنگ ہو جائیں، ان کے ہم آہنگ ہو جانے سے لامحدود ترقی ہوگی' جب مارکیٹ کا خاتمہ ہو جائے گا تو دراصل اس سرمایہ دارانہ نظم ملکیت کا خاتمہ ہو جائے گا جس کے نتیجے میں معاشی بڑھوتری سرمایہ دارانہ مسابقت کے نتیجے میں ہوتی ہے اور اس کی جگہ ایسی معیشت قائم ہوگی جس میں تمام سرمایہ ریاست کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے۔

لبرل سرمایہ داری اور اشتراکی سرمایہ داری دونوں ہی ذاتی ملکیت کو رد کرتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ملکیت کارپوریشنز کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جبکہ اشتراکی سرمایہ درای میں یہ ریاست کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اس لئے اشتراکیت کو ہم ریاستی سرمایہ داری کہتے ہیں۔ سرمایہ درانہ نظام میں کارپوریشن وہ شخص قانونی جس کا وجود بڑھوتری سرمائے سے مربوط ہے اس کا وجود اس بات پر منحصر ہے کہ وہ بڑھوتری سرمائے کے عمل کو جاری و ساری رکھے، اسی طرح اشتراکی سرمایہ داری میں ملکیت کا جو فاعل اور ایجنٹ ہے وہ ریاست ہے جس کا فرض ہے کہ وہ سرمائے کی بڑھوتری کا ذریعہ بنے۔

گویا اشتراکیت کا اعتراض سرمایہ دارانہ نظام پر یہ نہیں ہے کہ اس نظام میں کچھ ایسے اہداف ہیں جن کو اشتراکیت رد کرتی ہے بلکہ محض یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ اہداف حاصل نہیں ہوتے جن کا لبرل سرمایہ داری وعدہ کرتی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظم ملکیت کو محض اس لیے ختم کرنا چاہتی ہے تاکہ آزادی اور مساوات کے وہ اہداف حاصل کر سکیں جن پر دونوں بالکلیہ متفق ہیں۔ یہ صرف اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب سرمایہ دارانہ جمہوریت کی جگہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جائے اور یہی ڈکٹیٹرشپ اصل جمہوریت ہے اس لیے کہ مزدور ہی وہ طبقہ ہیں جو تاریخی عمل کی حقیقت کو پہچان گیا ہے اور مزدور طبقہ وہ فاعل ہے جس کے اندر روح انسانیت حلول کر گئی۔ جب

سب لوگ اس طبقے کے ممبر بن جائیں گے اور کارپوریشن کی ملکیت ختم ہو جائے گی تو سب لوگ مل کر انسانی معاشرت کو ترقی کی انتہا پر پہنچا دیں گے اور اس وقت ہر ایک کے لیے ممکن ہو جائے گا کہ وہ "خدا بن جائے"۔ مارکس سوشلزم کے بعد کمیونزم کی تشریح بالکل یہی کرتا ہے کہ وہ ایسا معاشرہ ہوگا جہاں فرد جو چاہے گا کر سکے گا' وہ لامحدود قوت کا مالک ہوگا' اس معاشرت کے اندر نہ کوئی طبقہ ہوگا' نہ خاندان' نہ ریاست اور نہ کوئی دوسری اجتماعیت ہوگی تمام اجتماعیتیں کمیونسٹ سوسائٹی کے اندر منہدم ہو جائیں گی اور لوگ مساوی آزاد فرد کی حیثیت سے زندہ رہیں گے، چونکہ انہوں نے تاریخی عمل کی حقیقت کو پہچانا اس لئے وہ سب مساوی طور پر خدا ہوں گے اور جس بھی طرز زندگی کو اپنے لیے پسند کریں گے وہ اپنا سکیں گے۔ اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہوگئی کہ طرائق کے فرق کے ساتھ دونوں حصول آزادی اور حصول مساوات پر بالکل متفق ہیں۔

اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جس وقت ہم اسلام کی کسوٹی پر اشتراکی طرز زندگی یا لبرل فکر کو جانچتے ہیں تو ہم ان کو بالکلیہ رد کرتے ہیں کیونکہ دونوں کی بنیادی دعوت کفر' الحاد اور خدا سے بغاوت کی طرف ہے اور ضمناً مان بھی لیا جائے کہ ان کے اندر کوئی ایسی خصوصیت موجود ہے جس کی کوئی مماثلت کسی اسلامی تصور خیر سے کی جا سکتی ہے تو پھر بھی اس نظام زندگی کے اندر یہ ممکن نہیں ہے کہ فرد کا رجحان آزادی اور مساوات کے علاوہ کسی اور طرف ہو۔

ہم دونوں کو بحیثیت ایک نظام کے رد کرتے ہیں اور ہم بحیثیت ایک نظام کے اسلام کے غلبے کے دعوے دار ہیں۔ ہمیں ان باطل نظاموں میں کوئی جائے پناہ تلاش نہیں کرنا ہے بلکہ دونوں کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ انہی معنوں میں ہم انقلابی ہیں اور انقلاب کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز زندگی کی طرف لوٹ کر جانا چاہتے ہیں اور ہم ہر سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس کی تعلیم ہم تک صحابہ' تابعین' تبع تابعین' علماء اور صوفیاء سے پہنچی ہے لہٰذا جب ہم انقلاب کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب شریعت کے نفاذ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ شریعت کے نفاذ کا مطلب ہے عبدیت اور ہدایت اور جہاں دعویٰ ہی آزادی اور مساوات کا ہو وہاں عدل (شریعت) کے وجود کا پھر کیا سوال پیدا ہوتا ہے اس لیے ہم ان دونوں نظاموں کا بحیثیت کل مطالعہ کریں اور ان کو اصولاً رد کر دیں اور اشتراکیت یا لبرل ازم کو غلبہ دین کے ذریعے کے طور پر قبول کرنے کی غلطی میں نہ گرفتار ہو جائیں یہ نہ سمجھیں کہ کوئی اشتراکی یا لبرل عمل اسلامی طرز زندگی کے اندر سمویا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں عبدیت اور ہدایت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

جو شخص جس حد تک اشتراکی یا لبرل فکر سے متاثر ہوا وہ اس حد تک حقوق کا طالب ہوگا' آزادی کا خواہش مند ہوگا' مساوات کا علمبردار ہوگا اور عبدیت و ہدایت اس کی زندگی میں اجنبی سے اجنبی تر ہوتی چلی جائیں گے لہٰذا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے لیے کوئی جواز نہیں ہے کہ ہم لبرل یا اشتراکیت کے کسی اصول، کسی فرع، کسی عمل، کسی حکم کو نظام اسلامی میں شامل کرنے کی جدوجہد کریں۔

اشتراکی سرمایہ داری کے مختلف خطرات اور ان کی نوعیت:

اشتراکیت کی ابتداء انیسویں صدی کی ابتداء میں ہوئی اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں یہ موجود ہے اشتراکی جدوجہد دو دھاروں میں تقسیم ہے ایک وہ جدوجہد جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جس میں سرمایہ دارانہ لبرل ریاستی نظام کو ختم کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے اور اس میں عموماً کمیونسٹ پارٹی اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ مزدور تنظیموں میں اثر و نفوذ حاصل کرے اور ان کو استعمال کر کے اپنے آپ کو مزدور طبقے کے نمائندہ کے طور پر منوا لے۔ یہی جدوجہد چین اور روس میں کی گئی اس کے نتیجے میں ٹریڈ یونینز کے ذریعہ مزدوروں کو منظم کیا گیا اور ان یونینز میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو مسلط کیا گیا اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا گیا جس کے نتیجے میں روس، چین او دیگر مشرقی یورپین ممالک میں سرمایہ دارانہ لبرل معیشت، نظام ملکیت اور نظام ریاست کو ختم کر دیا گیا اور کمیونسٹ پارٹیوں نے دعویٰ کیا کہ ہم حقیقی نمایندے ہیں مزدوروں کے اور مزدور حقیقی نمایندہ ہیں انسانیت کے اس لئے ہم انسانیت کی پارٹی ہیں ان معنوں میں ہم حق کی جو تعبیر کرتے ہیں وہی اس کی اصل تعبیر ہے اور اس تعبیر کو بروئے کار لا کر انسان کی خدائی اس کائنات پر مسلط کی جا سکتی ہے۔

یہی دعویٰ قوم پرستوں نے دوسرے طریقے سے کیا کہ تاریخ انسانی میں ترقی کا جو فاعل ہے وہ طبقہ نہیں بلکہ قوم ہے تمام قوم پرست جماعتیں یہ کہتی ہیں کہ ہماری قوم تاریخ میں ماسٹر اور بہترین قوم ہے مثلاً ہٹلر نے اور خود ہمارے ملک میں الطاف حسین نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ ان معنوں میں قوم پرست دعوت اشتراکیت سے بہت قریب ہے کہ وہ ہیگل کی اس فکر کی شاخ ہے جس نے دعویٰ کیا کہ حق کا ادراک اجتماعیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ اہداف آزادی اور مساوات کے لیے اشتراکیت طبقے کو اور قوم پرستی قوم کو بنیادی فاعل مانتی ہے گویا قوم پرستی بھی انہی معنوں میں اسلام سے متصادم ہے جس معنوں میں اشتراکیت اور لبرلزم اسلام سے متصادم ہیں ان تینوں نظریوں میں کوئی اساسی اور بنیادی فرق نہیں ہے اس لیے کسی ایک نظریے کو کسی دوسرے نظریے سے تبدیل کر دینا انقلاب نہیں بلکہ سرمایہ داری کو فروغ دینا ہے اگر انقلاب یہ ہے کہ عبدیت کو رائج اور ہدایت کو فروغ حاصل ہو تو تینوں نظریوں کو رد کرنا ہوگا۔

اشتراکیت کی ایک شکل تو وہ ہے جس میں مزدوروں کی سیادت و قیادت کو انسانیت کی فلاح متصور کیا جائے اس کے علاوہ اشتراکی سرمایہ داری کی دوسری شکل جس نے خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد تقویت حاصل کی وہ سوشل ڈیموکریسی ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس فکر نے بہت ساری اسلامی تحاریک کو

متاثر کیا ہے یہاں تک کہ آپ بعض اسلامی جماعتوں کا معاشی منشور اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا منشور دیکھیں تو ان میں بہت زیادہ مماثلت نظر آنے گی مثلاً حقوق کی تشریح اسلامی جماعتیں بھی وہی کرتی ہیں جو عموماً سوشل ڈیموکریٹک جماعتیں کرتی ہیں تقریباً تمام اسلامی جماعتیں اسلامی ریاست کو ایک ویلفیئر اسٹیٹ کہتی ہیں جو کہ خالصتاً سوشل ڈیموکریٹک تصور ہے اس لیے یہ ہمارے لیے بڑا خطرہ ہے۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا دعویٰ ہے کہ ہم لبرل پارلیمانی نظام اور لبرل مارکیٹ کو استعمال کر کے مزدوروں کی بالادستی قائم کر سکتے ہیں ہم جمہوری عمل ہی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے فلاحی حقوق پر زور دیا جائے یعنی محض انسانی حقوق کافی نہیں ہیں بلکہ کچھ معاشرتی آزادیاں بھی تسلیم کی جائیں اور یہ معاشرتی حقوق، انسانی حقوق کے لیے ضروری ہیں اس کے نتیجے میں ایک ویلفیئر ریاست قائم ہو جائے گی۔

1999ء کے بعد پوری دنیا میں ایک تحریک برپا ہے جسے دعالمگیریت کہتے ہیں یہ انہی معاشرتی حقوق کی تحریک ہے یہ تحریک دعویٰ کرتی ہے کہ انسانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کی آمدنی محفوظ ہو، ان کو ملازمت کا حق حاصل ہو، ان کو حق حاصل ہو کہ وہ ترقی کے عمل میں برابر کے شریک ہوں، اس کے تحت بڑے بڑے مظاہرے مغربی دنیا میں ہو چکے ہیں، بعض جگہ مسلمانوں نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ بادی النظر میں یہ تحریک بھی سرمایہ داری کے خلاف نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس کو سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت پر کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے اور اس کے بھی بعینہ وہی اہداف ہیں جو اہداف کمیونزم، لبرلزم، نیشنلزم کے ہیں لہٰذا اینٹی گلوبلائزیشن یا سوشل ڈیموکریٹ کے ساتھ مل کر معاشرتی حقوق کی جدوجہد کرنا، اسلامی انقلاب کی بیخ کنی کرنا ہے، اگر ہماری دعوت بنیادی طور پر دنیا میں جنت بنانے کی دعوت ہو جائے تو اس سے دو بڑے نقصانات ہوتے ہیں۔

(1) ہم اس چیز کا جواز پیش کرتے ہیں کہ دنیاوی فوائد کو اخروی فوائد پر برتری دینا جائز ہے اور ہماری سیاسی جدوجہد بالخصوص جہاد کی طرف نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی معاشرت کے قیام کی طرف ہوتی ہے جس میں آسائشوں کا فروغ اور دنیاوی ترقی ایک ہدف کے طور پر قبول کر لی جاتی ہے۔

(2) انقلاب اسلامی کا وقوع پذیر ہونا دنیا کی تمام طاقتوں کو ایک چیلنج ہے اور آج کل ریاست اسلامی کہیں بھی قائم ہو تو اس پر ہر طرف سے ابتلا اور مصائب کا ایک سیلاب امڈ کر آئے گا (طالبان کی حکومت سے واضح ہے) اور اگر ہم لوگوں کو دنیا طلبی کی طرف دعوت دیتے رہے اور ان سے وعدے کرتے رہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو جانے سے مادی برکات کا نزول شروع ہو جائے، تمہارے تمام معاشرتی حقوق تسلیم کر لیے جائیں گے، سب لوگوں کو ملازمتیں ملیں گی، غربت کا خاتمہ ہو جائے گا، آسائشوں کی فراوانی ہوگی تو جس وقت اسلامی ریاست کو ہزاروں خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا تو لوگ کس بنیاد پر قربانی، جدوجہد اور جستجو کے لیے تیار ہوں گے اگر دعوت سوشل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ڈیموکریٹک حقوق کی طرف ہوگی تو عملاً جہاد کرنا، طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں رہے گا کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اسلامی طرز زندگی کو محفوظ کرنے پر اکتفا کریں اور انقلاب کے دعوے سے صرف نظر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے لہٰذا سوشل ڈیموکریسی اور اینٹی گلوبلائزیشن کا معاشرتی حقوق کی طرف دعوت دینے والا طریقہ غلبہ دین کا طریقہ نہیں۔ ہمارے ملک میں خصوصاً لبرلزم اور سوشل ڈیموکریسی کے خطرات بہت شدید ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس کو بحیثیت کل کے پہچانیں اور بالکلیہ رد کردیں۔ ہمیں چاہئے کہ حقوق کی سیاست کو رد کردیں خواہ وہ انسانی حقوق ہو یا معاشرتی حقوق اور غلبہ دین اور جہاد کی طرف لوگوں کو بلائیں اور جو عظیم الشان مثال طالبان عالیشان نے قائم کی اس کے احیاء کی طرف لوگوں کو بلائیں اور ان شاء اللہ کوئی وجہ نہیں کہ لوگ جوق در جوق اسلامی تحریکوں کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔

باب چہارم

سائنس اور سرمایہ داری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ڈیموکریٹک حقوق کی طرف ہوگی تو عملاً جہاد کرنا' طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں رہے گا کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اسلامی طرز زندگی کو محفوظ کرنے پر اکتفا کریں اور انقلاب کے دعوے سے سہو نظر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے لہٰذا سوشل ڈیموکریسی اور اینٹی گلوبلائزیشن کا معاشرتی حقوق کی طرف دعوت دینے والا طریقہ غلبہ دین کا طریقہ نہیں۔ ہمارے ملک میں خصوصاً لبرلزم اور سوشل ڈیموکریسی کے خطرات بہت شدید ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس کو بحیثیت کل کے پہچانیں اور بالکلیہ رد کردیں۔ ہمیں چاہئے کہ حقوق کی سیاست کو رد کردیں خواہ وہ انسانی حقوق ہو یا معاشرتی حقوق اور غلبہ دین اور جہاد کی طرف لوگوں کو بلائیں اور جو عظیم الشان مثال طالبان عالیشان نے قائم کی اس کے احیاء کی طرف لوگوں کو بلائیں اور ان شاء اللہ کوئی وجہ نہیں کہ لوگ جوق در جوق اسلامی تحریکون کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔

باب چہارم

سائنس اور سرمایہ داری

www.KitaboSunnat.com

وحی یا سائنس

سید ذیشان ارشد

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت اور ایسا سچ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا اور مکمل کیا (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

اسلامی علمیت کی بنیاد وحی خالص ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبروں پر نازل فرمائی۔ انسان بحیثیت عبد کے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کا محتاج رہا ہے اور رہے گا۔ انسان کے کسی بھی کلیہ میں (چاہے وہ حس ہو، عقل یا وجدان) اتنی سکت و صلاحیت نہیں کہ وہ محض اپنے بل بوتے پر "الحق" تک رسائی حاصل کر سکے۔ لہٰذا اسلام میں علم کا اصل ماخذ صرف وحی ہے اور انسان کی تمام کلیات (بشمول عقل وحواس) کا درجہ وحی کے ماتحت ہے۔

موجودہ دور میں سائنس اور سائنسی علوم کا بہت دور دورہ ہے۔ عام مسلمان تو عام، سائنسی ترقی نے کئی ایک بزرگان دین کو بھی مرعوب کر دیا ہے۔ ایک سطحی نگاہ سے دیکھنے والے مسلمان کو بظاہر سائنس کی تباہ کاریاں اور برائیاں تو نظر آ جاتی ہیں لیکن پھر بھی مجموعی طور پر دیکھنے والوں کو یہ قابل قبول ہی معلوم ہوتی ہے اور بھلا کیونکر معلوم نہ ہو آخر اسی کی وجہ سے مغربی تہذیب نے بے تحاشہ مادی ترقی کی اور موجودہ دور میں دنیا کی زمام کار سنبھالی ہوئی ہے۔ اکثر لوگوں کے خیال میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کی وجہ بھی انہی سائنسی علوم میں ترقی نہ کرنا ہے۔ درج ذیل مضمون میں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ہم سائنس کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں۔

جدید سائنس: ایک علمیت

جدید سائنس کی ابتدا کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن جیسے سائنس دانوں سے ہوتی ہے لیکن یہ تمام سائنس دان اور ان کے نظریات اچانک کسی دن معجزے کے طور پر پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کے پیچھے یورپ کا مخصوص تاریخی عمل کارفرما رہا ہے۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں عیسائی علمیت غالب تھی۔ لوگ علم اور راہنمائی کے لیے کلیسا اور پادریوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ عیسائیت کی ابتدا تو الہامی پیغام سے ہوئی تھی لیکن جلد ہی اس میں بڑے

پیمانے پر تحریفات ہوئیں۔ جو عیسائیت پہلی صدی عیسوی کے بعد رائج ہوئی وہ اصل میں سینٹ پال کے نظریات تھے۔ بعد میں چوتھی صدی میں سینٹ آگسٹائین اور پھر تیرھویں صدی عیسوی میں سینٹ تھامس اکویناس کی اصولی تحریفات نے عیسائی علمیت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو جواز فراہم کیا۔ ان تبدیلیوں کا محرک وہ قدیم یونانی فلسفے کے نظریات تھے جو اس وقت کی مقدس رومی سلطنت میں زور پکڑتے جا رہے تھے۔ عیسائی علمیت کی اصولی تبدیلیوں کے نتیجے میں یہ بات قابل قبول ہو گئی کہ سچ تک رسائی کے لیے وحی کے علاوہ بھی ذرائع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اکثر پادریوں کے خیال میں افلاطون اور ارسطو وحی کے بجائے اپنی عقل اور حواس کی مدد سے سچ تک پہنچے تھے اور اس اصولی تبدیلی کی رخصت کو استعمال کر کے قدیم یونانی فلسفے کی کئی خرافات عیسائی مذہب میں شامل کر لی گئیں۔

مسخ شدہ عیسائی افکار اور کلیسا کی زیادتیوں کے باعث عیسائیت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ لوگ عام راہنمائی اور علم کے لیے عیسائیت کو چھوڑ کر اپنی عقل اور حواس پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ عیسائیت کی شکل میں مذہب ایک دھوکا اور کلیسا زندگی کی دشمن قرار پائی۔ اس موقع پر عیسائیت کے حامیوں نے تحریک اصلاح (Reformation) کی صورت میں اور روایت کے حامیوں نے روایت پسندی (Conservativism) کی صورت میں حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکامی مقدر بنی۔ جو تحریک کامیاب ہوئی اس کا نام تھا نشاۃ ثانیہ (Renaissance) جس نے آگے چل کر تحریک تنویر (Enlightenment) اور پھر جدید سائنس کی شکل اختیار کی۔ نشاۃ ثانیہ کا بنیادی نظریہ انسانیت کی مذہب سے آزادی اور دنیاوی زندگی کا بھرپور اثبات تھا۔ یہیں سے مغربی تہذیب میں انسان پرستی کی ابتداء ہوتی ہے۔ تحریک تنویر کی ایک خاص صفت اس کا انسان کی سمجھ پر اعتماد اس کی تمام کلیات کا اثبات تھا۔ اٹھارویں صدی کے مشہور فلسفی کانٹ نے اس سوال کے جواب میں تنویریت کیا ہے؟ کہا کہ تنویریت انسانیت کا حد بلوغیت کو پار کرنا ہے جب انسان اپنی تمام خودساختہ پابندیوں اور جکڑ بندیوں کو اتار پھینکے۔ سوائے اپنی ذات کے کسی اور کی مدد اور محتاجی اختیار نہ کرے۔ اپنی سمجھ اور فیصلوں کے لیے صرف اپنے اوپر اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرے۔ اس موقع پر تحریک تنویر کی جو علمیت قرار پائی وہ تھی جدید سائنس اور سائنٹفک

عیسائیت اور سائنس:

سائنس کی تاریخ میں کوپرنیکس کے نظام شمسی سے متعلق نظریے کو انقلاب کی حیثیت حاصل ہے۔ جدید سائنس سے پہلے عیسائیت "زمین مرکز کائنات" کے نظریے کی قائل تھی۔ اس نظریے کے مطابق دنیا کائنات کا مرکز ہے۔ سورج اور باقی تمام سیارے اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ گو کہ یہ نظریہ اصل میں ارسطو کا تھا لیکن عیسائی پادریوں نے یونانی فلسفے سے مرعوبیت کی بناء پر اسے عیسائی عقائد کا حصہ بنا لیا تھا۔ ان کے خیال میں اس نظریے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے انسان کے خداوند کریم کے مقرب ہونے اور عیسائیت کے حق ہونے کی دلیل ملتی تھی۔ کوپرنیکس نے جب سائنسی اصولوں کے تحت "سورج مرکز کائنات" کا نظریہ پیش کیا تو اس سے عوام کے درمیان عیسائیت کی ساکھ کو زبردست جھٹکا لگا۔ اس نظریے کے تحت نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ گلیلیو کی ایجاد کردہ دوربین نے اس نظریے کو مزید حسّی شواہد فراہم کیے۔ اس واقعہ کو سائنس کی جیت اور مذہب کی ہار سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لوگوں کا عیسائی مذہب کے ذریعہ علم ہونے پر سے اعتماد اٹھ گیا اور یورپ کی عوام علم اور راہنمائی کے لیے سائنسی علوم اور سائنس دانوں کی طرف دیکھنے لگے۔

جدید سائنس اور اس کے اغراض و مقاصد:

سائنس اور اس سے متعلقہ علوم کا مقصد فطرت کے خزانوں کی کھوج لگانا اور انسانیت کے علم میں اضافہ کرنا کہا جاتا ہے۔ لیکن معلومات کے اس اضافہ کو اسی وقت درست گردانا جائے گا جب اس کے حصول کے لیے سائنٹفک میتھڈ استعمال کیا گیا ہو۔ کسی بھی علم کو صرف اسی وقت سائنس کا درجہ حاصل ہوتا ہے جب اس میں سائنٹیفک میتھڈ کو مستقل حیثیت حاصل ہو جائے۔ جدید سائنس کے ابتدائی دور میں سائنسدانوں کی زیادہ تر توجہ کا مرکز نیچرل سائنس یعنی طبیعات، کیمیاء حیاتیات اور ریاضی رہے۔ ان علوم کی مدد سے انسان مادے اور اشیاء کی خصوصیات کو جاننے اور پھر ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ اس طریقہ سائنس کا مکمل دارومدار انسانی سمجھ اور صلاحیتوں پر تھا۔ اس میں کہیں بھی خدا کی محتاجی یا راہنمائی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ تحریک تنویر کے فلسفیوں (خصوصاً کانٹ) کو نیوٹن کا یہ سائنسی طریقہ بہت پسند آیا اور انہوں نے اس طریقہ کو باقی معاشی، معاشرتی اور سیاسی علوم میں رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی جس کا ثبوت موجود دور میں تقریباً تمام علوم کے ساتھ لفظ "سائنس" کا اضافہ ہے مثلاً پولیٹیکل سائنس، مینجمنٹ سائنس وغیرہ اور ان علوم میں کہیں بھی وحی یا خدا کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

جدید سائنس کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد بتائے جاتے ہیں

1۔ دنیا و کائنات کے مظاہر کی تفتیش اور ان کو انسانی عقل کے مطابق سمجھنا۔

2۔ ان مظاہر کے اسباب و علل بیان کرنا۔

3۔ ان مظاہر کی ٹھیک پیشن گوئی کرنا۔

4۔ ان مظاہر کو قابو کر کے ان پر اختیار حاصل کرنا۔

مختصراً یہ کہ سائنسی علمیت انسان کے حصول علم کی ایک ایسی کاوش کا نام ہے جس کا مکمل دارومدار انسانی عقل، حواس اور سمجھ بوجھ پر ہے اور جس کا مقصد انسان کو دنیا اور کائنات کے مظاہر پر زیادہ سے زیادہ اختیار دلانا ہے تاکہ

وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

سائنس کا ارتقائی نظریہ سچائی:

اسلامی علمیت اور سائنسی علمیت کا ایک اور بڑا واضح فرق ان دونوں کا نظریہ سچائی ہے۔ اسلام میں "الحق" ایک ہے جو ہر زمان و مکان کے لیے ایک اٹل حقیقت ہے، جبکہ سائنس ارتقائی نظریہ سچ کی قائل ہے۔ سائنسی علوم میں کوئی اٹل سچ یا سچائی نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانے کے سائنسدان اپنے زمانے کی معلومات کی بنیاد پر مختلف نظریات کو سچ قرار دیتے ہیں۔ یہ نظریات اس وقت تک سچائی کے مرتبے پر فائز رہتے ہیں جب تک یا تو یہ غلط ثابت نہیں کر دیے جاتے یا ان سے بہتر کوئی نظریہ پیش نہیں کر دیا جاتا۔ سائنس کی دنیا میں نہ صرف ہر زمانے میں الگ سچ ممکن ہے بلکہ ایک زمانے میں کئی سچ بھی ممکن ہیں۔ اس بکھری ہوئی کیفیت کو یکجا کرنے کے لیے سائنسی دنیا میں تحقیقی اشاعتوں کا ایک نظام رائج ہے۔ ایک سائنسدان کے کام کو جانچنے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کتنے تحقیقی مقالے شائع کیے ہیں اور اس کے کام کو کتنے تحقیقی مقالے حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہر نیا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہر نئے زمانے میں اور زیادہ معلومات جمع کر لی جاتی ہے۔ سائنس میں ترقی سے مراد محض اور زیادہ سے زیادہ ایسی دنیاوی معلومات کا جمع ہو جانا ہے جس سے انسان اور بھی زیادہ کائنات پر تصرف حاصل کر سکے جبکہ اسلام کے مطابق بہترین زمانہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم، پھر تابعین اور پھر تبع تابعین ہر گزرتے زمانے کے ساتھ دین داری کے رجحان میں کمی اور مسلمانوں میں مجموعی طور پر خوف خدا سے دوری بڑھ رہی ہے اور کیونکہ شریعت میں علم کا تعلق تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی لحاظ سے موجودہ دور میں علم کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

سائنٹفک میتھڈ (یعنی سائنسی طریقہ کار):

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ سائنسی طریقہ کار میں کسی بھی معلومات کو حتمی اور آخری حقیقت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس میں مستقل تحقیقات اور تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ اس طریقے کو تجرباتی طریقہ کار بھی کہا جاتا ہے اس میں سائنسدان مشاہدے، تجربے اور عقلی دلائل کی مدد سے مظاہر کی تفتیش اور پھر اس سے علم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طریقہ کار میں ضروری نہیں کہ نتائج پہلے سے معلوم ہوں لہٰذا نتائج کے معتبر ہونے کا تعلق نتیجے سے نہیں بلکہ طریقہ کار سے ہوتا ہے تجرباتی طریقہ سائنس کے نتائج اتنے ہی زیادہ معتبر سمجھے جائیں گے جتنا زیادہ سائنسی طریقہ مشاہدہ اور عقلی دلائل استعمال کیے گئے ہوں گے اس بات کو ریاضی کے سوال کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں سوال سے صحیح جواب تک پہنچنے کے لیے ریاضی کے تصدیق شدہ اصولوں کو استعمال کرنے کی پابندی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے انسان کے خداوند کریم کے مقرب ہونے اور عیسائیت کے حق ہونے کی دلیل ملتی تھی۔ کوپرنیکس نے جب سائنسی اصولوں کے تحت "سورج مرکز کائنات" کا نظریہ پیش کیا تو اس سے عوام کے درمیان عیسائیت کی ساکھ کو زبردست جھٹکا لگا۔ اس نظریے کے تحت نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ گلیلیو کی ایجاد کردہ دوربین نے اس نظریے کو مزید حسّی شواہد فراہم کیے۔ اس واقعہ کو سائنس کی جیت اور مذہب کی ہار سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لوگوں کا عیسائی مذہب کے ذریعۂ علم ہونے پر سے اعتماد اٹھ گیا اور یورپ کی عوام علم اور راہنمائی کے لیے سائنسی علوم اور سائنس دانوں کی طرف دیکھنے لگے۔

جدید سائنس اور اس کے اغراض و مقاصد:

سائنس اور اس سے متعلقہ علوم کا مقصد فطرت کے خزانوں کی کھوج لگانا اور انسانیت کے علم میں اضافہ کرنا کہا جاتا ہے۔ لیکن معلومات کے اس اضافہ کو اسی وقت درست گردانا جائے گا جب اس کے حصول کے لیے سائنٹفک میتھڈ استعمال کیا گیا ہو۔ کسی بھی علم کو صرف اسی وقت سائنس کا درجہ حاصل ہوتا ہے جب اس میں سائنٹیفک میتھڈ کو مستقل حیثیت حاصل ہو جائے۔ جدید سائنس کے ابتدائی دور میں سائنسدانوں کی زیادہ تر توجہ کا مرکز نیچرل سائنس یعنی طبیعات' کیمیاء حیاتیات اور ریاضی رہے۔ ان علوم کی مدد سے انسان مادے اور اشیاء کی خصوصیات کو جاننے اور پھر ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ اس طریقہ سائنس کا مکمل دارومدار انسانی سمجھ اور صلاحیتوں پر تھا۔ اس میں کہیں بھی خدا کی محتاجی یا راہنمائی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ تحریک تنویر کے فلسفیوں (خصوصاً کانٹ) کو نیوٹن کا یہ سائنسی طریقہ بہت پسند آیا اور انہوں نے اس طریقہ کو باقی معاشی' معاشرتی اور سیاسی علوم میں رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی جس کا ثبوت موجودہ دور میں تقریباً تمام علوم کے ساتھ لفظ "سائنس" کا اضافہ ہے مثلاً پولیٹیکل سائنس' مینجمنٹ سائنس وغیرہ اور ان علوم میں کہیں بھی وحی یا خدا کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

جدید سائنس کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد بتائے جاتے ہیں

1۔ دنیا و کائنات کے مظاہر کی تفتیش اور ان کو انسانی عقل کے مطابق سمجھنا۔

2۔ ان مظاہر کے اسباب و علل بیان کرنا۔

3۔ ان مظاہر کی ٹھیک ٹھیک پیشن گوئی کرنا۔

4۔ ان مظاہر کو قابو کر کے ان پر اختیار حاصل کرنا۔

مختصراً یہ کہ سائنسی علمیت انسان کے حصول علم کی ایک ایسی کاوش کا نام ہے جس کا مکمل دارومدار انسانی عقل' حواس اور سمجھ بوجھ پر ہے اور جس کا مقصد انسان کو دنیا اور کائنات کے مظاہر پر زیادہ سے زیادہ اختیار دلانا ہے تاکہ

وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

سائنس کا ارتقائی نظریہ سچائی:

اسلامی علمیت اور سائنسی علمیت کا ایک اور بڑا واضح فرق ان دونوں کا نظریہ سچائی ہے۔ اسلام میں "الحق" ایک ہے جو ہر زمان و مکان کے لیے ایک اٹل حقیقت ہے' جبکہ سائنس ارتقائی نظریہ سچ کی قائل ہے۔ سائنسی علوم میں کوئی اٹل سچ یا سچائی نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانے کے سائنسدان اپنے زمانے کی معلومات کی بنیاد پر مختلف نظریات کو سچ قرار دیتے ہیں۔ یہ نظریات اس وقت تک سچائی کے مرتبے پر فائز رہتے ہیں جب تک یا تو یہ غلط ثابت نہیں کر دیے جاتے یا ان سے بہتر کوئی نظریہ پیش نہیں کر دیا جاتا۔ سائنس کی دنیا میں نہ صرف ہر زمانے میں الگ سچ ممکن ہے بلکہ ایک زمانے میں کئی سچ بھی ممکن ہیں۔ اس بکھری ہوئی کیفیت کو یکجا کرنے کے لیے سائنسی دنیا میں تحقیقی اشاعتوں کا ایک نظام رائج ہے۔ ایک سائنسدان کے کام کو جانچنے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کتنے تحقیقی مقالے شائع کیے ہیں اور اس کے کام کو کتنے تحقیقی مقالے حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہر نیا زمانہ' پچھلے زمانے سے بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہر نئے زمانے میں اور زیادہ معلومات جمع کر لی جاتی ہے۔ سائنس میں ترقی سے مراد محض اور زیادہ سے زیادہ ایسی دنیاوی معلومات کا جمع ہو جانا ہے جس سے انسان اور بھی زیادہ کائنات پر تصرف حاصل کر سکے جبکہ اسلام کے مطابق بہترین زمانہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم' پھر تابعین اور پھر تبع تابعین ہر گزرتے زمانے کے ساتھ دین داری کے رجحان میں کمی اور مسلمانوں میں مجموعی طور پر خوف خدا سے دوری بڑھ رہی ہے اور کیونکہ شریعت میں علم کا تعلق تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی لحاظ سے موجودہ دور میں علم کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

سائنٹفک میتھڈ (یعنی سائنسی طریقہ کار):

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ سائنسی طریقہ کار میں کسی بھی معلومات کو حتمی اور آخری حقیقت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس میں مستقل تحقیقات اور تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ اس طریقے کو تجرباتی طریقہ کار بھی کہا جاتا ہے اس میں سائنسدان مشاہدے' تجربے اور عقلی دلائل کی مدد سے مظاہر کی تفتیش اور پھر اس سے علم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طریقہ کار میں ضروری نہیں کہ نتائج پہلے سے معلوم ہوں لہٰذا نتائج کے معتبر ہونے کا تعلق نتیجے سے نہیں بلکہ طریقہ کار سے ہوتا ہے تجرباتی طریقہ سائنس کے نتائج اتنے ہی زیادہ معتبر سمجھے جائیں گے جتنا زیادہ سائنسی طریقہ مشاہدہ اور عقلی دلائل استعمال کیے گئے ہوں گے اس بات کو ریاضی کے سوال کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں سوال سے صحیح جواب تک پہنچنے کے لیے ریاضی کے تصدیق شدہ اصولوں کو استعمال کرنے کی پابندی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے سوال کا جواب پہلے سے معلوم نہیں ہوتا لیکن اسے حل کرنے کے دوران تصدیق شدہ اصولوں کی پابندی کے طریقہ یعنی میتھڈ کی وجہ سے جواب معتبر ہو جاتا ہے نیوٹن نے اپنی کتاب Principia Mathematica میں سائنس (Natural Philosophy) کے ریاضی اصول بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

مختصراً یہ کہ سائنٹفک میتھڈ کی آخری حد انسانی مشاہدہ، عقل اور سمجھ ہے۔ مشاہدے کی تفصیل حواس خمسہ اور اس کی حدود وہ تمام آلات جو ان حواس کا تسلسل، مددگار و معاون تصور کیے جاتے ہیں مثلاً دوربین اور خردبین انسان کی قوت بینائی کی صلاحیت میں بے تحاشا اضافہ کرتے ہیں۔

عقلیت کا تعلق استقرائی اور استخراجی طریقہ دلیل سے ہے استقرائی وہ طریقہ دلیل ہے جس میں انسان جزوی مشاہدے اور حادثوں سے کلی اصول اخذ کرتا ہے جبکہ استخراجی طریقہ دلیل اس کا الٹ یعنی کلی اصول سے جزیات کا استخراج ہے۔ جبکہ سائنٹفک میتھڈ میں انسانی سمجھ سے مراد پہلے ادوار کی وہ تمام معلومات اور تجربوں کا مجموعہ ہے جو اس سائنسی طریقہ مشاہدے اور عقلیت سے جمع کیا گیا ہو۔ سائنسی تحقیق میں Literature review سے مراد یہی سمجھ ہے۔ سائنسی میتھڈ کی ایک اور خصوصیت اس کا متعین خصوصی حالات میں ہر بار ایک ہی جیسے نتائج پر پہنچنا ہے۔ ان متعین خصوصی حالات کی مدد سے کوئی بھی سائنس دان کسی بھی تحقیقی تجربے کو دہرا سکتا ہے۔

یہ سائنسی طریقہ کار موجودہ دور کے اکثر علوم میں تحقیقی طریقہ کار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ تحقیقی طریقہ کار عددی (Quantitatine) یا تاثراتی (Quali tative) ہو سکتا ہے۔ عددی ہونے کی صورت میں معلومات میں اضافے یا تصدیق کے لیے شماریات استعمال کی جاتی ہے جبکہ تاثراتی ہونے کی صورت میں رائے تصورات اور تشدد وں کی مدد لی جاتی ہے۔

پس جدیدیت اور سائنس:

تحریک تنویر اور جدیدیت کے مفکرین سائنس اور سائنسی طریقہ کار کو معلومات حاصل کرنے کا بہترین آفاقی طریقہ سمجھتے تھے لیکن پس جدیدیت کے مفکر سائنس اور سائنٹفک میتھڈ کی اس آفاقی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے تاریخ کا اتفاق سمجھتے ہیں کہ اسے ایک علمی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جدیدیت کی سائنس کسی مخصوص سچ کی قائل تو نہ تھی بلکہ (کسی ممکنہ) سچ کی جانب بڑھنے والے طریقے (یعنی سائنٹفک میتھڈ) کی قائل تھی لیکن پس جدیدیت کیونکہ کسی سچ کو ممکن ہی نہیں سمجھتی لہٰذا وہ کسی مخصوص طریقہ کار کے بہتر ہونے کی بھی قائل نہیں۔ پس جدیدیت کے نکتہ نظر سے سائنس، ٹیکنالوجی یا کسی بھی مضمون میں امتیازی حیثیت متعین کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ مختصراً یہ کہ موجودہ دور میں پس جدیدیت نہ تو سائنس کو رد کرتی ہے اور نہ ٹیکنالوجی کو بلکہ وہ تو صرف سائنس کو کوئی امتیازی

حیثیت دینے کی انکاری ہے۔

اوپر دی ہوئی تاریخ، تفصیل اور دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ سائنس سے مراد ایک ایسی علمیت ہے جس کا دارومدار صرف اور صرف انسانی سمجھ اور عقل پر ہے۔ سائنسی علمیت کو وحی سے کوئی سروکار نہیں۔ جدید یورپ نے اسے عیسائیت سے بغاوت کرنے اور بے دین مغربی تہذیب کی بنیاد رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کا مقصد کائنات کو تسخیر کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونا ہے۔ بعض مسلمان قرآن کریم میں سائنس تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر شرعی احکام کی حمایت کے لیے سائنسی دلیل دینے کی کوشش کرتے ہیں یہ دونوں ہی رویے سائنس کی حقیقت کو نہ پہچاننے کے باعث اور مرعوبیت کا نتیجہ ہیں۔ یہ وہی راہ ہے جس پر عیسائیت یونانی فلسفے کی آمیزش کے بعد چلی اور بالآخر شکست سے دوچار ہوئی۔ گلیلیو کا مشہور قول ہے

"Bible tells us the way to go to Heaven and not the way the Heavens go" (Galileo)

ترجمہ: بائبل ہمیں جنت کے راستے کی راہنمائی تو کرتی ہے لیکن کائنات میں کارفرما اصول نہیں بتاتی۔

لہٰذا جسے آخرت کی فکر ہو اور جو اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لیے تو ذریعہ علم صرف وحی ہے باقی جو دنیا سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ذریعہ معلومات سائنس ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹیکنو سائنس......ایک تجزیہ

سید ذیشان ارشد

آج ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ذہنوں پر سائنسی علمیت کا غلبہ اور روزمرہ زندگی میں مکمل طور پر ٹیکنالوجی پر انحصار ہے ایک عام آدمی کا ٹیکنالوجی کے بغیر زندگی کو تصور کرنا ممکن نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کا ٹیکنالوجی سے مرعوب ہوجانا، سائنس اور ٹیکنالوجی کے تاریخی تصورات سے ناآشنائی کے باعث ان پر کوئی حتمی اسلامی رائے کا نہ رکھ پانا ایک فطری امر ہے۔ درج ذیل مضمون میں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ

اول: سائنس اور ٹیکنالوجی کے تاریخی فرق کو واضح کریں۔ دوم: ٹیکنالوجی اور اقدار کے تعلق کو واضح کریں

سوم: موجودہ دور کی ٹیکنالوجی یعنی ٹیکنو سائنس کی تفصیل اور بنیادی قدر کو بیان کریں۔

امید ہے کہ ان تصورات کے واضح ہوجانے کے بعد اہل ایمان کے لیے موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کے چیلنجز /خطرات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کا تاریخی فرق:

جیسے کہ ہم نے پچھلے مضمون میں دیکھا کہ جدید سائنس کی ابتداء جدیدیت کے سائنسدانوں سے ہوتی ہے جدید سائنس کو وحی کی متبادل علمیت تصور کیا جاتا ہے اور انسانی کلیات پر مبنی اس ذریعہ معلومات کا دارومدار سائنٹفک میتھڈ پر ہے۔ اس مخصوص سائنٹفک میتھڈ پر مبنی سائنس کی تاریخ کی اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں۔ البتہ اس کی کچھ حصوں کی جڑیں قدیم یونانی فلسفے میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ جبکہ دوسری جانب لفظ ٹیکنالوجی کا ماخذ ٹیکنیک یعنی تدبیر ہے۔ اور انسانی تاریخ میں متعدد روزمرہ مسائل کے لیے مختلف معاشروں سے کئی تدابیر ثابت ہیں۔ مثلاً ہر تہذیب نے اپنے طور پر گھر، برتن، ہتھیار اور اوزار بنانے کے فن سیکھے اور سکھائے اور تدابیر اختیار کیں یہی بات تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے اور جوتوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ مختصراً یہ کہ مختلف طرح کے مسائل ہوں یا بیماری، ہر زمانے اور تہذیب کے لوگوں نے ان سے نمٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور اختیار کی۔ جو تدابیر سہل اور فائدہ مند تھیں وہ مقبول عام ہوئیں جبکہ اکثر آہستہ آہستہ ناپید ہوگئیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے معاملات، مسائل کے حل اور مشاغل کے فروغ کے لیے اختیار کی گئی تدابیر اس زمانے کی ٹیکنالوجی قرار پائی۔ مثال کے طور پر قدیم مصری تہذیب میں اہرام مصر بنانے اور مردہ جسم کو حنوط کرنے کی ٹیکنالوجی تو تھی لیکن جدید سائنس نہ تھی۔ اہرام بنانا اور

لاشوں کو حنوط کرنا قدیم مصر کی روایات کا حصہ تھا لہٰذا ان مشاغل کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں۔ اسی طرح موئن جو دڑو اور ہڑپہ شہری ثقافتیں تھیں لہٰذا ان تہذیبوں کی civil tecnology خاص ترقی یافتہ تھیں مثلاً ان جگہوں پر نکاسی آب کا بہترین نظام تھا لیکن یہاں بھی جدید سائنس جیسی کسی علمیت کا پتہ نہیں ملتا۔

قدیم یونان میں لفظ ٹیکنی سے مراد ایک فن پارہ (یعنی آرٹ کا نمونہ) تھی۔ چونکہ حسن پرستی قدیم یونان کی بنیادی قدر تھی لہٰذا یونان کی تہذیب اور teconolgy artifart میں خوبصورتی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر قدیم یونان میں ستون اصل میں اس لیے ترچھے بنائے جاتے تھے کہ وہ دیکھنے والے کو سیدھے معلوم ہوں۔ اس معاشرے میں ٹیکنالوجی کا تعلق آرٹ سے تھا نہ کہ کسی سائنس نما علمیت سے۔

قدیم تہذیبوں کے بعد قرون وسطیٰ کے یورپ میں رومیوں نے بھی بھرپور تدبیریں کین۔ یہ قوم اپنی عسکری فتوحات اور جنگی چالوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ انہوں نے یونان کو فتح کرنے کے بعد یورپ کے ایک بڑے حصے پر تقریباً ہزار سال تک حکومت کی۔ رومیوں کی قابل ذکر ٹیکنالوجی یعنی تدابیر میں فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے پکی سڑکوں کی تعمیر، حکومت کے کونوں کونوں تک ترسیل اطلاع کا انتظام، بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے پکے گھروں کی تعمیر، شہروں میں پانی کا انتظام اور گرم حمام وغیرہ ہیں۔ رومیوں کی اکثر تدابیر آسان اور عوامی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔

اوپر کی مثالوں سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ اول تو یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں جیسے کہ ہمیں آج کل کی دنیا میں نظر آتا ہے۔ بلکہ تاریخ میں جدید سائنس کے بغیر بھی ٹیکنالوجی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے۔ دوسری خاص بات یہ کہ ٹیکنالوجی یا تدبیر قدر سے آزاد نہیں ہوتی بلکہ اس معاشرے کی بنیاد اور ایمانیات اس ٹیکنالوجی یا تدبیر میں پنہاں ہوتی ہیں۔

موجودہ دور کی ٹیکنالوجی: ٹیکنو سائنس (Tecnoscience)

ایک عام صارف کے لیے موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں فرق کرنا ممکن نہیں۔ جدید پیداواری اشیاء (مصنوعات ہوں یا خدمات) سائنس اور ٹیکنالوجی کا مرکب نظر آتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پنپنے والے اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخصوص مرکب کو اکثر مغربی مفکرین (مثلاً برونو لاٹور) ٹیکنو سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں ٹیکنو سائنس محض ایک تدبیر نہیں بلکہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے جدید سائنسی طرز فکر پر مبنی اور سرمایہ دارانہ اداروں کی تحقیقی مد میں مالی معاونت سے بنائی جانے والی تدبیر کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ٹیکنالوجی انسان کی ضروریات سے زیادہ انسان کی خواہشات کی تکمیل میں مصروف نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک سادہ اور مضبوط موٹر کار شہری زندگی میں سواری کی ضرورت تو ہوسکتی ہے لیکن روز بروز بدلتے ہوئے دلکش ماڈل اور ڈیزائن کے کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معنی؟ اسی طرح ٹیلی فون کی بڑھتے ہوئے فاصلوں اور رابطوں کو کم کرنے کی ضرورت تو ہے لیکن ان کے بڑھتے چڑھتے ماڈل اور خصوصیات محض منافع بڑھانے کی ترکیبیں ہیں۔

موجودہ دور کی ٹیکنالوجی (یعنی ٹیکنو سائنس) کا دارومدار سرمایہ دارانہ نظم اور جدید سائنس پر ہے اور یہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ایک موثر آلہ کار ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں بنائی جانے والی بیشتر ٹیکنالوجی ملکوں کی جنگی اور دفاعی ضرورتوں کا نتیجہ تھیں۔ امریکا، روس اور یورپی ممالک نے جنگ عظیم اول اور دوئم کے دور میں بے تحاشا ایجادیں بھی کیں اور انہیں موثر طور پر استعمال بھی کیا۔ بعد میں سرد جنگوں کے دوران مختلف ترقی یافتہ ملکوں کے دفاعی اداروں اور سرمایہ کار کارپوریشن نے اس عمل کو جاری رکھا۔ ان میں چند قابل ذکر نام امریکی خلائی تحقیق کا ادارہ NASA اور امریکا ہی کا محکمہ دفاع ہے۔ موجودہ دور میں ٹیکنو سائنس تحقیق کثیر سرمائے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ سرمایہ یا تو کوئی حکومتی ادارہ اپنی دفاعی یا جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فراہم کرے گا یا پھر کوئی ایسی بین الاقوامی سرمایہ کار کمپنی جسے اپنے منافع کی بڑھوتری کے لیے کسی ٹیکنیکی جدت کی ضرورت ہو۔ اس کثیر سرمائے سے جدید ٹیکنیکی آلات سے لیس سائنسی تجربہ گاہیں اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔ اور پھر یہاں دنیا کے بہترین دماغ جمع کیے جاتے ہیں جو ایسی تحقیق کرسکیں جس کے نتیجے میں سرمائے کو مزید فروغ حاصل ہو یا سرمائے کو فروغ دینے والی ریاست کا دفاع ہو سکے۔ مختصر یہ کہ سرمایہ دارانہ نظم میں سرمائے کی بڑھوتری کے مخصوص مقصد کی خاطر جدید سائنس کے تسخیر کائنات والے اصول کے تحت تدبیر کا نام ٹیکنو سائنس ہے۔

نظریہ اور عمل: جدید دور کے معاشرے میں نظریہ اور عمل کی بحث بہت اہم ہے۔ روایتی طور پر اس بحث میں دو انتہائی متضاد نکتہ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف مفکرین کا خیال ہے کہ نظریہ، عقائد یا خیالات کی بنیاد پر معاشرے میں عمل اور عملی طریقے رائج ہوتے ہیں جبکہ تاریخی مادیت کے حامیوں کے مطابق معاشرے کے عمل اور رائج عملی طریقوں سے لوگوں کے نظریات اور عقائد نشو ونما پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں علم کا منبع مادی دنیا قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان دین کا علم حاصل کرتے ہیں اور علماء کی مدد سے اسے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رائج کرتے ہیں لیکن موجودہ مسلمان معاشروں میں ایسی صورت بالکل بھی نہیں نظر آتی۔ آج کا مسلمان زیادہ تر دنیا کمانے کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اور دین کی معلومات ناظرہ قرآن مجید اور نماز کی دعاؤں تک محدود ہے۔ اس قدر کمزور علمی بنیادوں کے ساتھ جب ایک عام مسلمان کا ٹیکنو سائنس سے سامنا ہوتا ہے تو وہ اس کی بنیادی قدر بڑھوتری برائے بڑھوتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عبادت کم اور تصرف فی الارض زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی شناخت عبد کے بجائے ایک اچھے صارف کی ہو جاتی ہے لہٰذا موجودہ دور میں سرمایہ داری اور ٹیکنو سائنس کے طاغوت سے دفاع کے لیے دین کا علم اور معرفت الٰہی لازمی ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

سرمایہ دارانہ تنظیم اقتدار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست

حقیقت...... ماہیت

ڈاکٹر جاوید انصاری

دورِ حاضر میں جو ریاستی نظم دنیا پر مسلط ہے وہ سرمایہ دارانہ نظم اقتدار ہے اور اسکے استحکام اور توسیع سے اسلامی انفرادیت، معاشرت اور ریاست شدید خطرات سے دوچار ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ اقتدار کی موجودگی میں مذہبی اقدار تادیر قائم رکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ مغرب میں عیسائی اقدار کی تباہی اس کا واضح تاریخی ثبوت ہے۔ نفس مضمون یعنی سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے سے قبل ہم چند اصولی تمہیدی نکات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ریاستی معاملات پر انقلابی نقطہ نظر اختیار کرنے کی اہمیت واضح ہوگی۔

اولاً: خلافت یعنی شریعت محمدی کی پابند حکومت کے قیام کے بغیر نہ تو اسلام کو قوت اور غلبہ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی طاغوتی نظام کا خاتمہ ممکن ہے۔ شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے، لہٰذا ریاست اسلامیہ کے قیام کیلئے جو ذرائع ناگزیر ہیں ان کے حصول کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے

ثانیاً: ۱۸۵۷ کے جہاد میں ناکامی اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے لے کر اب تک سرمایہ دارانہ استعمار کے جواب میں احیائے اسلام کیلئے بے شمار تحریکات برپا ہوئیں جن کے کام کو تقسیم کار کے اعتبار سے چار سطحوں پر رکھا جا سکتا ہے:

۱۔ مدرسین اور مزکی:

ان کا بنیادی ہدف اسلامی علوم کا تحفظ اور اسلامی انفرادیت و تشخص کا فروغ ہے۔ ان کے بنیادی ادارے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ ہیں

۲۔ مبلغین اور مصلحین:

ان کا بنیادی مقصد اسلامی معاشرت کا استحکام و فروغ ہے اور جو دینی تہذیبی روایات کے تحفظ و فروغ اور حلال کاروبار کے پھیلاؤ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں کام تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کا ہے جو صحیح معنی میں عوامی اسلامی تحریکات ہیں

۳۔ انقلابی:

ان کا نقطہ ماسکہ ریاست کی اسلامی نہج پر اصلاح و قیام ہے اور یہ رائج شدہ نظام زندگی میں مکمل تبدیلی کے خواہاں ہیں۔

۴۔ مجاہدین:

ان کا مرکزی نکتہ بھی تعمیر و غلبہ اسلامی ریاست ہے اور یہ استعمار اور اس کے ایجنٹوں سے عسکری سطح پر برسرپیکار ہیں اور طاغوتی طاقتوں کے پھیلاؤ کے مدمقابل مزاحمت پیدا کر کے اسلامی ریاستوں کے قیام کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال طالبان عالیشان ہیں

اول الذکر دو تحریکات دفاع امت جبکہ موخر الذکر دونوں غلبہ دین کی تحریکات ہیں۔ یہ تمام راسخ العقیدہ دینی گروہ پورے اخلاص کے ساتھ اپنے اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ البتہ انکے کاموں میں ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ تینوں کام اس معنی میں جدا جدا ہوگئے ہیں کہ تطہیر نفس اور اصلاح معاشرے کا کام وہ علماء و صوفیاء اور جماعتیں کر رہی ہیں جو تعمیر ریاست کے کام سے لاتعلق ہیں، اسی طرح تعمیر ریاست اور جہاد کا کام وہ جماعتیں کر رہی ہیں جن کے پاس بالعموم تطہیر قلب کا کوئی واضح ضابطہ موجود نہیں ہے۔ نتیجتاً تطہیر قلب کا کام محض تبلیغ و تطہیر اور ریاست کا کام محض قتال یا جمہوری عمل بن کر رہ گیا ہے۔ تقریباً ہر اسلامی گروہ اور جماعت اپنے کام کو دوسرے اسلامی گروہ کے کام کا متبادل (substitute) اور اس سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہے جبکہ حقیقتاً انکے درمیان تعلق ایک دوسرے کے تکملے (complementarity) کا ہے اور ان تینوں میں سے کسی دینی کام کو دوسرے دینی کام پر کوئی اقداری فوقیت حاصل نہیں۔ اصل ضرورت کسی نئے دینی کام کو شروع کرنے یا ایک دینی کام کو چھوڑ کر کسی دوسری دینی جماعت میں ضم ہوجانے یا کوئی ایسی نئی دینی جماعت بنانے کی نہیں جو سب کام کرے کیونکہ الحمدللہ مختلف انفرادی دینی جماعتوں کا کام مِلکر مطلوبہ مجموعی دینی کام کی کفایت کرتا ہے، اصل ضرورت موجودہ دینی تحریکات کے کام میں ارتباط پیدا (relate) کرنے کی ہے۔ ہر دینی گروہ اس بات کو لازم پکڑے کہ اپنے کارکنان کو دوسری دینی تحریکات کا قدردان بنائے اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر رغبت دلائے۔ جب تک اسلامی گروہوں میں اشتراک عمل کا یہ طرز فکر عام نہ ہوگا، دوسرے گروہ کے دینی کام کو برابر اہمیت نہ دی جائے گی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مجموعی کام کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نہیں کیا جائے گا انقلابی جدوجہد کا سہ جہتی (three dimensional) کام ادھورا ہی رہے گا۔

ثالثاً: ان تحریکات کی جدوجہد بالعموم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتی ہے اور ان کے پاس ریاست کے اندر ریاست (state within the state) قائم کرنے کا کوئی لائحہ عمل موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری وساری کام کے باوجود اسلامی قوت یکجا نہیں ہو رہی اور ان غیر مجتمع انفرادی دینی کاموں کے نتیجے میں غلبہ دین کے امکانات سامنے نہیں آتے اور نہ ہی تحفظ دین کا کام کما حقہ ہو پاتا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ دفاع اور ردعمل کی پوزیشن ہی میں رہتے ہیں۔ موجودہ ریاستی ڈھانچے کے حوالے سے اسلامی تحریکات کے رویوں میں دو طرح کی خامیاں ہیں، ایک وہ جو تحفظ امت کی تحریکات کو لاحق ہیں اور دوم وہ جن کا شکار غلبہ دین کی تحریکات ہیں:

(الف) اصلاح انفرادیت و معاشرہ کی تحریکات اصولاً تحفظ اسلام کی تحریکات ہیں جن کا مقصد سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی کے اندر ایک ایسے دائرے کی تلاش رہی ہے جہاں اسلامیت کی حفاظت و بقا ممکن ہو سکے۔ ان تحریکات نے اس مفروضے کی بنیاد پر خود کو ریاستی معاملات سے علیحدہ رکھا ہے کہ نظام اقتدار سے غیر جانبداری کا رویہ ممکن ہے جبکہ یہ مفروضہ درست نہیں۔ ریاست سے غیر جانبداری ناممکن الوقوع شے ہے کیونکہ ریاست تو بالفعل 'موجود' ہے اور وہ احکام کے صدور کے ذریعے فرد اور معاشرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اقتدار کے معاملے میں لاتعلقی یا غیر جانب دار رویے کی کوئی حقیقت نہیں، یا تو آپ کسی نظام اقتدار کے خلاف ہوتے ہیں یا اسکے حق میں ان کے درمیان کوئی راستہ موجود نہیں۔ ہماری سب سے بڑی عوامی تحریکات یعنی دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت ریاستی مسائل سے نہ صرف یہ کہ صرف نظر کرتی ہیں بلکہ انہیں گندگی سمجھتی ہیں۔ یہ جماعتیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ غیر سیاسی جماعتیں ہیں حالانکہ ان کی اس بات کا مطلب اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے باطل نظام اقتدار کی سیادت اور اس سے مصالحت قبول کرلی ہے۔ اقتدار سے لاتعلقی کے امکان کی اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے کا دائرہ دن بہ دن چھوٹا ہوتا چلا جارہا ہے اور سرمایہ داری پر مبنی نظام اقتدار ہم پر غالب آتا جارہا ہے۔ کسی منکر کو ہوتے دیکھ کر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ منکر کے معاملے میں نیوٹرل ہیں، بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ اسکی بالادستی قبول کرتے ہیں اور منکر کے ساتھ یہ مفاہمت اسکی تقویت اور فروغ کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا اقتدار (نہ کہ محض حکومت) اور غلبے کے مسئلے پر تمام دینی کام کو مربوط کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو انفرادی اصلاح تو ہو جائے گی لیکن اسکے نتیجے میں کافر اقتدار کو نقصان نہیں پہنچے گا اور بالآخر اصلاح نفوس بھی مشکل ہوتا چلا جائے گا کیونکہ اصلاح کتنی ممکن ہے اسکا انحصار واقعیت (facticity) کی ان معاشرتی و ریاستی

جکڑ بندیوں پر ہوتا ہے جن سے ایک فرد دوچار ہوتا ہے۔ اسلامی انفرادیت کے فروغ کیلئے ایسی ترتیب اقتدار چاہئے جو واقعیت کو بدل دے اور اسلامی انفرادیت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کردے۔ مصلحانہ جدوجہد کرنے والی تحریکات کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ اسلامی انفرادیت کا سیاسی اظہار اور ترتیب اقتدار خود بخود رونما ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب اسلامی علمیت کے تحفظ کیلئے شعوری طور پر اداراتی صف بندی عمل میں لانا لازم ہے محض افراد کو اسکی اہمیت بتلا دینے سے کام نہیں چلتا تو اسلامی اقتدار کے قیام کیلئے مطلوبہ صف بندی سے صرف نظر کیسے کیا جا سکتا ہے اور اسکا ظہور خود بخود کیسے ہو جائے گا؟ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مدارس میں بھی ریاست و سلطنت کی نظریاتی بحثیں بالکل معدوم ہو گئی ہیں اور متقدمین میں سے کسی مسلم سیاسی مفکر کی کوئی کتاب ہمارے درس نظامی میں شامل نہیں

(ب) انقلابیوں کا اصل کام یہی ہے کہ وہ سارے دینی کام کو اس طرح مجتمع کریں کہ اسلامی اقتدار قائم ہو سکے۔ مگر جن تحریکات نے غلبہ دین کو اپنی جدوجہد کا بنیادی مرکز بنایا انہوں نے یا تو انقلاب کو جمہوری سیاست کا ہم معنی سمجھ لیا یا پھر احتجاجی و مطالباتی سیاست کو۔ یاد رہنا چاہئے کہ ہماری جدوجہد کا مقصد موجودہ نظام اقتدار کے اندر شمولیت نہیں بلکہ ایک متبادل نظام زندگی اور اقتدار قائم کرنا ہے جہاں عوام یا کسی فرد کے بجائے 'اہل الرائے' کا اقتدار قائم ہو جن کی مرضی و مشورے سے ہی ریاست کے امور طے پائیں۔ جن تحریکات نے جمہوری سیاست کو اصل مقصود بنا رکھا ہے انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انقلابی (state within the state) سعی کے بغیر اقتدار نہیں بلکہ حکومتیں تبدیل ہوا کرتی ہیں کیونکہ قانون کے اندر رہ کر کی جانے والی جدوجہد تو loyal disobedience (تابعدارانہ مخلص نافرمانی) ہوتی ہے جسکے نتیجے میں نظام اقتدار تبدیل نہیں ہوتے۔ نظام باطل کے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اقتدار تبدیل کرنے کی خواہش رکھنا self-defeating (تضاد پر مبنی) اصول ہے کیونکہ ہر نظام اقتدار کے قوانین اسکے اپنے استحکام کیلئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اسے ڈھا دینے کے لئے۔ Loyal disobedience کے ذریعے اقتدار تبدیل کرنے کی غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے قانون کو 'غیر اقداری' (value-neutral) سمجھ لیا ہے حالانکہ ہر قانون ایک مخصوص انفرادیت و معاشرت نافذ کرنے کیلئے وضع کیا جاتا ہے اور یہی حال ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری قانون کا بھی ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ شخصیت (ہیومن)، معاشرت (سول سوسائٹی) اور ریاست (ریپبلک) کا قیام و فروغ ہے۔ جو تحریکات خود کو اصولاً اور عملاً انقلابی کہتی بھی ہیں انکے پاس بھی انقلابی عمل کا کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں۔ انکے انقلاب کا تصور بس یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو کسی دعوت کے تحت منظم کر کے حکومت وقت سے بھڑ جاؤ یا اس سے چند مطالبات تسلیم کرالو۔ ظاہر ہے یہ تصور غلط ہے کیونکہ انقلابی عمل کا مطلب ہوتا ہے قوت نافذہ کو موجودہ افراد اور اداروں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھین کر متبادل افراد اور اداراتی صف بندی کے تحت مربوط اور مجتمع کرنا۔ انقلابی تحریکات اس قسم کی سعی پر کوئی توجہ نہیں دیتیں کیونکہ وہ حکومت اور ریاست کے فرق کو سمجھ نہ سکیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سی انقلابی تحریکات ریاستی قوت کے متبادل ادارے قائم کرنے کو ناجائز گردانتی ہیں گویا وہ ریاست کے اندر یاست قائم کیے بغیر انقلاب لانے کا خواب دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی جماعتوں کی مانند انقلابی جماعتیں بھی تحریک لال مسجد کی انقلابی حکمت عملی کو غلط قرار دیتی رہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخ میں کوئی انقلاب محض دعوت و تبلیغ کے زور پر نہیں آیا بلکہ اسکے لئے لازماً قوت کو غالب نظام اقتدار کے خلاف جمع کرنا پڑتا ہے۔ اگر سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں محض حکومتی افراد تبدیل ہو جائیں مگر اقتدار کا مرکز موجودہ ادارے ہی رہیں تو اس جدوجہد سے کوئی بامعنی تبدیلی نہیں ہو پائی۔ وہ لوگ جو انقلابی عمل کی حقیقت اور حکومت و ریاست کے فرق کو نہیں پہچانتے وہ مجاہدین کی جدوجہد کو سمجھنے سے سرے قاصر ہیں، وہ کبھی انہیں غم و غصے کا اظہار کہتے ہیں اور کبھی شدت پسندانہ رویے پر مبنی ردعمل۔ ایسے لوگ مجاہدین کی جدوجہد کو عالمی قوانین کی پاسداری کرنے کے حوالے سے شرع کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں..... **فیا للعجب**

رابعاً: یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دورِ حاضر میں قائم اکثر و بیشتر مسلم ریاستیں کافرانہ نظم اجتماعی پر قائم ہیں گو انہیں چلانے والے مسلمان ہیں، اور ان ریاستوں کا خلافت ہونا تو کجا سلطنت اسلامیہ کے درجے سے بھی دور کا واسطہ نہیں کیونکہ یہ تمام ریاستیں قومی ہیں جہاں حاکمیت کی بنیاد عوامی نمائندگی ہے، جہاں علوم شریعہ کے بجائے سائنسز کی بالادستی ہے، جہاں شرع کے بجائے دستوری قانون نافذ ہے وغیرہ۔ انقلابیوں کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ تحفظ اور غلبہ اسلامی کا کام اسی وجہ سے انتشار کا شکار ہے کہ وہ اسلامی ریاست جو تسلسل کے ساتھ سلطان عبدالحمید ثانیؒ کے دور تک قائم تھی اور جس نے تمام دینی کام کو سمیٹ رکھا تھا اب مفقود ہو گئی ہے۔ سلطان اسی معنی میں ظل اللہ تھا کہ اسکی برکت سے تمام دینی کام مربوط تھے اور اقتدار کی کنجیاں علماء اور صوفیاء کے ہاتھوں میں محفوظ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے مغل سلطنت کے استحکام کی کوششیں کیں (ماسواء اکبر کی حکومت کہ اس نے دینِ الٰہی کو فروغ دینے کی کوشش کی)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ باطل نظام اقتدار کے اندر غلبہ دین کی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی اور اسلامی ریاست قائم کرنا ضروری ہے۔

درج بالا جدوجہد مرتب کرنے کیلئے یہ سمجھنا لازم ہے کہ جس ریاستی نظم سے ہمارا مقابلہ ہے اسکی نوعیت کیا ہے اور یہ ریاست کس طرح کام کرتی ہے کیونکہ ان اصولی مباحث کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ سوال اٹھا سکیں گے کہ کس طرح اسلامی ریاست قائم اور مستحکم کرنے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ اس مضمون میں پیش کردہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کا عمومی خاکہ دو سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے، اولاً سرمایہ دارانہ اقتدار کس کے ہاتھ میں

ہوتا ہے اور دوم یہ اقتدار کیسے قائم رکھا جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ حکومت اور ریاست (نظام اقتدار) میں بہت فرق ہوتا ہے کہ حکومت محض ریاست کا ایک جزو ہے۔

ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ اقتدار کس طرح تشکیل پاتا ہے؟

ریاست نظامِ اقتدار کا نام ہے، چناں چہ جب ہم لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہی سوال اٹھاتے ہیں کہ ''کس کا اقتدار؟''......تو سرمایہ دارانہ ریاست میں ان کو اقتدار حاصل ہوتا ہے جو ایمان لاتے ہیں سرمایہ دارانہ عقلیت پر اور جو موید ہوتے ہیں سرمایہ دارانہ عقلیت کے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت یہ ہے کہ انسان کو تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں، انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ مساوی مواقع ملیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں سرمایہ دارانہ ریاست کا اقتدار ہوتا ہے اور جو صاحبِ معاملہ ہوتے ہیں وہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو اس عقلیت پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ اقتدار کیسے قائم رکھا جاتا ہے؟......وہ سرمایہ دارانہ عقلیت کو Uniyersalize کر کے اقتدار قائم رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کی بنیاد پر تمام فیصلے ہوں اور پورا معاشرہ سرمایہ دارانہ تعقل کو اصل عقلیت کے طور پر قبول کرلے، جتنا وہ اس میں کامیاب ہوں گے اتنا ہی ان کا اقتدار مستحکم ہوگا۔

اس سرمایہ دارانہ تعقل کو آفاقی بنانے کے لیے انہیں ریاستی سطح پر نظامِ اقتدار مرتب کرنا ہوتا ہے، ریاست قوت نافذہ ہے، جو بھی فیصلے ہوں گے، ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ ریاست ہوتی ہے۔

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں' سرمایہ دارانہ عقلیت کو آفاقی بنانے کے لیے دو مختلف ڈھانچے ہیں:

(۱) جمہوری طرزِ اقتدار

(۲) ڈکٹیٹر شپ

ان دونوں طریقوں میں اقتدار کی ہیئت کچھ مختلف ہوتی ہے لیکن عملاً ان دونوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ عقلیت ہی غالب آتی ہے۔

فرماں روائی اور عملداری کس کی ہوتی ہے؟

معاشرہ رضا کارانہ (voluntary) صف بندی سے تشکیل پاتا ہے یعنی افراد اپنی مرضی سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ریاست نظام اقتدار کا نام ہے یعنی ایک جبری صف بندی کی تشکیل کی جاتی ہے۔ اب سب سے بنیادی سوال یہی ہے کہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار کس کو حاصل ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار ان کو حاصل ہوتا ہے جو ''سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو مؤید ہوتے ہیں۔'' سرمایہ دارانہ عقلیت یہ ہے کہ انسان کو تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے زیادہ سے زیادہ مساوی مواقع ملیں، تو جو لوگ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں صاحب اقتدار ہوتے ہیں، وہ اسی سرمایہ دارانہ عقلیت کے بارے میں راسخ العقیدہ ہوتے ہیں۔

فرماں روائی اور عملداری کیسے کی جاتی ہے؟

اب بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کا اقتدار کیسے قائم ہوتا ہے اور کیسے مستحکم ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب پورا معاشرہ سرمایہ درانہ تعقل کو اصل عقلیت کے طور پر قبول کر لے (سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی تمام یا زیادہ سے زیادہ فیصلے ہوں)، گویا اقتدار کو مستحکم کیا جاتا ہے سرمایہ دارانہ عقلیت کو یونیورسلائز یعنی آفاقی بنا کر۔ جس قدر اس سرمایہ دارانہ عقلیت کی توسیع ہو گی، جس قدر سرمایہ دارانہ عقلیت کو معاشرہ میں قبولیت عامہ حاصل ہوتی جائے گی، جتنا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کے داعی اس میں کامیاب ہوں گے، اتنا ہی ان کا اقتدار مستحکم ہو گا۔

ریاستی اقتدار:

ہم نے کہا کہ معاشرہ کے برعکس کہ جہاں تعلقات رضاکارانہ بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں ریاست ایک نظامِ اقتدار کا نام ہے جس کے پاس اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے ایک مخصوص علاقے اور اس کی آبادی کے لیے قوتِ نافذہ بھی موجود ہوتی ہے گویا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کے پاس محض تحکم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے ریاست کی قوت کو بھی استعمال کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں دو مختلف طریقوں سے نظامِ اقتدار مرتب کیا جاتا ہے یعنی اس کے دو مختلف ڈھانچے ہوتے ہیں:

۱۔ جمہوری طریقہ

۲۔ لبرل ڈکٹیٹرشپ یا آمریت

بظاہر ان دونوں طرزِ اقتدار کی ترتیب و تنظیم مختلف ہوتی ہے لیکن عملاً ان دونوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ عقلیت ہی غالب آتی ہے، یعنی یہ دو قالب ہیں لیکن ان دونوں کی روح ''سرمایہ دارانہ عقلیت'' ہی ہے۔ ان دونوں طرزِ اقتدار کو استعمال کر کے سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو آفاقی بنایا جاتا ہے اور ان بظاہر دو مختلف طرزِ اقتدار میں فیصلے سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی کیے جاتے ہیں اور اسی کو مقبول عام بنائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پاکستان کے تناظر میں دینی جماعتوں کی توجہ ''سرمایہ دارانہ عقلیت'' کی مرکزی بحث کی بجائے اس کے قالب یعنی آمریت اور جمہوریت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں دینی جماعتیں سمجھتی ہیں کہ ان کو جمہوری طرز کی حکومت میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی زیادہ آزادی میسر آتی ہے (گو کہ ان پر یہ بھی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کو زیادہ فائدہ آمریت کی حکومتوں نے پہنچایا ہے) لیکن ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت یا آمریت میں ''روح'' ایک ہی کارفرما ہے، اور ان کے متبادل کی بجائے انہی دونوں میں گنجائشیں تلاش کرنے سے ان دونوں سسٹم ہی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ گنجائش تلاش کرنے سے یہ دونوں سسٹم کمزور نہیں ہوتے یا ان کو پیچھے نہیں دھکیلا جا سکتا۔

فرماں روائی کا طریقۂ عمل اور اس کے دو مختلف تصورات:

فرماں روائی کے طریقۂ عمل (Governance process) سے مراد ہے کہ کس طریقے سے احکام صادر کیے جا رہے ہیں اور کس طریقے سے احکام نافذ کیے جا رہے ہیں؟ یعنی نظامِ اقتدار کو مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محض احکام دیے نہ جا رہے ہوں بلکہ ان کو نافذ کرنے کے لیے بھی پوری حکمت عملی اور مشینری موجود ہو، گویا گورننگ پروسیس سے مراد سرمایہ دارانہ عقلیت کی آفاقیت اور اس کے غلبے کو ممکن بنانے کا مخصوص طریقۂ عمل ہے۔

اس سلسلے میں دو مختلف تصورات پائے جاتے ہیں:

☆ ایک تصور تو یہ ہے کہ ہر فرد فطرتاً یہی چاہتا ہے کہ تمتع فی الارض اور خواہشات کو پورا کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں، یعنی معاشرہ اس بات پر راضی ہے اور بداہتاً معاشرے کے ہر فرد کی یہی خواہش ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ہی زندگی کے ہر شعبہ کے ہر دائرہ کار میں فیصلے کیے جائیں اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو غلبہ حاصل ہو۔ یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو انیسویں صدی کے اندر Scottish enlightenment والوں میں کانٹ کی فکر میں ملتا ہے کہ فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اس کی تمام خواہشات کی تسکین ہو۔ لہٰذا اسٹیٹ کو سوسائٹی پر تسلط کی ضرورت نہیں بلکہ ریاست معاشرے کے مختلف افراد جو خواہشات رکھتے ہیں انہی کو پورا اور نافذ کرنے کا معقول ترین طریقہ وضع کرتی ہے، گویا سرمایہ دارانہ لبرل ریاست سرمایہ دارانہ معاشرے کی خواہشات کو پورا کرنے کا ''ذریعہ'' ہوتی ہے، لہٰذا اصولاً و نظراً اس کے تابع ہوتی ہے۔

☆ دوسرا تصور یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد نہیں جانتے کہ انہیں کیا چاہنا چاہیے۔ وہ عقلیت اصلیہ یعنی سرمایہ دارانہ عقلیت کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں، لہٰذا ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو اصلی عقلیت کی نمائندہ ہو، یہی گروہ پوری انسانیت کا نمائندہ گروہ ہے۔ اس گروہ کی ذمہ داری ہے کہ آمریت قائم کر کے لوگوں کو مجبور کریں کہ اس اصلی عقلیت (سرمایہ دارانہ عقلیت) کے مطابق تمام فیصلے کیے جائیں، گویا ریاست محض معاشرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کو معاشرے پر غالب ہونا چاہیے اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عقلیت اصلیہ کو معاشرتی سطح پر اور انفرادی سطح پر نافذ کرنے کے لیے نظام اقتدار کھڑا کرے۔ اب یہ گروہ کون سا ہے اس کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے (وہ مزدوروں کی آمریت یا مخصوص طبقہ یا قوم ہو سکتی ہے)

واضح رہے کہ یہ دونوں تصورات و نظریات ریاست کے اندر خواہشاتِ نفسانیہ کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کی جدوجہد ہی کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ مختلف ہے۔ ایک طریقے میں ریاست معاشرہ کے ماتحت ہے اور ریاست پورا کر رہی ہے ان خواہشات کو جو معاشرے کی dynamic میں خود بخود ابھر کر سامنے آ رہی ہیں اور ریاست ان کی ترتیب، تقدیم اور تاخیر کا ایک ذریعہ ہے، دوسرا طریقہ میں ریاست کو معاشرے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کیا چاہنا چاہیے اور اس کے حصول کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ عقلیت کے نفاذ کے لیے تین بنیادی فرائض:

سرمایہ دارانہ عقلیت کے حاملین سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو معاشرتی سطح پر مرتب کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں، اس کے لیے انہیں تین بنیادی فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔

١۔ مارکیٹ کے اندر واحد پیمانہ تعین قدر سرمائے کا عمل بن جائے۔

٢۔ سرمائے کی بڑھوتری کا تعقل پورے معاشرے پر حاوی ہو جائے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت سے ماورا ہو۔

٣۔ نمبر 1 اور نمبر 2 کو قبولیت عامہ اور جوازِ عمومی حاصل ہو جائے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر دائرہ کار میں تمام اعمال کو اس واحد عمل کے اردگرد مجتمع کر دیا جائے، یعنی سرمائے کی بڑھوتری مستقل تیز ہوتی چلی جائے اور سرمائے کی بڑھوتری محض خود اپنا جواز ہو۔ ہر معاشرتی یا انفرادی عمل کا مقصدِ اولین (Ultimate end) یہی ہو، کیوں کہ سرمایہ ہی "آزادی" کی مجسم شکل ہے۔

یہ عمل پہلے مارکیٹ کی سطح پر ہوتا ہے۔ جہاں اس کو واحد معقول پیمانہ خیر و شر کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے اور کسی بھی عمل کو صرف اسی بنیاد پر جانچا جاتا ہے کہ اس مخصوص عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار میں تیزی آ رہی ہے یا کمی ہو رہی ہے۔ یعنی فرد کے مخصوص عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار پر کیا فرق پڑ رہا ہے۔ اگر زید کی مخصوص نوکری کے نتیجے میں سرمائے کی بڑھوتری کی رفتار میں اس سے کم اضافہ ہوتا ہے جتنا ایک اسٹاک بروکر کی کاوش کے نتیجے میں ہوتا ہے تو معقول بات اور جائز یہی ہے کہ زید کی تنخواہ اسٹاک بروکر کے مقابلے میں کم ہو کیوں کہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل کو آگے بڑھانے میں زید کا حصہ (Contribution) اس سے کم ہے جو

اسٹاک بروکر کا ہے۔ گویا مارکیٹ کی سطح پر جو معقول پیمانہ خیر و شر مسلط ہو جاتا ہے اور جسے قبول کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک فرد کو تمتع الارض کی اجازت دی جاتی ہے وہ اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ وہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل کو کتنا مہمیز دیتا ہے۔

معاشرے کے اندر مارکیٹ ایک دائرہ کار ہے۔ مارکیٹ کے باہر بھی فرد بہت سے تعلقات کو تشکیل دیتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ان تعلقات کی تشکیل بھی سرمایہ دارانہ عقلیت یا بڑھوتری سرمائے کی بنیاد پر کرے، مثلاً خاندانی تعلقات عموماً ایثار و محبت کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑھوتری سرمایہ جو واحد معقول پیمانے کے طور پر مارکیٹ میں تسلیم کر لیا گیا ہے یہ صرف مارکیٹ تک محدود نہ رہے بلکہ یونیورسلائز ہو جائے، خاندان بھی مارکیٹ کا حصہ ہو جائیں، افراد رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہوئے ایمانداری، نسب و شرافت، خاندان اور کفو کو اہمیت نہ دیں بلکہ کیریئر یا پیسہ کو مدنظر رکھیں۔ بچوں کی تربیت کرتے ہوئے بھی سرمایہ دارانہ تعقل کو نظر انداز نہ کریں۔ برادریاں، قبیلہ، قوم اور حتیٰ کہ مذہبی ادارے بھی مارکیٹ کے اس تعقل کا حصہ بن جائیں۔ فرد صرف مارکیٹ کے عمل میں سرمائے کا ایجنٹ نہ ہو بلکہ زندگی کا ہر رول نبھاتے ہوئے وہ سرمائے کا ایجنٹ ہو، اس کو (Capitalist socialisation) کہتے ہیں اور جہاں اس قسم کی سرمایہ دارانہ انفرادیت مکمل طور پر یونیورسلائز ہو جاتی ہے، اس عمل کو سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل یعنی Capitalist Socialization کہتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جسکے نتیجے میں معاشرہ سرمایہ دارانہ خطوط پر استوار ہوتا ہے۔

تیسرا فرض یہی ہوتا ہے۔ یہ دونوں طرح کے فرائض محض زبردستی نافذ نہ کیے جا رہے ہوں بلکہ ان کو مقبولیت عامہ اور جوازِ عمومی حاصل ہو۔ عام آدمی کے لیے یہی معقول پیمانہ خیر و شر اور پیمانہ عمل بن جائے، اور جب فرد کا ہر عمل بڑھوتری سرمائے کے تحت آ جائے تو ضرور خود اپنے دل میں یہ محسوس کرے گا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں، اور زندگی کے ہر شعبے کے اندر سرمائے کی بڑھوتری کو مہمیز دینے کی بنیاد کے اوپر اپنی مرضی سے اپنے اعمال کا تعین کرے۔ کسی معاشرے میں کس قدر سرمایہ دارانہ جبر کی ضرورت ہے اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ افراد کتنے سرمایہ دار ہو چکے ہیں۔

فرماں روائی اور عملداری کو کن افراد کے ذریعے ممکن بنایا جاتا ہے؟

سرمایہ دارانہ عقلیت کوئی فطری چیز نہیں ہے بلکہ انتہائی غیر فطری چیز ہے، اس لیے سرمایہ دارانہ تعقل کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کرنے کے لیے خصوصی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں مخصوص افراد اور اداروں کی اہمیت ہوتی ہے، پہلے ہم ان افراد کا تذکرہ کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیتِ عامہ دلوانے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(۱) دانشور (Intelletuals)

یہ وہ فرد ہے جو قدیم مذہبی علمیت اور قیادت کا فطری مخالف ہے۔ مذہبی علمیت کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہر عمل کی انجام دہی سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضامندی و مرضی تلاش کی جائے۔ احکامات کا استنباط اس طرح کیا جائے کہ اللہ کی مرضی و منشاء سے قریب تر ہونا ممکن ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت ممکن ہو سکے۔ اس کے برعکس دانشور کا ظہور اٹھارویں صدی میں ہوا اور یہ مذہبی علمیت کے برعکس دوسری علمیت کا علم بردار ہوتا ہے۔ یہ مذہبی علمیت سے علی الرغم ادراک حقیقت کا قائل ہوتا ہے، یہ انسان کی آزادی اور مساوات کا قائل ہوتا ہے اور ان راہوں کی نشاندہی کرتا ہے جس کے نتیجے میں انسانیت زیادہ سے زیادہ مساوی آزادی حاصل کر کے اپنی خواہشات (نفسانیہ) کو حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) کلچرل ہیروز:

اس ریاستی نظام میں چوں کہ تمتع فی الارض اور نفسانی خواہشات عمل کے تعین کی بنیاد بنتی ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کو پروجیکٹ کرنے کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو اس کام میں کامیاب ہو جائیں، عموماً یہ تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

☆ اسپورٹس مین

لبرل نظام مین کھیلوں (لہو ولعب) کی خاص اہمیت ہے، لوکل سطح سے لے کر ملکی اور بین الاقوامی کھیلوں کے مقابلوں کا ایک مستقل سلسلہ لبرل ریاستوں کے تعاون سے جاری رہتا ہے اور مختلف قسم کے کھیل کھیلنے والوں کو ہیروز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

میڈیا سے وابستہ افراد:

ڈراموں، فلموں، میوزک، ایڈورٹائزنگ اور فیشن انڈسٹری سے وابستہ افراد بھی ان ہیروز میں شامل ہیں۔

☆ سائنسدان: (سائنسز سے وابستہ افراد میں فزیکل اور سوشل سائنسز سے وابستہ افراد)

یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے کائنات کی طبعی قوتوں پر انسان کا غلبہ اور اختیار بڑھا دیا ہے اور اس اختیار کو بڑھانے کا مقصد تمتع فی الارض ہے۔ ایک زمانے میں یہ فزیکل سائنسدان ہوتے تھے، مگر آج کل میڈیسن اور بائیو ٹکنالوجی سے وابستہ افراد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ان تین قسم کے لوگوں کو یہ مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کہ یہ معاشرے کے رول ماڈل بن جائیں۔ لوگ ان

کلچرل ہیروز کو بزرگان دین کی جگہ رکھنے لگیں۔ علماء اور صوفیاء کو بے وقوف سمجھنے لگیں اور اصلی عوامی لیڈر شپ کا منصب ان تین طرح کے لوگوں کے پاس آجائے۔ اصلی عوامی لیڈر شپ عموماً سیاسی نہیں ہوتی بلکہ اصلی عوامی لیڈر شپ ان کلچرل ہیروز کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ ان کلچرل ہیروز کے "فین" اپنی زندگی مین ان کا طرزِ زندگی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) ٹیکنو کریٹ اور بیورو کریٹ:

ٹیکنو کریسی اور بیورو کریسی بھی سرمایہ دارانہ ریاستوں کے انتظام سے متعلق خاص چیز ہے۔ یہ ایسی اشرافیہ ہوتی ہے جو سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کی بنیاد پر انفرادی سرمایہ دارانہ عمل کی تحدید اور ترتیب کرتی ہے۔ اس کا اپنا مفاد اس میں پنہاں ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کتنے حاصل ہو رہے ہیں؟ ان کو سرمائے کے مجموعی مفادات کے نمائندوں کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک مستقل مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی عمومی ایجنٹ پیدا نہیں ہوتا۔ مارکیٹ کا جو طریقہ اور نظم قائم ہے اس میں ہر کمپنی اپنے مفادات کی نگرانی اور تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس کو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ اس کا منافع زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ اس لیے اس نظم میں عمومی سرمائے کے تحفظ کے نمائندے نہیں ہوتے۔ مثلاً جو اس بات پر نظر رکھ سکیں کہ کوئی مخصوص کمپنی اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہی جس سے مجموعی بڑھوتری سرمایہ کو روکا جا رہا ہے۔ تو ٹکنو کریسی اور بیورو کریسی یہ بتاتی ہے کہ تمتع فی الارض کا بہترین طریقہ کیا ہے اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات سے اوپر اٹھ کر مجموعی سرمایہ کے ایجنٹوں کا رول ادا کریں گے۔ ان کی وفاداریاں اور غیر جانبداریاں (impartiality) سرمایہ دارانہ نظام سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے انہیں مخصوص امتحانی نظام سے گزار کر سامنے لایا جاتا ہے اور عمومی نمائندوں کے برعکس ان کی حیثیت ایک مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ قانون سازی میں بھی یہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی سرمایہ دارانہ نظریے پر ایمان رکھنے والے ہو سکتے ہیں۔ چاہے لبرل ہوں یا مسلم قوم پرست یا کمیونسٹ...... سرمایہ دارانہ نظام کا تقاضا ہے کہ ایسا گروہ مستقل تیار ہوتا رہے اور یہ نظریاتی گروہ برسر اقتدار بھی ہو اور اس کا اقتدار مقبول عام بھی ہو۔

(۴) آرمڈ فورسز (armed forces):

اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں...... یہ سرمایہ داری کو لاحق خطرے کے وقت سامنے آتے ہیں اور سرمایہ داری کا آخری دفاع یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہر ملک کی عموماً اپنی آرمی، پولیس اور ریزرو فورسز وغیرہ ہوتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(۵) استعماری ایجنٹ (imperial oversights agents):

یہ وہ مقامی افراد ہوتے ہیں جن کا فکری تناظر، جن کے مفادات اور وفاداریاں ایمپائر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک عالمی نظام ہوگیا ہے اور سرمایہ داری کی جو اصل قوت نافذہ ہے' امریکہ ہے۔ اس قوت نافذہ کی ایک ضرورت یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اپنے افراد کی بجائے وہ ایسے مقامی افراد کے ذریعے حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جن کی بنیادی وفاداریاں امریکن ایمپائر کے ساتھ ہوں۔ وہ بود و باش تو مقامی لوگوں کا سا رکھیں لیکن تمام تر طرزِ زندگی ایمپائر کی سی ہو گویا یہ ایمپائر کے غیر مقامی شہری (non national citizen) ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت نے جب محسوس کیا کہ ان کی حکومت کو مقبولیت حاصل نہیں ہے تو انہوں نے مختلف طریقوں خصوصاً ایجوکیشن سسٹم کے ذریعے ایسے لوگ تیار کیے اور صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پوری تیسری دنیا کے اندر ایسے لوگوں کی پوری نسل تیار کی گئی جو فطرتاً ایمپائر ہی کے لوگ ہوں۔ یہ لوگ کلیدی مقامات پر فائز کیے جاتے ہیں۔

حاملین اقتدار ادارے:

ہم ان افراد کا تذکرہ کر چکے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیت عامہ اور غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اب ان اداروں کا تذکرہ ہے جن کے ذریعے یہ افراد اقتدار کی ترتیب عمل میں لاتے ہیں۔

(ا) کارپوریشن:

کارپوریشن کے اندر نظامِ اقتدار سرمایہ داری اپنی کامل ترین شکل میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک فرد سرمایہ دارانہ بندھنوں میں ایسے جکڑا ہوتا ہے کہ بڑھوتری سرمایہ کا ایجنٹ بننے کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ کارپوریشن کے اندر جو ترتیب نظم ہوتی ہے اس کے نتیجے میں معاش کے پورے عمل پر جس طرح سرمایہ دارانہ عقلیت غالب آتی ہے اور کہیں غالب نہیں آتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کارپوریشن کے ذریعے ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمائے کی ملکیت قائم کی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تعقل کے لیے انسان کے جاگتے اوقات میں انسان کو خاص قسم کے ڈسپلن میں سمو دیا جاتا ہے اور اس کے ان اوقات میں اسے سرمائے کا خادم بنا دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن وہ شخص قانونی ہے جس کا اکیلا وظیفہ یہ ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کے پیمانے پر اپنے تمام اعمال کو مرتب کرے۔ کارپوریشن کو چلانے والے مینیجر ہوتے ہیں، جو عملاً بڑھوتری سرمایہ کی مشین ہوتے ہیں وہ اپنے ماتحت ملازمین کو بھی اس واحد پیمانے پر پرکھتے ہیں کہ وہ بڑھوتری سرمائے کا باعث بن رہے ہیں کہ نہیں...... ایک معیشت میں جس قدر کارپوریشن کا عمل دخل بڑھتا ہے اتنی ہی ذاتی ملکیت کم ہو جاتی ہے۔

(ب) بینک اور مالی ادارے:

کارپوریشن کے علاوہ دوسرا ذریعہ بینک اور فنانشل ادارے ہیں۔ یہ بھی خالصتاً سرمایہ دارانہ ادارے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کی بنیاد پر قدر کے تعین کا ایسا نظام نافذ اور قائم کریں کہ زری مارکیٹ اور اسٹاک مارکیٹ (capital market) سسٹم آف (production) یعنی پیداواری عمل کے نظام پر حکم لگانے کی پوزیشن میں آجائے۔ اس کے لیے بنک یہ فریضہ انجام دیتے ہیں کہ لوگوں کی بچتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے فاضل سرمائے کو خود استعمال نہ کریں بلکہ بینک میں اکاؤنٹ کھول لیں اور بینک اس رقم کو سرکل آف کیپٹل (circle of capital) میں شامل کر دیں۔ انہی اداروں کے ذریعے سرمایہ داری کو یونیورسلائز کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(ج) فنانشل ریگولیشن (زری اصلاحات):

سرمایہ دارانہ نظام میں مختلف کمپنیاں اپنے اپنے منافع کو بڑھانے کے لیے مسلسل مسابقت کرتی ہیں۔ اس لیے ایک ریگولیٹری اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ نظر رکھتی ہے کہ اس مسابقت کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام بحیثیت مجموعی کسی نظاماتی بحران سے دوچار نہ ہو۔ یہ ریگولیٹری اتھارٹی اس نظاماتی بحران سے بچانے کے لیے پیسہ کی رفتارِ پیداوار میں کمی یا زیادتی کا فیصلہ کرتی ہے۔ بظاہر تو یہ خاص حکومت کا کام لگتا ہے، لیکن اب صرف اسٹیٹ بینک یہ کام نہیں کرتا بلکہ عالمی مالیاتی اور زری ادارے بھی اس میں دخل اندازی کرتے ہیں اور پرائیوٹ سیکٹر میں بھی ایسی ریٹنگ ایجنسیاں آگئی ہیں مثلاً جے پی مورگن وغیرہ جن کا اس سلسلے میں اہم کردار ہوتا ہے۔

(د) لیبر یونینز:

کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ ٹریڈ یونینز بھی سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انفرادی طور پر تو کارپوریشن کے اندر ہیومن ریسورس مینجمنٹ کے ذریعے یہ کام کیا ہی جا رہا ہے، لیکن اجتماعی طور پر مزدوروں کو سرمایہ دارانہ عقلیت سے بہرہ ور کرنے کا کام مزدور یونینز کرتی ہیں۔ وہ مزدور قوتوں کو اس مقصد کے گرد منظم کرتی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے فروغ کے نتیجے میں جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں' ان میں اپنا حصہ طلب کریں اور مزدور بھی اجتماعی طور پر سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو مہمیز دینے میں اپنا کردار ادا کریں اور ان کے مفادات بڑھوتری سرمایہ کے اہداف سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو سکیں۔

(ذ) انتظامیہ (مقامی اور قومی):

کسی بھی ملک کے معاملات چلانے کے لیے انہیں مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے مثلاً داخلہ امور، خارجہ امور، دفاعی امور، تعلیمی امور، معاشی امور...... اور ان سب امور کو چلانے کے لیے ہر ملک میں انتظامیہ کا

www.KitaboSunnat.com

ادارہ ہوتا ہے، جس کی تنظیم مقامی سے لے کر قومی سطح تک موجود ہوتی ہے۔ انتظامیہ کے ادارے کا کام محض قانون کا نفاذ نہیں ہوتا بلکہ وہ قانون سازی میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیتی ہے۔ اکثر قوانین کے مسودے انتظامیہ ہی تیار کرتی ہے۔ عملاً انتظامیہ ہی مقننہ کی رہنمائی کرتی ہے اور اس پر حاوی ہوتی ہے اور اس کو سرمایہ دارانہ ڈگر سے نہیں ہٹنے دیتی۔

(ط) میڈیا:

جس میں اخبارات ورسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ دائرہ اقتدار کو وسیع کرنے کا اہم ادارہ ہے۔ میڈیا کے سب شعبے یعنی انٹرٹینمنٹ، ایڈورٹائزنگ اور انفارمیشن پہنچانے کا عمل سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کے استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کو رول ماڈل اور ہیرو بنایا جاتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ کے ذریعے سرمایہ دارانہ کارپوریشن کی مال کی طلب پیدا کر کے اس کی کھپت ممکن بنائی جاتی ہے اور انفارمیشن پہنچانے کے عمل کو بھی مختلف طریقوں (لائسنسنگ پر کنٹرول) کے ذریعے ریگولیٹ کیا جاتا ہے۔ میڈیا کا وسیع نیٹ ورک سرمایہ دارانہ ریاست کے ماتحت ہی ہوتا ہے۔

(ز) کورٹس (عدالتیں):

عدلیہ بنیادی طور پر لبرل دستور کی محافظ ہوتی ہے۔ یہ لبرل دستور کی بنیاد پر شہریوں کے دو فریقوں یا سٹیزن اور مملکت اور اس کے مختلف اداروں کے درمیان متنازعہ امور کے فیصلے کرتی ہے۔ ان معنوں میں کورٹس کا بنیادی فریضہ روزمرہ معاملات کی دستور سے ہم آہنگ تشریح وتوضیح کرنا اور مخصوص معاملات پر اس کا اطلاق کرنا ہے۔ دستور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی آزادیوں اور حقوق کے مجموعے کا نام ہے جو فرد کو سرمائے کی بڑھوتری کے فرض کو پورا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم سرمایہ دارانہ ملکیت کا تحفظ اور آزادی کا تحفظ ہے۔

(س) پولیس:

پولیس کا محکمہ کا سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور عدلیہ سے مخصوص نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ عدل کی بنیاد پر جو فیصلے کیے جاتے ہیں، ان فیصلوں کا نفاذ پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ اور ریاست جس مخصوص نہج پر استوار ہوتے ہیں اس مخصوص نہج سے انحراف کرنے والوں پر پولیس نظر رکھتی ہے۔ بعض اوقات سرمایہ دارانہ اشرافیہ اپنے مخالفین کو کچلنے کا کام بھی پولیس سے لیتے ہیں۔

(ش) آرمڈ فورسز:

سرمایہ دارانہ ریاستیں اصولاً نیشن اسٹیٹ ہوتی ہیں اور اصولاً ایک نیشن اسٹیٹ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، یعنی نہ تو اندرون ملک میں کوئی فرد یا گروہ ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بیرونی طاقت یا

گروہ اس نیشن اسٹیٹ کی مرضی کے بغیر اس کے حاصل کردہ اختیار کو چیلنج کر سکتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے اس تحفظ کے لیے بنیادی طور پر فوج کا ادارہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست کا آخری دفاع آرمڈ فورسز ہی کرتی ہیں۔

(ص) مقننہ (legislature):

مقننہ عموماً دو ایوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایوان زیریں عوام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے اور ایوانِ بالا میں مخصوص طبقوں یا علاقوں کو نمائندگی دی جاتی ہے۔ انتخاب کی غرض سے تمام ملک کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حلقے سے ممبران کی مقررہ تعداد ایک متعینہ مدت کے لیے ایوانِ زیریں میں نمائندگی حاصل کرتی ہے اور عوام کے نمائندے معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق قانون بناتے ہیں۔ قوانین میں ردوبدل کرنا یا ان کی تنسیخ کرنا بھی مقننہ کا کام ہوتا ہے اور تمام ارکان کی بحث ومباحثہ اور اظہارِ خیال کے بعد مقننہ کو اختیار ہوتا ہے کہ کثرتِ رائے سے پیش کیے جانے والے بل کو منظور یا مسترد کر دے، لیکن فی الواقع جدید دور میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مقننہ کا کردار مسلسل کم ہو رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی ہے کہ سرمایہ دارانہ لبرل ریاستوں کو عالمی سرمایہ دارانہ استعماری ریاست اپنی مرضی کے قوانین بنانے پر مجبور کرتی ہے اور عموماً یہ کام ٹکنوکریسی کرتی ہے۔ مقامی ٹکنوکریسی بھی صرف وہ اقدامات بروئے کار لاتی ہے جو عالمی سرمایہ دارانہ قوانین سے ہم آہنگ ہوں، جب مقننہ کا بنیادی فریضہ ہی ادا نہ ہو تو گویا یہ کمزور ترین ادارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند جزوی وجوہات ایسی ہیں کہ مقننہ کا کردار کم سے کم ہوتا جا رہا ہے، مثلاً ہر انفرادی ممبر اپنی پارٹی کی طرف سے پیش کیے گئے بل پر عموماً توثیق ہی کرتا ہے، چناں چہ اس عمل سے اس کی عدم دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مقننہ کے اندر متعلقہ شعبے کے ماہرین مثلاً دفاعی، معاشی، تعلیمی، معاشرتی ماہرین کم ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس شعبہ سے متعلق قانون سازی کی سکت ہی اپنے اندر نہیں پاتے۔ لہٰذا صرف پاکستان کی مثال ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ ہر جگہ اب پارلیمنٹ یا مقننہ کا کوئی رول نہیں رہ گیا۔ پارلیمنٹ تو محض کھیل تماشہ ہے کیوں کہ حکومتوں میں تبدیلیوں کے نتیجے میں پالیسیوں کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔

(ض) عالمی ریٹنگ ایجنسیاں اور نگراں ایجنسیاں:

اب بین الاقوامی سطح پر ایسے ادارے وجود میں آ چکے ہیں جو ملکی سطح پر اہم ترین امور پر مکمل دخیل ہو چکے ہیں، مثلاً آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، یونائیٹڈ نیشن کے مختلف ادارے۔ انہوں نے قومی اداروں سے مخصوص نوعیت کا تعلق استوار کر لیا ہے۔ آئی ایم ایف کے پاس صرف یہ سکت نہیں ہے کہ وہ ہماری معاشی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کرے بلکہ وہ اپنے فیصلے کے نفاذ کا ایک خاص میکنزم بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح اب پرائیوٹ سیکٹر کی ریٹنگ ایجنسیوں کا ظہور بھی ہو رہا ہے۔ یہ ایجنسیاں سرمایہ دارانہ اصولوں کی بنیاد پر ملکوں کی کارکردگی کو مسلسل جانچتی رہتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور ان کی جانچ کا اثر کسی ملک میں ہونے والی بیرونی اور اندرونی سرمایہ کاری پر پڑتا ہے۔

(ط) تعلیمی نظام:

سرمایہ دارانہ علمیت اس وقت غالب آتی ہے جب مذہبی علمیت پر سے لوگوں پر اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہ عمل مغرب کے اندر اٹھارویں صدی میں پروان چڑھا۔ کلیسا جو کہ قدیم مذہبی علمیت کا علمبردار تھا' اس کو دورِ تنویر کے مفکرین نے شکست دے دی۔ دورِ تنویر کی فکر کی بنیاد پر جن علوم کا ظہور ہوا اسے فزیکل سائنس اور سوشل سائنسز کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ٹیکنالوجی اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو جواز فراہم کرنے والے علوم ہیں۔ ان کی بنیاد پر مغرب کا پورا نظام تعلیم تشکیل پایا۔ تیسری دنیا پر استعماری طاقتوں کے غلبے کے بعد وہاں بھی یہی تعلیمی نظام مستحکم ہوا۔ اب اسکول کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کا مکمل نظام ہے جسے لوگوں نے برضاورغبت قبول کرلیا ہے اور مذہبی علوم کی بجائے اس تعلیمی نظام میں پڑھائے جانے والے علوم کو فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے۔ تعلیمی نظام کے ان اداروں کے ذریعے سرمایہ دارانہ عقلیت کو جواز عمومی اور قبولیت عامہ فراہم کی جارہی ہے۔

اب تک جن حاملینِ اقتدار اداروں یا process کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی ترتیب قائم نہیں کی گئی بلکہ ان کا محض تعارف اور خاکہ پیش کر دیا گیا۔ چوں کہ لبرل ریاست دو مختلف دائرہ کار میں تقسیم ہوجاتی ہے، یعنی جمہوری طرزِ حکومت اور آمرانہ Authoritarian طرزِ حکومت...... جمہوری طرزِ حکومت میں ان اداروں کی تقدیم اور ترتیب اس سے مختلف ہوتی ہے جو آمریت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں جمہوری طرزِ حکومت کی ممکنہ ترجیحی ترتیب کی فہرست دی جاتی ہے۔

۱۔ بینک اور فنانشل ادارے
۲۔ فنانشل ریگولیشن
۳۔ انٹلیکچوئل
۴۔ استعماری ایجنٹ
۵۔ میڈیا
۶۔ عدالتیں
۷۔ بین الاقوامی نگران ایجنسیاں اور عالمی ریٹنگ ایجنسیاں
۸۔ مقننہ
۹۔ پولیس
۱۰۔ آرمڈ فورسز

۱۱۔ ٹریڈ یونین

جب کہ آمریت یا Authoritarian اسٹیٹ میں ممکنہ ترجیحی ترتیب ذیل کے مطابق ہوسکتی ہے۔

(۱) پولیس
(۲) مقننہ
(۳) استعماری ایجنٹ
(۴) عدالتیں
(۵) میڈیا
(۶) انٹلیکچوئل
(۷) بینک اور فنانشل ادارے
(۸) فنانشل ریگولیشن
(۹) بین الاقوامی نگران ایجنسیاں
(۱۰) آرمڈ فورسز

اب تک جن persnol اور اداروں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بارے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ پرسنل اور ادارے حکومت نہیں کر رہے بلکہ ان کے ذریعے حکومت کی جارہی ہے۔ حکومت اور اقتدار اس چھوٹے سے گروپ کا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو پورے طور پر قبول کیے ہوئے اور اس عقلیت کی یونیورسلائزیشن کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ ان تمام پرسنل اور اداروں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور باہر بھی...... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا گروپ اپنی حکومت کیسے کرتا ہے؟ یہ اپنی حکومت دو طریقوں سے کرتا ہے:

۱۔ نمائندگی (Representation)

۲۔ نفاذ احکام بذریعہ طاقت (mediation)

1۔ پہلے طریقے میں یہ باور کرانے کی کوشش کرائی جاتی ہے کہ اس پر کوئی نزاع موجود نہیں ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری ہی قدر کے تعین کا واحد پیمانہ ہے۔ سب لوگ اس کے قائل ہیں اور یہی اصول ہم کو نمائندگی کا جواز فراہم کرتا ہے کیوں کہ ہم ہی اس مفادِ عامہ کو فروغ دینے والی قوت ہیں اور ہم ان تمام پرسنیل اور اداروں کے ذریعہ ہی کررہے ہیں جس کو مقبولیت عامہ حاصل ہے۔ تینوں طرح کی سرمایہ دارانہ ریاستیں چاہے وہ (ا) لبرل ہوں (۲) اشتراکی ہوں (۳) قوم پرست ہوں...... اس جائز نمائندگی کا دعوی کرتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

mediation-2 کے طریقے میں سرمائے کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر غالب اشرافیہ بزور قوت نافذ کرتی ہے۔ چوں کہ سرمایہ داری ایک جاہلیت ہے اور اس جاہلیت سے کسی قدر مطلق اور خیر کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے لامحالہ بیک وقت سرمائے کے مفادِ عمومی کی مختلف جہتوں سے مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ لیکن چھوٹا سا گروپ جو کہ حکومت کر رہا ہے، وہ mediation کے ذریعہ یہ باور کراتا ہے کہ سرمایہ دارانہ مفادات جو تصور رکھتا ہے، وہی درست ہے اور اس کے عمومی مفاد کی تعبیر کے تحت مختلف انفرادی سرمایہ دارانہ مفادات کی تعبیروں کی تحدید کی جائے اور سرمائے کے عمومی مفاد کے تحفظ کے لیے اس کے تصور کے مطابق معاشرے اور ریاست کی صورت گری کی جائے۔

یہ دونوں کام بیک وقت بھی کیے جا رہے ہوتے ہیں یعنی غالب اشرافیہ کی تعبیر مفادِ عمومی کو مسلط بھی کیا جا رہا ہوتا ہے اور نمائندگی کے اداروں کے ذریعہ اس مخصوص تعبیر کے حق میں رائے بھی بنائی جا رہی ہوتی ہے۔ نمائندگی جن اداروں (process) کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ انٹرسٹ گروپس.................intrest groups

۲۔ ہیروز کی پرستش.................Heros

۳۔ سیاسی پارٹیاں.................political parties

۴۔ ایڈمنسٹریشن اینڈ کورٹس......Administration and courts

(1) انٹرسٹ گروپس:

انٹرسٹ گروپس وہ ہوتے ہیں جو کسی سرمایہ دارانہ حق کی طلب کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ مثلاً پانی بجلی و سیوریج کے مسائل، تعلیم، عورتوں پر ظلم وغیرہ وغیرہ...... ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے سرمایہ دارانہ حقوق کی بنیاد پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جمع ہونے والوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت کی بنیاد پر کوئی تخصیص روا نہیں رکھی جاتی، مثلاً وہ مسلمان ہے یا قادیانی یا کوئی اور، اسی طرح نمازی و پرہیزگار ہے یا زانی، شرابی اور بے نمازی...... بس ان کا مخصوص سرمایہ دارانہ حق کی طلب پر متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گویا ان انٹرسٹ گروپس کے ذریعہ وہ سرمایہ دارانہ اشرافیہ جو حرص و حسد کو یونیورسلائز کرنا چاہتی ہے، وہ نفوذ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ حقوق کو طلب کر کے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی مستحکم کیا جاتا ہے۔ ان کے نتیجے میں غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں برپا کیا جا سکتا۔

(2) ہیروز:

سائنٹیفک ہیروز ہوں یا میڈیا کے ہیروز، ان کی امیج بلڈنگ کر کے بھی معاشرہ میں نفوذ کیا جاتا ہے، کیوں کہ

اگر یہ لوگ مقبول عام ہوتے ہیں تو سرمایہ دارانہ عقلیت بھی مقبول عام ہوتی ہے۔

(3) سیاسی پارٹیاں:

بنیادی طور پر سیاسی پارٹیاں بھی سرمایہ داری سے خاص چیز ہیں۔ سرمایہ داری سے پہلے جو مختلف گروہ اور طبقات سیاسی عمل میں شامل ہوتے تھے ان میں سیاسی پارٹیوں کی similiarties تو تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن جن معنوں میں اب سیاسی پارٹیاں خصوصاً اپوزیشن پارٹیاں وجود رکھتی ہیں، وہ سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے نہیں تھیں۔ مختلف پارٹیاں ایک ہی سیاسی نظام پر بنیادی طور پر متفق ہوتی ہیں۔ اس نظام پر اصولی اتفاق کے بعد ان کے اختلافات جزوی اور فروعی ہوتے ہیں۔ یہ پارٹیاں لوگوں کو ایک اجتماعیت فراہم کرتی ہیں۔ لوگ ان کی لیڈر شپ کو اپناتے ہیں اور اپنا ایک خاص تشخص اور اپنی ایک خاص شناخت ان کے ذریعہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس خاص تشخص اور شناخت کے لیے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ یہ پارٹیاں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا اس لیے اہم ترین ذریعہ ہیں کہ ان کی بنیادیں شناخت اور تشخص اصولی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کا استحکام ہی ہوتا ہے۔

(4) ایڈمنسٹریشن اور کورٹس

قانون کا نفاذ اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ وہ قانون غیر جانبدار نظر آئے۔ فیصلے ایسے ہوں کہ وہ مفادِ عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ فیصلے کیے گئے ہیں تاکہ سرمایہ دارانہ نظام پر ایمان متزلزل نہ ہو اور کسی غیر سرمایہ دارانہ نظام کی جانب جھکاؤ نہ ہو۔

(5) سرمایہ دارانہ تحریکیں

سرمایہ دارانہ تحریکیں مثلاً قوم پرست، اشتراکی یا انارکسٹ تحریکیں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا بڑا اہم ذریعہ ثابت ہوئی ہیں، کیوں کہ ان میں بھی غیر سرکاری تنظیموں (NGOS) اور پروفیشنلز ایسوسی ایشنز اور انٹرسٹ گروپس کی طرح سرمایہ دارانہ حقوق کو ہی طلب کیا جاتا ہے۔ اب تحریکوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ اشرافیہ ہی کی سبقت قائم کی جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی عمومیت اختیار کرتی ہے۔

قوم پرست اور اشتراکی تحریکیں لبرل سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بڑی کامیاب تحریکیں رہی ہیں، لیکن انہوں نے بھی لبرل سرمایہ داروں کی جگہ قوم پرست اور اشتراکی سرمایہ داروں کی حاکمیت قائم کی ہے، کوئی غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں قائم کیا۔

۲۔Mediation:۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ Mediation کے ذریعہ سرمایہ کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر کو نافذ کیا جاتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔Mediation مندرجہ ذیل اداروں اور طریقوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

(۱) فوج و پولیس۔

(۲) کورٹس اور عدلیہ کا نظام۔

(۳) شمولیت (سیاسی مخالفین کو ساتھ ملانا)۔

(۴) اخراج کردینا (مخالفین کو بے دست و پا کردینا)۔

(۵) سوشل ویلفیئر۔

(۶) صنعتی تعلقات۔

ایک خاص قسم کے ڈسپلن کو نافذ کرنے کے لیے سب سے اہم ادارے تو پولیس اور فوج ہیں۔ اس کے علاوہ کورٹس اور عدلیہ کا نظام ہے۔ یہ اس لیے اہم ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگ جو فیصلے کرتے ہیں اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ فیصلے مقبول عام بھی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت اہم ہے اور اس بات کو بھی ممکن بنایا جاتا ہے کہ اگر ان کے خلاف کوئی عمل ہو تو ان کو سزا بھی دی جا سکے، اس کے لیے متذکرہ ادارے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

شمولیت (CO-OPTION):

اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے گروہوں کو ساتھ ملا لیا جائے جو کسی طرح راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہوں اور جو سرمایہ دارانہ نظام کے اپوزیشنل گروپ نظر آتے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ''شمولیت'' کی ایک بہترین مثال ڈیموکریسی کی ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کے ذریعہ سوشلسٹ طرزِ فکر کے حاملین کو اس کا قائل کر لیا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں محدود حقوق کی طلب پر اکتفا کر لیں۔ اس میں مزدور نے اپنی جدوجہد اس پر مرکوز کر دی کہ اس نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں میرا وہ حصہ مجھے نہیں دیا جا رہا جس کا میں حق دار ہوں۔ اور مزدوروں کی جماعت کو حکومت میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح محدود حقوق فراہم کر کے اور مراعات فراہم کر کے بڑی جدوجہد سے ان کو دست کش کرا لیا جاتا ہے۔ co.option کی اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں مثلاً اسلامی جماعتوں کو بھی اگر سرمایہ دارانہ حکومت میں شامل کر لیا جائے تو وہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت کا ایک جواز فراہم کر سکتی ہیں اور اسلامی امارت و خلافت کی جدوجہد سے دست کش ہو سکتی ہیں اور اس بات پر راضی ہو سکتی ہیں کہ محدود مراعات حاصل کر لیں اور معمولی اور بے ضرر قسم کے علامتی اسلامی اقدامات پر مطمئن ہو جائیں۔ اس co.option سے co.opt ہونے والا گروہ اپنی فطری consituency سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور consituency میں اپنی legitimacy کھو دیتا ہے۔

اخراج (Exclusion):

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی عمل اور سیاسی عمل اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ قوت ان ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے جو سرمایہ کی بڑھوتری کے اصول کو بنیادی عقیدہ بنا لیتے ہیں اور جو یہ عقیدہ نہیں رکھتے انہیں اس قابل نہیں رہنے دیا جاتا کہ وہ مجموعی سیاسی یا معاشی عمل میں کوئی فیصل کردار ادا کر سکیں، مثلاً آزاد کشمیر پاکستانی ریاست میں Excluded ایریا ہے یا صوفیاء کرام کی معاشرتی اور ریاستی حیثیت کو اس نہج پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ فیصل کردار ادا نہ کر سکیں۔

سوشل ویلفیئر:

آخری چیز سوشل ویلفیئر ہے۔ یعنی رفاہ عامہ کے کاموں پر ہی ساری جدوجہد کو مرکوز کر دیا جائے اور عوام کو سیاست علیا کے معاملات سے ہٹا کر مرکزی معاملہ یہی رہ جائے کہ رفاہ عامہ کے کتنے کام ہو رہے ہیں؟ اسی طرح سوشل ویلفیئر سسٹم اور نیشنل انشورنس کا پورا نظام ہے جن کے ذریعہ سرمائے کے مفاد عمومی کی ایک خاص تعبیر کے نفاذ کو ممکن بنایا جاتا ہے اور یہ طریقے ہیں جس سے سرمایہ دارانہ ڈسپلن قائم ہوتا ہے۔

بطور نمائندگی جن اداروں اور طریقہ کار کا تذکرہ ہوا اور بطور Mediation کے جن اداروں اور طریقہ کار کا تذکرہ ہوا ان کو جمہوری حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور استبدادی (ڈکٹیٹرشپ) حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں وہ مختلف ترتیب بیان کی جاتی ہے جو میرے خیال میں مختلف طرز کی حکومتوں میں ممکن ہے۔ نمائندگی کے ادارے اگر جمہوری حکومت میں ہوں تو ان کی مندرجہ ذیل ترتیب ہو سکتی ہے:

(۱) انٹرسٹ گروپس (۲) سیاسی جماعتیں (۳) ہیروز (۴) انتظامیہ اور کورٹس

نمائندگی کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومت میں مندرجہ ذیل طریقے سے ممکن ہے۔

(۱) عوامی تحریکیں (۲) ہیروز (۳) انتظامیہ اور کورٹس (۴) انٹرسٹ گروپس

اسی طرح Mediation کے اداروں کی ترتیب جمہوری حکومت میں مندرجہ ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) کورٹس اور عدلیہ کا نظام (۲) شمولیت (Mediation) (۳) سوشل ویلفیئر (۴) اخراج (۵) پولیس اور فوج

اس کے علاوہ Mediation کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومتوں میں یوں ممکن ہے۔

(۱) کورٹس اور عدلیہ کا نظام (۲) پولیس اور فوج (۳) اخراج (۴) شمولیت (۵) سوشل ویلفیئر

اب تک سرمایہ دارانہ ریاست کا ایک عمومی خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر ہم کسی جگہ اسلامی نظام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو وہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کا کلیتاً انہدام ضروری ہے، کیوں کہ اسلامی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام میں اختلاف جزوی نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی ہے۔ اب یہ اسلامی نظام کی پیش قدمی اور سرمایہ دارانہ نظام کا کسی مخصوص ملک سے اخراج کس طرح ممکن ہوگا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخصوص ملک میں سرمایہ داری اور اس کی مخصوص نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم پاکستان میں ایسی اقدامی حکمت عملی ترتیب دیں اور پیش قدمی کرنا چاہیں تو دینی تحریکوں کو مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات حاصل کرنا ضروری ہیں۔

(۱) پاکستانی ریاست کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) کیا پاکستان ایک قومی لبرل ریاست ہے یا باجگزار ریاست؟ یا دونوں کا مجموعہ ہے؟

(۳) پاکستان میں سرمایہ دارانہ عقلیت غالب کرنے کے لیے کون سے ادارے کلیدی اور کون سے معاونین کی حیثیت رکھتے ہیں؟

(۴) کیا ان کلیدی اور معاونین گروپس میں تعلق مفاہمت کا ہے یا مخاصمت کا؟ اور مخاصمت کی صورت میں اس کی نوعیت کیا ہے؟

(۵) طرزِ حکومت کی ترجیحات اور قوتِ نافذہ کے استعمال کے تناظر میں کیا پاکستان ایک لبرل جمہوری ریاست ہے یا آمرانہ؟

(۶) سرمایہ داری کے استحکام اور فروغ کے لیے پاکستان میں بحیثیت قومی لبرل ریاست یا باجگزار ریاست کیا بنیادی فیصلے ہو رہے ہیں؟

(۷) ان فیصلوں کے صدور اور نفاذ کے لیے کون سے ادارے، پروسیس (process) اور افراد اہمیت کے حامل ہیں؟

(۸) کون سے افراد یا کون سے عہدے کی سطح پر کلیدی فیصلے کیے جاتے ہیں اور وہ کیا اسٹرکچرز ہیں جن سے ان کی تنفیذ کو ممکن بنایا جاتا ہے؟

(۹) بیوروکریسی میں فیصلہ کرنے کی اہم ترین سطح کیا ہے اور ان فیصلوں کی تنفیذ کی اہم ترین سطح کیا ہے؟

(۱۰) کون سے ادارے اور کون سے عوامل ہیں جن کو کمزور کر کے سرمایہ دارانہ تعقل کو غیر معقول کیا جا سکتا ہے؟

عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکہ

ادریس اسمٰعیل

مغربی تہذیب پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہے چنانچہ اس تہذیب سے واقفیت ہمارے لیے غلبہ اسلام کی جدوجہد میں بالکل بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مغربی تہذیب سے واقفیت کے ضمن میں بنیادی چیز جو ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ کہ جو نظام عملی طور پر مغرب میں غالب ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی منہج میں ایک فکر اور نظریہ ہے جس کی بنیاد پر ایک سرمایہ دارانہ شخصیت کا قیام اور اس کا فروغ بھی ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ تہذیب اس نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لیے سیاسی صف بندی بھی فراہم کرتا ہے۔ ان مختلف سطحوں پر قوت کو مرتکز کرنے کے لیے سرمایہ درانہ نظام اداروں کا ایک ہمہ گیر ڈھانچہ کھڑا کرتا ہے جو اس نظام کو شخصی، معاشرتی اور ریاستی سطح پر قوت فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اس نظام کو کہ جس کا بنیادی کلمہ ''لا الٰہ الا الانسان'' ہے تباہ کرنے کے لئے اس نظام کی، اس فکر اور اس کے اداروں کی اور اس کی پشتی بانی کرنے والی ریاست امریکہ کے بارے میں بھرپور تفہیم کی ضرورت ہے۔

سرمایہ درانہ نظام کے بارے میں سب سے پہلی بات یہ سمجھنی چاہیے کہ یہ نظام جس طرح کی فکر و شخصیت، معاشرہ اور ادارے کی تشکیل کرتے ہیں وہ فطری نہیں بلکہ حادثاتی ہیں۔ یعنی تاریخ کے ایک خاص دور میں لوگوں نے الہامی تہذیب کو رد کر کے انسان کو خدا بنانے کا project اختیار کیا۔ دنیا پرستی اور انسان پرستی کی فکر تحریک تنویر کی بنیاد بنی جس نے مذہب کو (خواہ اس کی حیثیت کتنی ہی کمزور کیوں نہ تھی) اپنے انفرادی، معاشرتی اور ریاستی دائروں سے باہر کر دیا اور زندگی کے تمام فیصلوں اور تمام شعبوں کی بنیاد تکاثر پر رکھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چونکہ سرمایہ دارانہ نظام فطری نہیں بلکہ حادثاتی ہے اس لئے اس نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ایک زبردست ریاستی جبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط تک یہ ریاستی جبر یورپی استعمار کی شکل میں متحرک نظر آتا ہے۔ اگر ہم برصغیر کے تناظر میں انگریزی استعمار کا مختصراً جائزہ لیں تو ہمیں وہ دور مسلمانوں کی شکست کا نظر آتا ہے۔ مجاہدین اور علماء کی بڑی تعداد میں شہادت کے باوجود بھی ہم اس استعمار کو تہذیبی شکست نہ دے سکے۔ مسلمانوں نے کافروں سے نفرت کا بھرپور اظہار تو کیا لیکن ہم نے انگریزی استعمار کو تاتاریوں کے غلبے کی طرح دیکھا۔ چونکہ ہندوستان ایک بڑا اور الگ تھلگ Isolated ملک تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو کبھی مغربی تہذیب سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے انگریزی استعمار کے غلبے کو ہم نے محض ایک عسکری غلبے کے طور پر دیکھا اور اس کے علوم اور تہذیبی پہلو سے صرف نظر کیا چنانچہ مغربی استعمار سے جہاد کے باوجود مغربی علوم اور افکار کی ہیبت ان کی حقانیت اور مرعوبیت دل میں بیٹھ گئی۔ مغربی علوم وفکر سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم اسلام اور کفر میں فرق کو واضح نہ کر سکے نتیجتاً ۱۸۵۷ء کے جہاد سے ۱۹۲۰ میں شیخ الہند حضرت محمود الحسن اسیر مالٹا کی وفات تک ایک طویل جدوجہد تھی کہ جس کی قیادت علماء، مجاہدین اور تحریکی لوگوں کے ہاتھوں میں رہی لیکن ۱۹۲۰ کے بعد قیادت سیکولر لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جدوجہد کا رنگ جمہوری ہو گیا۔ مغربی علوم، افکار اور اداروں کو مسلمان فطری سمجھنے لگے اور غلبہ دین کی بجائے الگ الگ قوم اور ملک کی جدوجہد شروع ہو گئی۔

۱۹۸۰ کی دہائی میں جہاد افغانستان نے مسلمانوں کے اندر غلبہ اسلام کو ایک ممکن حصول جدوجہد بنا دیا چنانچہ آج سرمایہ دارانہ نظام کی پشتی بانی کا کام جو استعمار کر رہا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ کر اور پھر حکمت عملی تیار کر کے ہی ہم ان خطرات سے بچ سکتے ہیں جن کا شکار ہم انگریزی استعمار کے وقت ہوئے تھے۔

آج کا استعمار پہلے کے مقابلے میں کمزور ہے:

آج کا استعمار پچھلی صدی کے استعمار کے مقابلے میں بہت سی کمزوریاں رکھتا ہے جس کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آج خود مغرب میں اس کے بنیادی نظریات وافکار پر سے ایمان متزلزل ہو رہا ہے۔ آج خود مغرب اپنے نظریات کی عقلی دلیل دینے سے قاصر ہے۔ پس جدیدیت (Post Modernity) اس کی واضح مثال ہے جو ان افکار اور نظریات کو اختیار کرنے کی وجہ ان نظریات کا مغربی تاریخ اور روایات کا حصہ ہونا قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مغرب کی یہ پوزیشن انگریزی استعمار کے دور کے مقابلے میں بہت کمزور ہے کہ جس وقت مغرب کو اپنے علوم اور نظریات کے آفاقی ہونے کا یقین تھا اور اس کے لیے ان کے پاس عقلی دلائل کی بہتات تھی۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ عملی طور پر سرمایہ دارانہ نظام عالمی (Global) ہو گیا ہے۔ پچھلی صدی میں

سرمایہ قومی ریاستوں میں مرتکز ہوتا تھا یعنی جاپانی سرمایہ، انگریزی سرمایہ، فرنچ سرمایہ وغیرہ اس لئے سرمائے کی بڑھوتری کے لئے قومی ریاستوں کا نظام چلتا رہا۔ لیکن اب سرمایہ عالمی ہو گیا ہے اور عالمگیریت (Globalization) کا مطلب بھی یہی ہے کہ سرمایہ Global ہو گیا ہے اب وہ ریاستوں کے کنٹرول میں نہیں رہا بلکہ اب سرمایہ مرتکز ہوتا ہے بین الاقوامی کارپوریشن اور مالیاتی اداروں (Multi National Corporations and Financial Institutions) وغیرہ میں چونکہ سرمایہ Global ہو گیا ہے اس لئے اس نظام کو Global سطح پر جاری اور نافذ رکھنے کے لئے ایک عالمی ریاست (Global State) کی ضرورت ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کا سیاسی نظام جمہوری ہے اور جمہوریت کے نتیجے میں کوئی Global State قائم کرنے سے مغرب قاصر ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جو ریاست وجود میں آئی وہ امریکہ ہے۔

سرمایہ درانہ نظام کے بارے میں تیسری بنیادی بات اس کی عدم مساوات کی خصوصیت ہے۔ اصولاً سرمایہ داری مساوات کا دعویٰ کرتی ہے لیکن عملاً چونکہ مارکیٹ کی سطح پر سرمایہ مختلف مقدار میں ہوتا ہے اس لئے معاہدات (Contract) برابری کی سطح پر نہیں ہوتے۔ سرمایہ مسلسل ارتکاز کے عمل سے گزرتا رہتا ہے اس لئے مارکیٹ میں عدم مساوات میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے مارکیٹ کے اس رجحان (Frustration) کو پورا کرنے کی اور عدم مساوات کو جواز فراہم کرنے کے لئے ریاست کی سطح پر جمہوریت ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ریاستی سطح پر جمہوری نظام اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مارکیٹ کی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام آپ کے ساتھ جو ناانصافی کرتا ہے اس کی تلافی ریاست کی سطح پر آپ کا ووٹ کرتا ہے۔ ریاست کی سطح پر آپ کا ووٹ بش، پرویز یا بل گیٹس کے برابر ہے اور ریاستی سطح پر تمام لوگ برابر ہیں۔ اسی کا نام ہئیتی مساوات (Formal equaily) ہے اس لئے ہئیتی مساوات کو وسعت اور فروغ دینا سرمایہ دارانہ نظام کی بقا کے لئے ناگزیر ضرورت رہتی ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست اپنی توسیع کے لئے دو طریقے اختیار کرتی ہے پہلا اور بنیادی طریقہ جبر واستبداد کا ہے اور دوسرا برضاء ورغبت کا ہے۔ جہاں تک قوت و جبر کا تعلق ہے امریکی ریاست کا وجود ہی ڈیڑھ کروڑ سرخ ھندی (Red Indian) کے دو صدیوں کے منظم نسل کشی پر قائم ہوا۔ ان کی زمینیں چھینی گئیں ان میں مختلف اقسام کی بیماریاں پھیلائی گئیں، یہی رویہ امریکی ریاست اسرائیل کا ہے جو وہ فلسطین کے ساتھ کر رہا ہے یہی تاریخ سرخ ھندیوں کے بعد سے آج تک جاری ہے۔ کیوبا، کوریا، میکسیکو، ویتنام، چین، سوڈان، لبنان، بوسنیا، افغانستان، عراق غرض ایک طویل سلسلہ ہے جو صرف سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل بربادی پر ہی رک سکتا ہے۔

ریاستی جبر کا خاص تعلق سرمایہ دارانہ نظام جہاں قائم ہو گا وہاں افراد، معاشرہ، ادارے اور ریاست میں سفاکی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ظلم، بربریت ایک لازمی صفت کے طور پر کام کرے گی اس کی شکل ریاست کے اند اور ریاست کے باہر مختلف ہوگی۔

سرمایہ دارانہ ریاست کی بنیادی اقدار حقوق انسانی' رواداری اور برداشت کا نظریہ، جمہوریت، Freedom (آزادی) کو اگر کوئی معاشرہ یا ریاست برضا ورغبت اختیار کرلیتی ہے اور اس ریاست میں ضمیر کی آزادی کا حق اور سرمایہ درانہ ملکیت کا حق عوام کو دیا جاتا ہے' نتیجتاً ایک دستوری ریاست وجود میں آجاتی ہے اور زندگی سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب ہوجاتی ہے تو پھر اس ریاست کو دوستی کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور اگر یہ اقدار برضا و رغبت قبول نہ کیے جائیں تو پھر جبر وقوت کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے خواہ وہ ریاست افغانستان وعراق ہو یا شمالی کوریا۔

مغرب کے حوالے سے مغالطہ آمیز گفتگو:

اس لئے امریکی جبر وقوت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس قوت کے پیچھے کارفرما نظریات اور ان اصطلاحات کو سمجھنا ہوگا جنہیں مغرب نافذ کرنا چاہتا ہے آج بھی ہمارے مفکرین کا اعتراض مغرب پر یہ ہوتا ہے کہ امریکہ حقوق انسانی اور آزادی کی بات کرتا ہے بہت اچھی بات ہے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو کرنے سے پہلے ہمیں اپنے دینی اصطلاحات نماز' تقویٰ' صبر' نیکی' گناہ وغیرہ کو دیکھنا ہوگا جس طرح اسلامی اصطلاحات کی کسی قادیانی یا پرویزی تفسیر کو ہم نہیں مان سکتے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کی گئی ہو بالکل اسی طرح مغربی اصطلاحات کی اسلامی تفسیر سوائے اپنے آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھی چنانچہ مغربی اصلاحات کو مغرب ہی کی تفسیر کے مطابق سمجھنا اور اس کا اسلامی محاکمہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اگر ہم رواداری کو لیں تو رواداری کے معنی یہ ہیں کہ Public سطح پر یعنی معاشرتی اور ریاستی سطح پر تو سرمایہ درانہ نظام ہی چلے گا ہاں (Private) ذاتی سطح پر آپ کی جو مرضی آئے آپ چاہ سکتے ہیں۔ ذاتی سطح پر آپ اسلام چاہیں یا عیسائیت' نماز پڑھیں یا شراب پئیں۔ زنا کریں یا اس سے نفرت کریں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے ہاں معاشرتی یا ریاستی سطح پر قوت یا قانون کے ذریعہ اس کا اظہار کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ریاستی اور معاشرتی سطح پر قدر بدستور تری برائے بدستور تری ہی ہوگی یہی Toleration یا رواداری ہے۔

امریکی دستور اور حقوق انسانی کا منشور کتاب اللہ کا رد ہے:

امریکا کی خاص حیثیت سرمایہ دارانہ نظام میں یہی ہے کہ امریکا وہ پہلی اور واحد ریاست ہے جس کے قیام کا مقصد حقوق انسانی اور رواداری کو قائم کرنا ہے اس کے علاوہ امریکی قومیت کی کوئی بنیاد نہیں ہے امریکہ کا اعلان آزادی Decleration of Independace جو 1776ء میں ہوا' Fedralist Papers (وہ بنیادی مسودہ

جس کی بنیاد پر امریکی دستور بنا) اور امریکی دستور تینوں اسی فلسفے کی غماز ہیں۔ امریکی ریاست سرمائے کے لئے تعمیر شدہ دستوری ریاست ہے اور اس کے بعد جتنے بھی دساتیر بنے وہ سب امریکی دستور ہی کی تفسیر وتعبیر ہیں خود UNO کا Decleration Of Human rights (چارٹر آف انسانی حقوق) امریکی صدر روز ویلٹ کی بیوی نے لکھا ہے جو امریکی دستور ہی سے ماخوذ ہے۔ اسی دستور نے امریکا میں انجیل کی جگہ لی اور اسی دستور نے اسلامی دنیا میں قرآن کو بے دخل کیا۔ جس طرح مغرب نے کتاب اللہ کو رد کرکے کوئی اور کتاب اللہ نہیں رکھی بلکہ دستور کو بنیاد بنایا۔ بالکل اسی طرح مسلمان بھی دستور کی حیثیت کو تبدیل نہیں کرسکتے خواہ وہ کتنا ہی اسلامی دستور بنالیں۔

اس لئے امریکی ریاست کی ابتداء دستور بننے کے بعد کی ہے اس سے قبل کی تاریخ کو وہ رد کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ہجرت کو ہم اپنی تاریخ شمار کرتے ہیں۔

دستوری ریاست کو جاننے کے بعد امریکی ریاست کی دو متضاد حیثیتوں کو جاننا بھی ضروری ہے پہلی حیثیت سرمائے کی عالمی ریاست کی ہے اور دوسری حیثیت قومی جمہوری ریاست کی ہے۔

امریکا: عالمی سرمایہ داری کا محافظ:

امریکا کی عالمی سرمایہ درانہ نظام کے محافظ کی حیثیت سے کچھ خصوصی فرائض ہیں جن کا تعلق سرمائے کے عالمی مفاد سے متعلق ہے لیکن ان فرائض کو ادا کرنے کے لئے امریکی ریاست کو امریکی عوام سے مسلسل صاد لینی پڑتی ہے۔ عوام الناس کا محرک اغراض ہوتی ہے اس لئے ریاست کو سرمائے کے عالمی مفاد کا خیال اس طریقہ سے رکھنا پڑتا ہے کہ جس سے امریکی عوام کے مفادات متاثر نہ ہو۔ امریکی عوام اور ریاست کے درمیان مختلف اختلافات کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے مثلاً افغانستان اور عراق کی جنگ کو عالمی سرمائے کے تحفظ کے لئے ناگزیر سمجھا گیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ قومی نقصانات کے پیش نظر عوامی حلقوں میں جنگ کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ رویہ بھی امریکا کی محدودیت پر دلیل ہے کہ چونکہ عملاً Global State کی حیثیت میں بڑا تضاد ہے اس لئے آج یہ فیصلہ کرنا کہ سرمایہ داری کے فروغ اور اس کے تحفظ کے لئے کون سا قدم زیادہ بہتر ہے امریکہ کے لئے بہت مشکل ہے سرمایہ دارانہ ممالک کے درمیان پالیسیوں کا اختلاف بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

سرمایہ دار ریاستوں کی اہم کمزوری:

سرمایہ دارانہ ریاست کی ایک اہم کمزوری اس کے نظریے کے لئے قربانی دینے کی صلاحیت ہے اسی کے دو اجزاء ہیں پہلا جز خود مغرب کی عددی قوت ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات (انسان پرستی' جمہوریت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورانسانی حقوق پرعمل پیرا ہونے کے نتیجے میں اس معاشرے میں روبہ زوال ہے۔عورتیں بچے پیدا کرنے اوران کی پرورش سے انکاری ہیں چنانچہ سرمایہ درانہ ریاستیں عددی طور پر خودکشی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں دوسرا جزدنیا پرستی اورموت کا خوف ہے ان دووجوہات سے اپنے نظریے کے لئے قربانی دینے کی صلاحیت ان ریاستوں میں تیزی سے کم ہورہی ہے عراق کی شکست اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مغرب کوئی ایسی لڑائی لڑنے سے قاصر ہے جووہ کم مدت اورکم قربانی سے جیت نہ سکے۔چنانچہ اس کی کودور کرنے کے لئے روبوٹ کی تیاری' Space War Program انسانی کلوننگ اوراعضاء کی کلوننگ پر زبردست تحقیق جاری ہے۔لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود جس نوعیت کی الوالعزمی استعماریت کی بالادستی کوقائم رکھنے کے لئے چاہیۓ وہ امریکہ کے بس کی بات نہیں۔اس کی کودور کرنے کی سیاسی کوشش Bureaucratization of high politics یعنی اعلیٰ سیاست کو بیوروکریسی کے حوالے کردینا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے ماتحت ایسے ادارے قائم کئے گئے ہیں جن کی نوعیت Technical Agency کی ہے۔جو فیصلے ریاستیں سیاسی اجتماع کی بنیاد پر کرتی ہیں فنی ادارے یہ فیصلے سرمایہ دارانہ فنی بنیادوں پر کرتے ہیں اوران فیصلوں کوایک عقلانہ فیصلے کے طور پر پوری دنیا کے ممالک میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ایک مستقل عمل ہے جو بڑی تیزی سے غیر سرمایہ درانہ ممالک میں بڑھ رہا ہے چنانچہ مغرب کے جمہوری عمل کے غیر سرمایہ دارانہ ممالک میں پھیلاؤ کی راہ میں ایک رکاوٹ اور عام طور پر جمہوری عمل سے لوگوں کی غیروابستگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے جو فیصلے سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ کے اندر بحث ومباحثے کرتی تھیں اب وہ تمام فیصلے یہ Technical Agencies کرتی ہیں اوراس بات کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جب ترقی یاسرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری ہی ریاستی عمل کا مقصد ہے تو یہ مسئلہ کوئی سیاسی نہیں بلکہ فنی مسئلہ ہے اور کسی خاص ملک میں ترقی کیسے ہوگی اسکا جواب Techinical ماہرین دیں گے۔اس کا جواب World Bank` IMF` WTO اوردیگر Technical ادارے دیں گے۔

اس عمل کے نتیجے میں آہستہ آہستہ سیاسی اورمذہبی ایشوز غیرسیاسی اور Technical بنیادوں پر طے کئے جاتے ہیں اور یہ عمل بڑھ کر تمام شعبوں پر حاوی ہوجاتا ہے چنانچہ دفاع' صحت اور پاپولیشن' ماحول (Environment) وسائل کا استعمال' سمندری قوانین' معدنیات کے قوانین غرض سرمایہ درانہ اداروں اوران کے قوانین کاایک سیلاب ہے جو ہرطرح کے قومی اور مذہبی اقدار کوتہس نہس کردیتا ہے اس لئے ان اداروں اور قوانین کوالگ الگ نہیں دیکھنا چاہیۓ بلکہ ان کی اچھائی اور برائی پر گفتگو کرنے کی بجائے ان کوسرمایہ درانہ نظام کے ایک جز کے طور پر دیکھنا چاہیۓ کہ یہ قوانین اورادارے کس طرح سرمایہ درانہ نظام کومضبوط کرنے کا انتظام کرتی

ہے۔

سرمایہ درانہ نظام کو جو عالمی سطح پر تنظیم فراہم کرتی ہے وہ UNO ہے مگر قوانین کے نفاذ کے لئے جو ریاست قوت فراہم کرتی ہے وہ امریکا ہے International Accountancy Iso 9000-9002 Bodies ماحول کی کوالٹی' تجارت کے معیارات' غرض یہ تمام معیارات اورقوانین امریکی جبر کے نتیجے میں نافذ ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک متضاد صورتحال ہے کہ سرمایہ تمام ریاستوں کوکمزور کرتا ہے لیکن امریکی ریاست کی قوت میں اضافہ اس کی ناگزیر ضرورت ہے۔چنانچہ اس بات کواچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب تک امریکی قوت کو بے دخل نہیں کیا جائے گا اوراس کی شان وشوکت کوتوڑا نہیں جائے گا سرمایہ دارانہ نظام کوختم کرنا ممکن نہیں لہذا سرمایہ درانہ نظام اورمغربی تہذیب سے مقابلہ دراصل امریکہ سے مقابلہ ہے۔

اس لئے امریکہ سے ہماری دشمنی کسی نسلی تعصب یا امریکی عوام سے نفرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عالمی سرمایہ درانہ نظام کے پشتی بان کی حیثیت سے ہے اوراگر وہ سرمایہ درانہ نظام کی پشت پناہی چھوڑکر اسلام قبول کرلے تو وہ اسی طرح ہمارے بھائی ہوں گے جس طرح قریش مکہ کی حیثیت اسلام قبول کرلینے کے بعد تھی۔

سرمایہ دارانہ نظام کوتباہ کرنے کی حکمت عملی

جہاں تک سرمایہ درانہ نظام اورامریکہ سے مقابلہ کی حکمت عملی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ نظام کسی جز کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر تہذیب کی حیثیت رکھتا ہے۔جس کی علمیت' اس کے ادارے اوراس کی عسکری قوت ایک اکائی کی حیثیت سے پوری دنیا پر غلبے کے لئے کوشاں ہے چنانچہ ایک لاالہ الاالانسان کاعقیدہ رکھنے والی تہذیب سے مصالحت' مکالمے اورافہام وتفہیم کی حکمت عملی کا سوائے اسلام کوایک شکست خوردہ تہذیب بنانے کے کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ایسے معذرت خواہانہ انداز رکھنے والے مسلم مفکرین دراصل سرمایہ درانہ نظام کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں ایک تو وہ مغرب کی عسکری طاقت سے خوفزدہ ہیں اوردوسرا وہ سرمایہ درانہ نظام کودوحصوں میں تقسیم کرکے دیکھتے ہیں۔

اس نظام کے مطابق ایک حصہ خبیث ہے۔جس کا تعلق زنا' شراب' بے حیائی' جرائم اور ظلم وغیرہ سے ہے جبکہ دوسرا حصہ جوکہ قابل رشک اورقابل تقلید ہے وہ علوم وفنون (سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ) حقوق انسانی' قانون کی حکمرانی' دولت کی فراوانی وغیرہ ہے چنانچہ مغربی تہذیب کی علمیت اوراس کے اقدار کوسمجھنا اور جوخباثت اس علمیت اوراقدار پر عمل کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اس کواسی تہذیب کے ایک جز کی حیثیت سے پہچاننا اوراس کے اقدار اوراداروں کواقداری (Value looded) سمجھ کر اسے بالکلیہ رد کرنا ہی سرمایہ داری سے مقابلہ کرنا ہے۔

آج کے دور میں طالبان اورعرب مجاہدین نے جس عسکری جدوجہد کی بنیاد ڈالی ہے اسی جدوجہد کومعاشرتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

معاشی سیاسی اور علمی بنیادوں پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

آج جبکہ مغرب خود اپنی آفاقیت کے دعوے سے دستبردار ہو چکا ہے اور اس کے اقدار خود اس کے گڑھ میں متزلزل ہو رہے ہیں۔ اسلامی علوم اور اقدار کی آفاقیت پر اصرار کرنا ناگزیر ہو چکا ہے چنانچہ مغربی استعمار کو فنا کر کے اسلامی تہذیب کے غلبے کی جدوجہد کو ممکن بنانے کے لئے درج ذیل بنیادی سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے۔

(۱) علوم کی سطح پر مغربی سرمایہ دارانہ علوم کا امام غزالی کے طریقے کار کے مطابق تہافہ کس طرح ممکن ہے؟

(۲) معاشرتی سطح پر خاندان، برادریاں اور قبائل، محلہ اور بازار، مساجد اور مدارس اور دیگر معاشرتی اداروں کو کن خطوط پر منظم کریں تاکہ یہ ادارے نہ صرف عام مسلمانوں کو دنیا پرستی ترک کر کے آخرت کی طرف راغب کرنے کا کام کریں بلکہ کافر ریاست کے خلاف اسلام کے مضبوط قلعے ثابت ہوں۔

(۳) معاشی طور پر کیا پالیسیاں بنانی چاہیں کہ سرمایہ درانہ نظام کے Globalization کے نتیجے میں جو حلال کاروبار مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے اس حلال کاروبار کو وسعت دے کر زیادہ سے زیادہ افراد کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ ہماری جدوجہد اور ہمارا پیسہ سرمایہ درانہ نظام اور اس کے اداروں میں ضم نہ ہو جائے بلکہ اس نظام کو اس کے اداروں سمیت دیس نکالا دیا جائے۔

(۴) سیاست کو کن خطوط پر منظم کیا جائے تاکہ قوت قانون، بیوروکریسی، پارلیمنٹ اور فوج سے منتقل ہو کر علماء اور مجاہدین کے ہاتھوں میں آ جائے۔

www.KitaboSunnat.com

باب ششم

خصوصی مطالعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش

نئے تناظر میں دینی تحریکوں کے کام میں تطبیق کی ضرورت

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

کیا واقعتاً نظام بدل رہا ہے؟

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کو تاریخی اعتبار سے نظامی تبدیلی [Systemic Transition] کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ایسے ادوار پہلے بھی گزر چکے ہیں مثلاً سلطنتِ روم کے زوال کا دور [دوسری سے چوتھی صدی عیسوی کا دور] سلطنتِ عثمانیہ کے انحطاط [اٹھارویں اور انیسویں صدی کا دور] مسیحی یورپ کے انتشار کا دور [پندرہویں اور سولہویں صدی] وغیرہ۔ ان ادوار کی اہم ترین خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں ایک نظامِ زندگی آہستہ آہستہ معطل ہوتا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک یا کئی اور نظام ہائے زندگی کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہم دورِ حاضر کے تناظر میں اس عمل کا جائزہ لیں گے لیکن پہلے نظامِ زندگی کے تصور کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

نظامِ زندگی کیا ہے؟

انسانی زندگی ایک مربوط عمل ہے۔ انسان کی سوچ، عمل اور تعلقات میں گہرا ربط ہے۔ عمل اور تعلقات سوچ کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ سوچ کی بنیاد احساس ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ان معنوں میں ہے کہ وہ لامحالہ اپنی انفرادی حیثیت میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خیر اور شر کیا ہیں۔ اس دنیا میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کو کیسے اعمال و افعال اختیار اور کیسے تعلقات استوار کرنے چاہئیں؟ اسی بنیادی انفرادی ذمہ داری کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص اپنی انفرادی موت سے دوچار ہوتا ہے اور اس کو انفرادی طور پر اپنی قبر میں اپنے اعمال کا جواب دینا ہوتا ہے۔

ہم مسلمان ہیں یا آزاد ہیں؟

اپنی انفرادیت کے تعین کے لیے ہر شخص اس سوال کا جواب دینے پر مجبور ہے کہ "میں کون ہوں؟" آج کل کے زمانہ میں اس سوال کے دو جوابات مقبول ہیں: [۱] میں مسلمان ہوں [۲] میں آزاد ہوں۔

ان میں سے جو جواب بھی دیا جائے وہ چند قبل از احساس اور قبل از فکر پر مبنی مفروضات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی چیز کو "ایمان" کہتے ہیں۔ ایمان دلیل اور وجدان پر منحصر نہیں۔ دلیل اور وجدان ایمان پر منحصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمت اللہ علیہ کسی شخص کے ایمان لانے کو معجزہ کہا کرتے تھے۔ [آپ کے دستِ مبارک پر ہزاروں لوگ ایمان لائے۔ کوئی شخص اپنے احساسات یا اپنی سوچ کی بناء پر ایمان نہیں لاتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت عظیم مفکر اور روحانی پیشوا مثلاً ارسطو، گاندھی، ووکانندا، کانٹ، آئن اسٹائن وغیرہ ایمان نہیں لائے۔ ایمان کی دولت صرف اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کے نتیجے میں ملتی ہے۔ گاندھی تو ایمان نہ لائے لیکن ان پڑھ مرہٹہ لیڈرے ٹانٹیا گوپی کو خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالمِ خواب میں کلمہ پڑھوایا اور ٹانٹیا گوپی تقی الدین بن گئے اور شہادت سے قبل ان کی دنیا بدل گئی۔

احساس اور تفکرات کے اظہار کی دو سطحیں:

احساس اور فکر کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ اسی چیز کو ہم صوفی تصورِ حال سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر فرد اپنے حال کے مطابق اپنے مقام کا تعین کرتا ہے جو شخص اسلام پر ایمان لایا اس کے احساسات اور افکار اسی کے ایمان کا پرتو ہیں اعمال اپنے احساس اور تفکرات کا اظہار ہیں اور یہ اظہار دو سطحوں پر ہوتا ہے۔

[۱] معاشرہ کی سطح پر [۲] ریاست کی سطح پر

اقدار بدلنے سے ادارے بھی بدل جاتے ہیں:

معاشرہ اس اجتماع کو کہتے ہیں جو افراد بغیر جبر و اکراہ اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے قائم کرتے ہیں۔ چونکہ انفرادیت کا تعین مختلف ہے۔ کچھ لوگ مسلمان ہیں اور کچھ لوگ کافر۔ لہٰذا معاشرے بھی مختلف النوع ہوتے ہیں۔ معاشرہ رضا کارانہ [Voluntary] صف بندی سے وقوع پذیر ہوتا ہے یعنی معاشرہ میں مختلف ادارے وجود میں آتے ہیں مثلاً خاندان، مسجد، بازار، محلہ، قبیلہ، برادریاں، مدرسہ، مدینہ، نظامِ شفع وغیرہ۔ ان اداروں کے قیام کی بنیاد تاریخی روایات کا تسلسل ہے۔ ہر ادارہ معاشرتی تسلسل کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ انہی اقدار کی غمازی کرتا ہے جو قدیم زمانے سے معتبر تسلیم کیے جاتے ہیں، لیکن جیسے جیسے ان اقدار میں تبدیلی آتی ہے معاشرتی ادارتی تنظیم بھی تغیر پذیر ہوتی ہے۔ مثلاً مسلم معاشرہ میں خانقاہی نظام تقریباً مکمل طور پر معطل ہو گیا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالخصوص بازار کی زندگی پر خانقاہ کا اثر تقریباً ختم ہو گیا۔ خانقاہ کی جگہ Chambers of Commerce نے لے لی ہے۔ اسی طرح یورپی معاشرہ میں خاندان کا ادارہ ناپید ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ [Cohabitation] نے لے لی ہے۔

اقدار میں تبدیلی کی مثالیں:

اس نوعیت کی تبدیلیاں جبر کی بنیاد پر وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔ کراچی اور لاہور کے تاجروں نے بہ رضاو رغبت بغیر کسی جبر کے خانقاہوں سے اپنے قدیم تعلقات آہستہ آہستہ منقطع کیے ہیں۔ نیویارک کا نوجوان زنا کو نکاح پر ترجیح دیتا ہے کوئی اس کو زنا کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ معاشرتی تغیر [Social Change] کے عمل کی بنیاد اقدار کی تبدیلی ہے جبر نہیں ہے۔

ریاست کو جبر یا معاشرتی رضا سے ملنے والے اختیارات:

لیکن معاشرہ کو ایک نظامِ جبر کی ضرورت ہے، اس نظامِ جبر کو ریاست کہتے ہیں۔ ریاست معاشرتی اقدار کی بنیاد پر جائز و ناجائز حلال اور حرام کے ان تصورات اور پیمانوں کو نافذ العمل بناتی ہے جن کو معاشرتی سطح پر مقبولیت حاصل ہے، یا جن کو معاشرہ برداشت کرنے پر آمادہ ہے۔ ریاست محض نظامِ جبر نہیں بلکہ اقدار کا وہ نظامِ جبر ہے جس کو عام مقبولیت یا عام برداشت حاصل ہو۔

ریاست مقبول معاشرتی اقدار کو نافذ العمل بنانے کے لیے جبری صف بندی عمل میں لاتی ہے۔ یہ جبری ادارے مثلاً عدلیہ محصولاتی تنظیم، شہری انتظامیہ، محتسب، فوج۔ اس قوت کا اظہار اور ترتیب ہیں جو معاشرہ اپنے مقتدرین کو سونپنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس معاشرتی رضا کی دو نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدرین ریاستی نظام کے ذریعے ان اقدار کو نافذ کرنے کی کوشش کریں جو معاشرے کا ایک عام باشندہ فی الواقع پسند کرتا ہو، مثلاً ایک عام امریکی آزادی اور ترقی کو اقدار کے طور پر قبول کرتا ہے اور امریکی ریاست ان کو نافذ العمل بنانے کے لیے ملک میں اور ملک سے باہر۔ مثلاً عراق اور افغانستان میں جو جبر کرتی ہے ایک عام امریکی اس کا حمایتی ہے اور اس حمایت کا اظہار انتخابات میں بش کو منتخب کر کے کرتا ہے۔

عوامی رضا کی شکل برداشت بھی ہے:

عوامی رضا کی دوسری شکل برداشت ہے۔ جب برصغیر میں انگریزی ریاستی نظام قائم ہوا تو جن اقدار کا وہ غماز تھا ان کو ہندوستانی معاشرہ میں قبولیت عام حاصل نہ تھی، لیکن ان اقدار اور ان پر قائم نظامِ اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے عوام خاطر خواہ قربانیاں دینے پر راضی نہ تھے، لہٰذا جہاد ۱۸۵۷ء اور حضرت شیخ المشائخ امداد

اللہ مہاجر مکی رحمت اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمت اللہ علیہ کی تحریکات جہاد ناکام ہوئیں اور علمائے دیوبند اور بریلی کا عوام نے ساتھ نہ دیا۔ مسلم عوام اور خواص انگریزی اقدار اور انگریزی اقتدار کو برداشت کرنے پر راضی ہو گئے۔ سرسید کامیاب ہو گئے اور پاکستان جدید مغربی اقدار، اقتدار و روایات کی وارث ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا۔

انسانی حیات تین سطحوں پر ہوتی ہے:

اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی حیات تین سطحوں پر ہوتی ہے:

[۱] انفرادی سطح پر جہاں فرد اپنی ایمانیات کا تعین کرتا ہے اور ان ایمانیات کی بنیاد پر اپنے حال اور مقام کا تعین کرتا ہے۔ [۲] معاشرتی سطح پر جہاں ان اقدار کے فروغ کے لیے جن کو افراد نے غیر اکراہی طور پر اختیار کیے ہیں، غیر اکراہی یا رضا کارانہ voluntory صف بندی کہی جاتی ہے۔ [۳] ریاستی سطح پر جہاں جبری مقبول عام یا عام طور پر برداشت کیے جانے والے، اقدار کو قانون اور قوت کے ذریعہ نافذ العمل بنایا جاتا ہے۔

نظام زندگی تین سطحوں کے ارتباط کا نام ہے:

ان تینوں سطحوں کے ارتباط کو ''نظامِ زندگی'' کہتے ہیں۔ ''نظامِ زندگی'' کا تصور حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کی تصنیف ''حجۃ اللہ بالغۃ'' اور حضور رحمت اللہ علیہ کی دوسری تصانیف میں پیش کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں اسی تصور کو مولانا مودودی رحمۃ علیہ نے اپنی دو کتابوں میں واضح کیا ہے۔ ''اسلامی نظامِ حیات'' اور ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' ''نظامِ حیات'' سے مراد وہ مجموعہ ہے جسے ''تہذیب'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہر تہذیب ایک مخصوص انفرادیت، ایک مخصوص معاشرت اور ایک مخصوص ریاست کو فروغ دیتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے تعلیم دی ہے کہ ہمیں انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو الگ الگ نظاموں کے طور پر تصور نہیں کرنا چاہیے۔ ایک خاص انفرادیت کا ایک مخصوص معاشرت اور مخصوص ریاست ہی میں پنپنا آسان ہو سکتا ہے۔ غیر مسلم معاشرہ اور غیر مسلم ریاست میں اسلامی شخصیت کا پروان چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔

اسلامی جدوجہد کی تین سطحیں:

یہ درست ہے کہ اسلامی جدوجہد تین سطحوں پر منتج ہے:

[۱] تزکیہ [انفرادیت کی سطح پر] [۲] تبلیغ اور نصیحہ [معاشرت کی سطح پر] [۳] جہاد اور خلافت [ریاست کی سطح پر]۔

لیکن تحفظ دین اور غلبہ دین کی تحاریک کو دانستہ ان تینوں سطحوں پر کیے جانے والے کام کو مربوط کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر اسلامی انفرادیت اسلامی معاشرت اور اسلامی ریاست تقویت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں گو کہ چشتی صوفیائے کرام کا دائرۂ عمل انفرادی اصلاح رہا لیکن انھوں نے پٹھان فرمانرواؤں اور سیدنا عالمگیر رحمت اللہ کی تحریکات کی بھرپور معاونت فرمائی۔

اسلامی تحریکوں کے کام میں تطبیق کی ضرورت:

لہٰذا تحفظ اور غلبہ دین کی تحاریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مجموعی کام کو اس طرح مربوط کریں کہ اسلامی نظامِ زندگی ___ (نہ کہ صرف اسلامی انفرادیت، صرف اسلامی معاشرت یا صرف اسلامی ریاست) ___ فروغ پائے۔ یہ درست ہے کہ ہر جماعت اپنے ہی ذمہ کا کام کرے گی، لیکن وہ اس کام کو دوسری جماعتوں کے کام سے مربوط اور منطبق کرنے کی دانستہ سعی بھی لازم پکڑے گی۔ اگر عمارت کا فرش بنانے والے مزدوروں نے عمارت کی دیواریں کھڑی کرنے والے مزدوروں کی ضروریات کا خیال نہ رکھا تو اسلامی نظامِ زندگی کی عظیم الشان عمارت کس طرح کھڑی کی جاسکے گی۔

مغربی نظامِ زندگی...... سرمایہ داری:

جب ہم اسلامی نظامِ زندگی کے تحفظ اور غلبہ کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں لازماً زمانی اور مکانی تناظر کو خاطر میں لانا پڑتا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کا تحفظ اور غلبہ دورِ حاضر کے غالب اور محفوظ نظامِ زندگی کی تسخیر اور انتشار کے بغیر ممکن نہیں۔ آج جو نظامِ زندگی غالب اور محفوظ ہے وہ سرمایہ داری ہے۔ اس نظامِ زندگی کو سید قطب شہید رحمت اللہ علیہ نے ''جاہلیت خالصہ'' کہا ہے۔ مغربی نظامِ زندگی کے غلبہ کے نتیجہ میں اسلامی انفرادیت، اسلامی معاشرت اور اسلامی ریاست لازماً برباد اور منتشر ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے اندر اسلامی انفرادیت، معاشرت اور اقتدار کو فروغ پانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اس نظامِ زندگی کے مقتدرین یا ان کے وکیلوں سے مصالحت یا مکالمہ لازماً اسلامی نظامِ زندگی کے انتشار کا ذریعہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تین سطحیں:

اب ہم سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی تینوں سطحوں کا جائزہ لیں گے۔

سرمایہ دارانہ انفرادیت: سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو ''مغربی'' کہنا صرف ان معنوں میں درست ہے کہ آج یورپ اور امریکہ نے اس نظامِ زندگی کو اپنایا ہوا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی تک مغرب میں سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو نہ تحفظ حاصل تھا نہ غلبہ۔ پندرھویں اور سولہویں صدی میں بھی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی یورپ کے چند ساحلی شہروں میں جڑ پکڑ سکا تھا۔ سولہویں صدی تک سرمایہ دارانہ مخالف تحریکیں یورپ میں عام تھیں اور اسی صدی کے نصف میں [oliver Cromwell] نے ایک خالص مذہبی ریاست انگلستان میں قائم کی۔ سرمایہ دارانہ نظام

کے تحفظ اور غلبہ کے دو تاریخی سنگِ میل ہیں۔ انقلاب امریکہ [۱۷۷۶ء] اور انقلاب فرانس [۱۷۸۹ء] انگلستان کا ''شاندار انقلاب'' [Glovious revolution] [۱۶۸۸ء] ان دونوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

سرمایہ دارانہ شخصیت کا عروج:

سرمایہ دارانہ شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے عروج کی وجوہات کو بیان کیا جائے۔

چوتھی صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک: یورپ پر کیتھولک عیسائیت کو معاشرتی اور انفرادی غلبہ حاصل تھا۔ یورپی انفرادیت اور معاشرت عیسائی اقدار کی غماز تھی، لیکن یہ انفرادیت اور معاشرت ایک ایسے ریاستی نظام سے مربوط تھی جس کے خدوخال میکیاویلی (Machiavelli) نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یورپی فرمانروا کسی عیسائی شریعت کے پابند تھے اور وہ عیسائی انفرادیت اور معاشرت کے غلبہ کے ہزار سالہ دور میں خالصتاً دنیا پرستانہ [Secular] سیاست کرتے رہے اور اس سیکولر سیاست کا جواز چوتھی صدی میں عیسائیت کے سب سے بڑے عالم سینٹ آگسٹائن Saint Augestine نے City of Man اور City of God میں بیان کردیا تھا۔ Augestine کے بعد عیسائی علیت پر ارسطو اور افلاطون کی فکر بتدریج غالب آتی چلی گئی اور اس علمیاتی غلبہ نے عیسائی روحانیت کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ عیسائی فکر کو کبھی کوئی امام غزالی نصیب نہ ہوا اور قرونِ وسطیٰ کی عیسائیت علیت [Scholasticism] اعتزال ہی کی ایک شکل تھی۔

امام غزالیؒ کی اہمیت و افادیت:

[ہمارے بزرگوں نے ایسے خواب بیان فرمائے ہیں جن میں انھوں نے دیکھا کہ حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم امام غزالی رحمت اللہ علیہ کو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں اور فرمارہے ہیں ''کیا آپ کی امت میں اس جیسا عالم پیدا ہوا'' سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر ایمان ثریا سے اوپر بھی چلا جائے تو ایک فارسی اس کو واپس لے آئے گا۔ بہت سے محدثین کی رائے کہ اس حدیث میں حضور سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ حضرت امام غزالی رحمت اللہ کی طرف ہے]

عیسائی فکر نے ۱۸ اور ۱۹ ویں صدی سے قصداً اسلامی فکر کو حقیر اور بے وقعت جانا۔ امام غزالی رحمتہ اللہ کی فکر کو حقیر اور بے وقعت جانا۔ امام غزالی رحمتہ اللہ کی فکر طاہرہ کے مقابلہ میں معتزلہ دہریوں مثلاً ابن رشد، فارابی، ابن سینا کے افکارِ فاسدہ کو بنیاد بنا کر ارسطو اور جدید افلاطونیت [Neo Platonism] کے احیاء کی راہ ہموار کی۔ صلیبی جنگوں کے دور میں فکرِ اسلامی سے عیسائی نفرت اپنے عروج کو پہنچ گئی اور فکرِ اسلامی سے نفرت کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے عیسائیت نے اپنی مکمل بربادی کا سامان اپنے ہاتھوں تیار کرلیا۔

نیوافلاطونیت اور سیکولرازم نے عیسائیت کو تباہ کر دیا:

نیوافلاطونیت اور سیکولرازم کو اپنا کر عیسائی نظامِ زندگی کئی بنیادی تضادات کا شکار ہوگیا۔ عیسائیت جس اخلاقیات کا پرچار کرتی تھی خود چرچ کے اندر [یعنی مفروضہ City of God میں] ان کا وجود ناپید ہوتا چلا گیا۔ پوپ پادری اور چرچ کے دوسرے اہل کار بدترین جرائم کے مرتکب ہونے لگے۔ روحانی تربیت کے نظام [Monastaries] کو چرچ کی بیوروکریسی سے باضابطہ طور پر الگ کر دیا گیا اور اس تفریق کے نتیجے میں پوپ خود ایک سیکولر بادشاہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ معاشرہ میں چرچ کے بیوروکریسی کا نفوذ ریاستی بیوروکریسی کے نفوذ کے مماثل ہوتا چلا گیا اور یہ دونوں بیوروکریسیاں اس حد تک خلط ملط ہوگئی کہ عوام [laity] کے لیے ان میں فرق کرنا دشوار بلکہ عملاً ناممکن ہوگیا۔

عیسائیت کو نفاق نے ختم کر دیا:

جو چیز عیسائی نظامِ زندگی کو لے ڈوبی وہ نفاق تھا۔ روحانی اور اخلاقی تعلیمات اور معیارات انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیماتِ مبارکہ سے ہی ماخوذ تھیں لیکن معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تمدنی عمل کا ان تعلیمات سے تعلق بتدریج منقطع ہوگیا۔ لہٰذا افلاطونی فلسفہ اس تضاد کا منطقی جواز اور توجیہہ بیان کرتا تھا اور یہی عیسائی علیت تھی۔

ان حالات میں اخلاقِ فاسدہ کا فروغ پانا ناگزیر تھا۔ شہوت رانی، ہوس پرستی، معاشی ظلم، احتکار، لوٹ مار، خدا بےزاری عام ہوگئے۔ تیرہویں صدی سے یورپ نے اپنے قبل از عیسائی نظامِ ہائے زندگی Paganism اور Hellenism کی طرف عمومی مراجعت شروع کر دی۔ عیسائی تعلیمات کی اصولی فوقیت اور عیسائی بیوروکریسی کے نظامِ اقتدار کو چیلنج کے بعد چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ یورپ جو Pagan اور Hellenistic [یونانی] نظامِ زندگی عملاً گزار رہا تھا اس کی علمی اور اصولی فوقیت قائم کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔

عیسائیت کی اندرونی کشمکش: نوآبادیات کا قیام

پندرہویں صدی سے یورپی اخلاقی زوال کی رفتار میں برق رفتاری سے ترقی ہوئی۔ اس کے بعد یورپ دو عظیم الشان فسادوں کا شکار ہوگیا۔ ایک طرف کیتھولک اور غیر کیتھولک عیسائیت میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تقریباً دو سو سال جاری رہی اور جس میں یورپی کلیدی ممالک فرانس، اٹلی، جرمنی، ولندیز اور اسپین ملوث ہوئے۔ دوسری طرف فرانس، اسپین، پرتگال، ولندیز اور برطانیہ نے عالمی استعماریت کی بنیاد ڈالی۔ مذہبی اور

استعماری جنگوں میں مغربی یورپ کے تقریباً ہر گھرانے کے افراد شریک ہوئے۔ ان جنگوں میں وحشت، بہیمیت اور سفاکیت کی انتہا کر دی گئی۔ کروڑوں غیر یورپیوں کو قتل کیا گیا۔ پورے پورے براعظم لوٹ لیے گئے اور وہاں صدیوں سے آباد نسلوں کو کلیتاً تہہ تیغ کر دیا گیا اور برطانوی فرانسیسی، اسپینی اور پرتگالی ان کی دولت اور ان کے ملکوں پر قابض ہوگئے۔ یورپ میں لوٹی ہوئی دولت کے انبار لگ گئے اور قتل و غارت، ظلم اور استبداد، جنسی بے راہ روی، لوٹ مار، دھوکہ اور فریب یورپ میں رائج نظامِ زندگی کا حصہ بن گئے۔ اس اخلاقی تغیر کی کئی تصویریں شیکسپیئر کے ڈراموں میں پیش کی گئی ہیں۔

عیسائیت استعماریت کی تاریخی حلیف رہی ہے' آج بھی ہے:

اس لوٹ مار، جنسی بے راہ روی، قتل و غارت، ظلم اور استبداد کے فروغ میں عیسائیت ہر جگہ یورپ میں امریکہ میں مشرق بعید میں حکومت کے دستِ راست کے طور پر کام کرتی رہی۔ اس نے ہر اس جرم کا مذہبی جواز فراہم کیا جس کے ذریعے یورپی حکمرانوں نے دولت لوٹنے، قتل عام کرنے اور سفاکیت کو فروغ دینے کے لیے کیا۔ ہر استعماری لشکر کا مذہبی پیش رو کسی نہ کسی چرچ کا نمائندہ ہی ہوتا تھا اور بالکل جس طرح Evangilical پادری امریکی فوجوں کی عراقی اور افغان کارروائیوں کا جواز پیش کر رہے ہیں اسی طرح کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادریوں نے استعماری مہمات کی پشت پناہی کی۔

انقلاب امریکہ و فرانس نے عیسائیت کو بےدخل کر دیا:

۱۸ویں صدی کی ابتدا تک عیسائی نظامِ زندگی معطل ہوگیا تھا۔ عیسائی بیوروکریسی کا اقتدار سیکولر ریاستی نظام کا حصہ بن گیا تھا لیکن جیسے جیسے عیسائی بیوروکریسی کی معاشرتی گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ ویسے ویسے حکومتیں ان کو غیر ضروری تصور کرنے لگیں۔ جیسا اوپر عرض کر چکا ہوں عیسائی نظامِ زندگی کو مکمل طور پر غیر معقول اور غیر مقبول بنانا دو انقلابوں کا کارنامہ ہے۔ انقلاب امریکہ اور انقلاب فرانس ان دو انقلابوں کے ذریعہ یورپ نے جس نظام زندگی کو اصولاً عملاً رائج کیا، اس کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔

مذہب سرمایہ داری ایک نظام زندگی ہے:

سرمایہ داری ان معنوں میں ایک نظام زندگی ہے کہ اس کا اپنا ایک مخصوص تصور انفرادیت، ایک مخصوص تصورِ معاشرت اور ایک مخصوص تصورِ اقتدار ریاست ہے اور یہ تینوں تصورات باہم مربوط ہیں۔ غیر سرمایہ دارانہ شخصیت سرمایہ دارانہ معاشرہ میں پنپ نہیں سکتی۔ سرمایہ دارانہ ریاست غیر سرمایہ دارانہ معاشرت کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ سرمایہ داری ایک نظامِ زندگی سے کسی دوسرے نظامِ زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی۔ وہ دوسرے نظامِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی کو تباہ کر کے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی ملک میں اسلامی انقلاب آئے تو اسے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی، سرمایہ دارانہ انفرادیت، سرمایہ دارانہ معاشرت، سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار اور ریاست کو تباہ کرنا ہوگا۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو اسلامی نظامِ زندگی میں ضم نہیں کیا جاسکتا۔

سرمایہ دارانہ علمیت کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرت اور ریاست کے تصورات سرمایہ دارانہ علمیت سے ماخوذ ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ علمیت Peter Abelard کے وقت سے یورپ میں فروغ پا رہی تھی۔ اس فکر کے غلبہ میں ۱۷ ویں صدی بہت اہم ہے جب وہ چیز وجود میں آئی جس کو ہم Science کہتے ہیں۔ ۱۸ ویں صدی میں اسی Science نے ایک ایسے فلسفہ کو جنم دیا جس نے ان تمام نیو پلوٹونک [neo platonic] تصورات انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو مہمل ثابت کر دیا ہے جو عیسائی نظامِ زندگی کے اصل الاصول کے طور پر قبول کیے جاتے تھے۔

سرمایہ داری کو تحریک تنویر اور کانٹ نے پروان چڑھایا:

اس فلسفہ کو جس تحریک نے پروان چڑھایا وہ تحریک تنویر [Enlightenment] کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کا سب سے اہم مفکر Emanuel Kant تھا اور Kant کے کردار میں وہ تمام تضادات پائے جاتے ہیں جن کی سرمایہ دارانہ انفرادیت غماز ہوتی ہے۔ Kant اپنے آپ کو عیسائی سمجھتا تھا اور اس کے خیال میں اس نے علمیت کو فروغ دینے کے لیے جدوجہد کی ہے لیکن وہ اغلام باز [Homosexual] بھی تھا اور اس کی ذاتی زندگی نہایت نجس اور غلیظ تھی۔ اس نوعیت کے تضادات ہمیں مغرب کے ہر بڑے فکری رہنما اور ہر بڑے فلسفی، مفکر، سیاست داں کی زندگی میں ملیں گے۔ گوکہ سرمایہ داری عیسائی نظامِ زندگی کو رد کر چکی ہے لیکن عیسائی تہذیبی ورثہ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکی اور اس تہذیبی ورثہ کا اہم ترین جزو منافقت ہے۔ امریکہ کہتا ہے کہ وہ امن کے حصول کے قیام کی خاطر افغانستان اور عراق میں لاکھوں انسانوں کو مستقل قتل کیے جا رہا ہے اور امریکی عوام کی غالب اکثریت سمجھتی ہے کہ واقعی ایسا ہی ہے۔

سرمایہ دارانہ تصورِ انفرادیت کیا ہے؟

اب میں سرمایہ دارانہ تصورِ انفرادیت کی خصوصیات بیان کروں گا۔ یہ تصور Kant کے فکر سے ماخوذ ہے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ تصورِ انفرادیت: تحریک تنویر کا اہم ترین اور کلیدی تصور "Humanity" ہے۔

"Humanity" کا ترجمہ "انسانیت" کرنا غلط ہے۔ "انسانیت" کا درست انگریزی ترجمہ "Mankind" ہے۔ یہی لفظ انسانی اجتماعیت کے لیے انگریزی زبان میں ۱۸ ویں صدی سے قبل رائج تھا۔ "Humanity" کا تصور "انسانیت" کے تصور کی رد ہے۔

صہیب ایک انسان ہے وہ خود انسان نہیں بنا۔ اللہ اس بات پر مجبور نہ تھا کہ صہیب کو انسان بنائے۔ وہ چاہتا تو صہیب کو فرشتہ یا جن، یا جانور یا درخت یا پتھر بنا سکتا تھا۔ صہیب کا انسان ہونا ایک حادثہ [Contergency] ہے۔ صہیب کی اصلیت Essense اس کی عبدیت ہے۔ وہ کچھ بھی ہوتا جن یا فرشتہ یا جانور یا درخت۔ یا گھاس کا ایک تنکہ۔ ہر حال میں مخلوق اور عبد ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اصلاً مسلم ہوں اور صرف حادثاتی طور پر اور ضمناً انسان ہوں۔ میری انسانیت میری اسلامیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ میری انسانیت اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب غیر مسلم انسانوں سے مخاطب ہوتا ہوں تو انھیں اسلام کی دعوت میں دے سکتا ہوں، کسی ماورائے اسلام "انسانی مفاد کے تناظر میں ان سے مکالمہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب "رسالہ دینیات" میں خوب اچھی طرح تعلیم فرمادی ہے۔ "تجدید و احیائے دین" میں مولانا "تجدد" اور "تجدید" میں فرق بیان فرماتے ہوئے بھی اسی نکتہ پر زور دیتے ہیں۔

Human عبدیت کا رد ہے:

humanity انسانیت کے تصور کا ان معنوں میں رد ہے کہ human being عبدیت اور تخلیقیت کا اصولاً اور عملاً رد ہے۔ Kant کے مطابق human being کا بنیادی وصف اور اس کی اصل "autonomy" یعنی خود ارادیت اور خود تخلیقیت ہے۔ انسان اپنے رب کے ارادے کا مطیع ہوتا ہے۔ [قالوا بلیٰ] human being خود اپنا رب ہوتا ہے [انا ربکم الاعلیٰ]۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ humanity کی بنیادی قدر آزادی ہے human being معیارات خیر و شر خود متعین کرتا ہے۔ کوئی عمل فی نفسہ اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ نہ human being کے ارادے کے علاوہ کوئی ایسا پیمانہ ہے جس کے سامنے کسی عمل یا کسی شے کو پیش کر کے اس عمل یا فعل کی قدر [value] کو متعین کیا جاسکے۔ قدر کا تعین صرف انسانی ارادہ ہی کر سکتا ہے۔

جو عمل عالمگیر ہوسکتا ہے وہ حق ہے:

Kant کے مطابق خیر و شر کے تعین کے لیے human being کو ایک سوال کا جواب دینا چاہیے۔ کیا یہ عمل [Universalise] کیا جاسکتا ہے؟ یعنی کیا میں جو چیز پسند کرتا ہوں وہ تمام human

محکم دلائل سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

being کو پسند کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہوں۔ اگر میں زنا کی عمومی اجازت دینے کے لیے تیار ہوں مگر چوری کی عمومی اجازت دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو زنا univeralisablity پر پورا اترا اور چوری پوری نہیں اتری لہٰذا میں زنا کو اختیار کر سکتا ہوں اور چوری کو اختیار نہیں کر سکتا۔

نظریہ افادیت: لذت پرستی کا عروج

نظریہ افادیت [Utilitarianism] نے قدر کے تعین کا ایک پیمانہ بھی پیش کیا ہے اور وہ ہے شدت لذت [Intensity of Pleasure] مثلاً اگر Hang زنا کرنے سے زیادہ اور کتاب پڑھنے سے کم لذت حاصل کرتا ہے تو وہ زنا کو بدرجہ کتاب زیادہ قدر دے گا لیکن Barry کا یہ حق تسلیم کرے گا کہ وہ کتاب پڑھنے سے حاصل شدہ لذت کو زنا سے حاصل شدہ لذت کے مقابلہ میں زیادہ قدر دے۔

قدر کے ان دونوں تصورات میں human being آزاد ہے کہ وہ قدر کو اپنے ارادہ کے مطابق متعین کرے، لیکن قدر کا تعین اس طریقہ سے کیا جائے گا کہ ہر human being کو قدر کا تعین اپنے ارادہ کے مطابق کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

ہر قدر مساوی حیثیت کی حامل ہے:

لہٰذا Humanist تصورِ انفرادیت کی دوسری [ذیلی] قدر مساوات [Equality] ہے۔ ہر فرد کو اپنے ارادہ کے مطابق قدر کے تعین کا مساوی حق حاصل ہے۔ Kant اور نظریہ افادیت کے مفکر [مثلاً Mill, Bentham, Hume] اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر فرد کے تعین قدر کی ترتیب کو مساوی گردانا جائے۔ کسی کے اقداری ترجیحات کی ترتیب کو کسی دوسرے کی ترتیب پر فوقیت نہ دی جائے خود ارادیت اور خود تخلیقیت [autonomy] کا ہر human being یکساں مکلف ہے اور سرمایہ دارانہ شخصیت کی تعمیر کے لیے صرف آزادی کافی نہیں مساوی آزادی کو [equal freedom] تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔

پروگریس سرمایہ دارانہ نظام کی تیسری اہم قدر [Value]:

اس مساوی آزادی کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ human being اپنے ارادہ کو غیر human اشیاء پر مسلط کر کے اس کو اپنے ارادہ کا تابع کرے [ان غیر human موجودات میں غیر انسان اور فطری قوتیں دونوں شامل ہیں۔] human ارادے کے اس کائناتی تسلط کو progress یا ترقی کہتے ہیں۔ progress سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی تیسری قدر ہے۔ Progress کا ذریعہ سرمایہ کی بڑھوتری ہے۔ حضرت مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال رحمۃ علیہ نے سرمایہ کو تکاثر کے مماثل کہا ہے اور تکاثر کے انگریزی معنی

"rivalry in Wordly Increase" بیان فرمائے ہیں۔ سرمایہ میں بڑھوتری آزادی کے فروغ کی عملی شکل ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جب ایک شخص اپنے human ہونے کو تسلیم کرتا ہے تو وہ سرمایہ کی بڑھوتری کو اپنی زندگی کے اولین مقصد کے طور پر قبول کرتا ہے کیونکہ آزادی کا مطلب ہی سرمایہ کی بڑھوتری ہے اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں، جو شخص آزادی کا خواہاں ہے وہ لازماً اپنے ارادہ سے اقدار کی وہ ترتیب متعین کرے گا جس کے نتیجے میں اس کی آزادی میں اضافہ ہو۔

اصل قدر ارادہ انسانی ہے: نفس الٰہ ہے

سرمایہ ہی وہ شے ہے جو ممکن بناتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی چاہے حاصل کر سکے۔ مسجد بنانا چاہے تو مسجد بنائے، شراب خانہ بنانا چاہے تو شراب خانہ بنائے، چاند پر جانا چاہے تو چاند پر جائے، کسی چیز کی کوئی اصلی [intrinsic] قدر نہیں۔ ہر چیز اپنی قدر صرف اور صرف human خواہش اور ارادہ سے حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا قدرِ اصل [Intrinsic Value] صرف ارادۂ انسانی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدر صرف اس کی ہے کہ انسان جو چاہنا چاہے وہ حاصل کر سکے اور تمام اعمال اور اشیاء کی قدر اس امر سے متعین ہوتی ہے کہ Human اس کو دوسرے اعمال اور اشیاء کے مقابلہ میں کتنی شدت سے پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت میں قدرِ مطلق صرف human being کے ارادے محض [Preference for preference itself] یعنی کہ سرمایہ کی ہے کیونکہ سرمایہ ہی ارادہ محض کا اظہار ہے۔ سرمایہ ہی یہ ممکن بناتا ہے کہ Human جو چاہنا چاہے اس کے حصول کی جستجو کرے۔ لہٰذا ارادہ محض [preference for preference itself] کے سوا کسی چیز یا فعل کی کوئی قدرِ اصل [absolute and intrinsic value] نہیں ہر فعل اور عمل کی قدر محض تقابلی ہے، یعنی Exchange Value۔ قدرِ محض [absloute value] اور تقابلی قدر [Exchange Value] کے تعلق کو میں اگلے حصے میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

اصلی قدر = ارادہ انسانی = سرمایہ = سرمایہ دارانہ عقلیت:

قدرِ اصل صرف ارادہ انسانی کے اظہار یعنی سرمایہ کی ہے۔ لہٰذا سرمایہ دار عقلیت [rationality] کا تقاضا ہے کہ ہر human being اپنی خواہشات کو اس طرح مرتب کرے کہ ان کے حصول [realisation] کی جدوجہد قدرِ اصل یعنی سرمایہ کی بڑھوتری کے فروغ میں ممد اور معاون ہو۔ خواہشات کی ہر وہ ترتیب جو human being کو سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کا آلہ کار [Instrument] نہیں بناتی، عقلیت کے خلاف ہے irrational ہے۔ جیسا کہ حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ نے تہافتہ الفلاسفہ میں تحریر فرمایا ہے، عقلیت کے کئی جاہلانہ تصورات ہیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت rationality۔ وہ جاہلانہ عقلیت ہے جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

huaman being کے ارادہ محض [یعنی سرمایہ کی بڑھوتری] کو اصل الاصول اور مقصد اصل [end in itself] کے طور پر فرض [presume] کرتی ہے اور ہر عمل اور شے کی خود اس ذلیل اور فاسد اور باطل اور لغو مقصدِ اصل [یعنی سرمایہ کی بڑھوتری] کے حصول کے ذریعہ کی حیثیت کی بنیاد پر متعین کرتی ہے۔ اس بحث کی سہل ترین تشریح مولانا مودودیؒ کی کتاب ''عقل کا فیصلہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

زندگی کا مقصد سرمایہ کی بڑھوتری کے سوا کچھ نہیں ہے:

اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا اصل الاصول [end in itself] سرمایہ کی بڑھوتری ہے۔ سرمایہ کی بڑھوتری وہ کسوٹی ہے جس پر Human being کی ہر خواہش اور خواہشات کی تمام ترتیبوں کو جانچا جاتا ہے اور ان کی تقابلی قدر [exchange value] اس قدر محض [Intrinisc Value] کے مطابق متعین کی جاتی ہے۔ ہر وہ خواہش جو سرمایہ کی بڑھوتری کا ذریعہ نہیں بنتی۔ اس کی تقابلی قدر [Exchang Value] صفر یا منفی ہوتی ہے۔ مثلاً صہیب کی خواہش یہ ہے کہ میں جنت میں جاؤں تو اگر وہ جنت میں جانے کے لیے کیے گئے اعمال اور سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے کیے گئے اعمال میں کوئی تضاد نہیں دیکھتا تو اس کے جنت میں جانے کے لیے کیے گئے اعمال کی مثبت [positive] تقابلی قدر متعین کی جائے گی۔ مثلاً صہیب میزان بینک کا آفیسر سرحد کی حکومت کا وزیر ہے اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو شریعت کے مقبول طریقوں میں فروغ دینا چاہتا ہے تو سرمایہ دارانہ عقلیت اس کے ان اعمال کو مثبت تقابلی قدر [exchange value] کی حیثیت دے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قدر Standared Chartered Bank کے افسر اور شیر پاؤ پی پی پی کے وزیر کے اعمال کے مقابلہ میں کم ہو۔ لیکن ہوگی پھر بھی مثبت کیونکہ صہیب بھی پی پی پی کے وزیر اور SCB کے کارندے کی طرح سرمایہ کی بڑھوتری کو ممکن بنا رہا ہے۔

صہیب تبلیغی جماعت اور دعوۃ اسلامی کا کارکن ہے وہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخلہ کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ایک حصہ کو سرمایہ دارانہ عقلیت سے مطلقاً پاک کر لیا جائے۔ وہ زندگی کے اس حصہ میں human being نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے لیکن زندگی کے اس ظاہر حصہ کا پرتو اپنی باقی زندگی پر نہیں پڑنے دیتا۔ وہ سرمایہ دارانہ کاروبار کرتا ہے۔ مسلم لیگ میں شامل ہے، مشاعرہ منعقد کرتا ہے، اس صورت میں سرمایہ دارانہ عقلیت صہیب کے جنت میں جانے والے اعمال کو برداشت [tolorate] کرنے پر تیار ہوسکتی ہے۔ وہ ان اعمال کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے بے ضرر تصور کرسکتی ہے اور ان کی تقابلی قدر [exchange value] صفر متعین کرسکتا ہے۔

صہیب ایک انقلابی یا مجاہد ہے۔ وہ جنت میں جانے کے لیے اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے بھی اس کو تباہ و برباد کرنے کی مسلسل کوشش کرتا ہے۔ کاروبار کرتا ہے تو غیر سرمایہ دارانہ اصولوں پر، سیاست کرتا ہے تو انقلابی یا جہادی۔ اس کی علمی اور ادبی کاوشیں سرمایہ دارانہ عقلیت کو جہالت ثابت کرنے کی سعی ہوتی ہیں۔ ان حالات میں سرمایہ دارانہ عقلیت صہیب کے جنت میں جانے والے اعمال کو منفی [negative] تقابلی قدر [exchange value] متعین کرے گی۔ وہ ان عمال کو برداشت کرنے پر تیار نہ ہوگی۔ اس کی نظر میں صہیب ایک دہشت گرد ہے جس کو جلد از جلد قتل کر دینا چاہیے۔ صہیب کو قتل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے وہ صہیب کو جہاد یا انقلاب ترک کرنے پر راضی کرسکے۔

سرمایہ دارانہ طرز زندگی کو رد کرنے کی اجازت نہیں:

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ ''تحریک تنویر کا یہ دعوی کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکے، ایک جھوٹا دعویٰ ہے فرد کو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو رد کرنے کا حق نہیں۔ ہر فرد اپنی انسانیت [Man Kind] ترک کر کے human being بننے پر مجبور ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں سرمایہ دارانہ عقلیت ان تمام خواہشات [یعنی عبدیت] کی ''تحدید اور تنسیخ کرتی ہے جو انسانیت کے اظہار کا ذریعہ ہوسکتیں ہیں۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ہیومن رائٹس [Human rights] کے نظریات کو سمجھنا ضروری ہے۔

سرمایہ داری میں کس کی زندگی محفوظ ہے؟

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ہر human being کو تین بنیادی حقوق تفویض کرتا ہے۔

حقِ زندگی ہر human being کا حق ہے کہ وہ اپنی جان کو سرمایہ کی بڑھوتری کا ذریعہ بنائے۔ جیسا کہ ۱۷ویں صدی کے مشہور فلسفی جان لاک [John Locke] نے بیان کیا، سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں انسانی جسم، سرمایہ کی بڑھوتری کا ایک آلہ ہے [جس نظریہ کے تحت یہ رائے دی اس کو Labour theory of value کہتے ہیں اور ہم اس طرف پھر رجوع کریں گے] جب تک ایک human being اپنی زندگی کو سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، اس کی جان محفوظ ہے جو انسان زندگی کو سرمایہ کی بڑھوتری کے آلہ کے طور پر استعمال کرنے پر تیار نہیں، ان کی جان محفوظ نہیں اور اگر وہ سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرہ بن جائیں تو ان کا قتل کرنا واجب ہے۔ ۱۶ سے ۲۰ویں صدی تک امریکہ میں نو کروڑ سرخ ہندی نسل در نسل قتل کیے گئے اور John Locke نے صدیوں پر محیط منظم نسلی کشی اور قتل عام کو اسی بنیاد پر جائز قرار دیا تھا کہ ریڈ انڈین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی جان کو سرمایہ کی بڑھوتری میں کھپانے پر آمادہ نہیں۔ جارج واشنگٹن [George Washington] نے ریڈ انڈینوں کو بھیڑیے اور ابراہام لنکن [Abraham Lincon] نے ان کو سور اور سانپ کہا۔ حضرت عتبہ بن نوفل رضی اللہ عنہ تعالیٰ کے ایک قول کے مطابق امریکہ کے قدیم باشندہ حضرت یونس علیہ السلام کے امتی تھے۔ آج لاک، واشنگٹن اور لنکن کی دلیلیں جارج بش عراقی اور افغانی مسلمانوں کے قتل عام کے جواز میں پیش کر رہا ہے۔

ہر شخص اپنی خواہشات کو جس طرح چاہے مرتب کرے:

دوسرا ہیومن رائٹس [human rights] اظہار آزادی ضمیر [Right of consciousness] کا ہے۔ ہر human being کو حق ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو جس طرح مرتب کرے اور خواہشات کی تمام انفرادی ترتیبوں کو سرمایہ کی بڑھوتری کی قدر مطلق [Absolute Value] پر تولے جانے کے حق پر راضی ہو۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ خواہشات کی ایسی ترتیب مرتب کرے جو سرمایہ کی بڑھوتری کی قدر مطلق ہونے کی حیثیت کی نفی کرے اور سرمایہ کی بڑھوتری کی جگہ کسی دوسری قدر مطلق کا تصور پیش کرے۔ اس human rights کو نظریہ برداشت [tolerance] کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ نظریہ برداشت [tolerance] کے مطابق:

☆ قدر مطلق صرف سرمایہ کی بڑھوتری کو حاصل ہے۔

☆ ہر خواہش کی تقابلی قدر [relative value] اس قدر مطلق کی کسوٹی پر متعین کی جائے گی۔

☆ ہر اس خواہش اور ترجیح کو برداشت کیا جائے گا جو بڑھوتری سرمایہ کے اصل الاصول کی نفی نہیں کرتیں۔

☆ ایسی کسی ترتیب خواہشات کو برداشت نہیں کیا جائے گا جو سرمایہ کی بڑھوتری کے قدر مطلق ہونے کو چیلنج کرتی ہو۔ اگر صہیب ہندو ہو جائے تو اس کو برداشت کیا جائے گا لیکن اگر وہ انقلابی یا مجاہد بن جائے تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

سرمایہ داری انفرادی ملکیت ختم کر دیتی ہے:

تیسرا ہیومن رائٹ حق ملکیت ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کے دیکھیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام زندگی ذاتی ملکیت کو ختم کر دیتا ہے اور کارپوریٹ [corporate] ملکیت کو رائج کرتا ہے۔ کارپوریشن human being کی وہ شکل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں قانوناً قائم کی جاتی ہے۔ اس شکل میں Human Being اپنے آپ کو بڑھوتری سرمایہ کے مقصد کے لیے کلیتاً وقف کر دیتا ہے۔ Copration کا مقصد وجود بڑھوتری سرمایہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، ہر Human Being کو حق ہے کہ وہ اپنی جان [بحیثیت ملازم Employee

اور اپنا مال بحیثیت حصص دار [shareholder] کارپوریشن کے سپرد کرے اور سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں اپنی ذات کو گم کر دے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کی معاشرتی بالادستی کو چیلنج کرے۔ غیر کارپوریٹ ملکیت اس حد تک برداشت کی جا سکتی ہے کہ وہ سرمایہ کی بڑھوتری میں رکاوٹ نہ ہو۔ کوئی ایسی معاشی تنظیم جو سرمایہ کی بڑھوتری کی بالادستی کو چیلنج کرے برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اسلامی بینک سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بنائے جا سکتے ہیں۔ ایک مکمل اسلامی نظام معیشت کے قیام کی اجازت کبھی نہیں دی جا سکتی۔

خلاصہ: سرمایہ دارانہ انفرادیت کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

☆ سرمایہ دارانہ نظام زندگی آدمی کو Human being بنا دیتا ہے۔ Human being انسانیت کی ضد ہے۔

☆ human being ایک شیطانی [demonic] وجود ہے۔ وہ خود ارادیت اور خود تخلیقیت کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے وجود کو شہوت، غضب، حرص اور حسد کے سپرد کر دیتا ہے۔

☆ نظام سرمایہ داری کی کلیدی اقدار آزادی مساوات اور ترقی ہیں۔

☆ ان اقدار کے فروغ کا ذریعہ سرمایہ کی بڑھوتری ہے۔

☆ سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں سرمایہ کی بڑھوتری اصل الاصول اور قدر مطلق کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کو ایک ایسی کسوٹی کے طور پر قبول کیا جاتا ہے جس پر تمام اشیاء اور اعمال کو پرکھ کر ان کی تقابلی قدر متعین کی جاتی ہے۔

زندگی ضمیر املاک کو سرمایہ کے سپرد کرنے کے تین اہم طریقے:

☆ انسان کو humen being بنانے کے لیے فرد کو تین حقوق او فرائض تفویض کیے گئے ہیں:

۱۔ حق زندگی [جان کو سرمایہ کے سپرد کرنا]

۲۔ حق ضمیر [ایمان اور عقائد کو سرمایہ کے سپرد کرنا]

۳۔ حق ملکیت [مال کو سرمایہ کے سپرد کرنا]

☆ جو لوگ ان حقوق و فرائض کو قبول نہیں کرتے ان کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں نہ زندہ رہنے کا حق ہے نہ اعتقاد اور اس کے اظہار کا نہ مال کے تصرف کا۔ صرف ایسے عقائد اعمال اور ترجیحات برداشت کیے جا سکتے ہیں جو بڑھوتری سرمایہ کی آفاقی بالادستی اور اس کے اصل الاصول ہونے کی حیثیت کو چیلنج نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریں۔

سرمایہ دارانہ نظام زندگی اور سرمایہ دارانہ انفرادیت کی جو تفصیل میں نے ابھی تک بیان کی وہ لبرل اور کنزرویٹیو مفکرین اور قائدین کی فکر سے ماخوذ ہے۔ اشتراکی اور قوم پرست مفکرین نے بھی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی ایک تشریح پیش کی ہے۔

اشتراکی قوم پرست سرمایہ دارانہ اقتدار کے حامی ہیں:

اشتراکی اور قوم پرست سرمایہ داری کے مفکر بھی تحریک تنویر کے وارث ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام Hegal, Marx اور Neitzshe کے ہیں۔ یہ تینوں بھی الوہیت آدم کے قائل ہیں اور انسان کو human بنانا ان کا مشن ہے۔ یہ بھی آزادی، مساوات اور ترقی کو اقدار کے طور پر قبول کرتے ہیں اور بڑھوتری سرمایہ کو ان مقاصد کے حصول کے ایک ناگزیر اور لازمی ذریعہ سمجھتے ہیں۔

الوہیت انسانیت کے طریقے:

قوم پرست اور اشتراکی سرمایہ داری کے فلاسفر ہیگل مارکس اور نطشے humanity کو بحیثیت نوع الوہیت کا مکلف سمجھتے ہیں۔ لبرل مفکرین کے برخلاف یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ Human being انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی وجود کا اظہار ہے۔ Human being اپنی الوہیت کا اظہار تاریخی عمل میں کشمکش کے ذریعہ کرتی ہے۔ قوم پرست مثلاً نطشے کہتا ہے کہ یہ کشمکش مختلف اقوام کے درمیان ہوتی ہے۔ اشتراکی سرمایہ داری کے وکیل مثلاً مارکس اس کشمکش کو طبقاتی سمجھتے ہیں۔ دونوں قسم کے مفکرین کی رائے ہے کہ اس تاریخی کشمکش میں جو قوم یا طبقہ [class] غالب آتا ہے وہی human being کا اصل نمائندہ [representative] ہوتا ہے اور وہی اپنے ارادہ کے نفاذ کے ذریعہ الوہیت human being کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ پوری human نسل کا فرض ہے کہ وہ اس غالب قوم یا طبقہ کی اطاعت کرے۔ یہی غالب قوم یا طبقہ خیر اور شر کی تعبیر اور تنفید کا حق دار ہے اور تمام human انفرادیتوں کو اسی غالب قومی یا طبقاتی انفرادیت میں ضم ہوجانا چاہیے۔ یہ غالب قومی یا طبقاتی انفرادیت۔ ان تمام خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جو لبرل مفکرین شخصی انفرادیت کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔ اس غالب قوم یا طبقہ کا مقصد وجود آزادی اور ترقی کا حصول ہوتا ہے۔ یہ غالب قوم یا طبقہ آزادی اور قوت کے اضافے کی تگ ودو میں انتہا درجہ کا حریص اور حاسد ہوتا ہے اور اپنی آزادی اور ترقی کے لیے سرمایہ کی بڑھوتری ہی کو اصل ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنی آزادی اور ترقی کے لیے لوٹ مار، قتل وغارت اور بدترین سفاکیت اور بہیمیت کو نہ صرف جائز بلکہ فرض عین گردانتا ہے کیونکہ اسی قتل و غارت، لوٹ مار اور دھوکہ اور فریب کے ذریعہ ہی اس کی

آزادی اور ترقی ممکن ہوتی ہے اور اس طبقہ اور قوم کا غلبہ ہی الوہیت ہیومن بینگ [human being] کا اظہار ہے حق صرف وہ ہے جو اس اظہار کو ممکن بنا سکے۔

اشتراکی استبداد کا انجام بدترین اخلاقیات کا عروج:

قوم پرست اور اشتراکی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا نظام اقتدار [state] لبرل نظام اقتدار سے مختلف ہوتا ہے [اس کی تفصیل بعد میں عرض کروں گا] اس نظام اقتدار میں غالب قوم یا طبقہ کی نمائندگی ایک رہبر [ہٹلر، اسٹالن] یا ایک پارٹی [نازی یا کمیونسٹ] کرتی ہے۔ اس فرد یا جماعت کا حق ہے کہ وہ خیر اور شر کی تعبیر و تشریح کرے جو اس کی آزادی اور ترقی کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہو اور اس غالب فرد یا جماعت کا فائدہ ہی پوری قوم اور طبقہ کا فائدہ تصور کیا جاتا ہے۔ دیگر افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادیت، غالب پارٹی یا رہنما کی انفرادیت میں ضم کر دیں اس عمل میں مہمیز دینے کے لیے چین میں ۱۹۶۶ء میں مشہور ثقافتی انقلاب [Cultural Revolution] برپا کیا گیا اور نازی جرمن اور سویت یونین کی ثقافتی، پالیسی سوپر مین [Superman]، نیو مین [New man]، سوویٹ مین [Souvait man] کو وجود میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا جب سرمایہ کی بڑھوتری مقصد وجود کے طور پر اجتماعی سطح پر قبول کیا جاتا ہے تو بیشتر افراد کی زندگی فاسد اور رذیل رجحانات سے ملوث ہوجاتی ہے۔ جس کا اظہار نظام اقتدار اور غالب قائد یا پارٹی کرتی ہے۔ لہٰذا قوم پرست یا اشتراکی انفرادیت کو عام آدمی ہیجانی ادوار کے علاوہ کبھی بھی قبول نہ کر سکا اور غالب قیادت کی پالیسیوں کے نتیجہ میں ایک آدمی کی زندگی میں ہوس، حرص، شہوت رانی، دنیا پرستی، خود غرضی اور سفاکیت نے فروغ پایا اور اس کو اشتراکی اور قوم پرست نظام اقتدار کے فروغ اور استحکام کے لیے ریاستی استبداد کے ذریعہ مسلسل مجبور کرنا پڑا۔ جیسے جیسے ریاستی استبدادی گرفت ڈھیلی پڑی عام آدمی نے اشتراکی نظام سے چھٹکارا حاصل کر کے بدترین اخلاقی رذائل کو اپنا لیا۔ لوٹ مار، جھوٹ، دھوکہ اور فریب جنسی بے راہ روی اور فحاشی کا جو سیلاب آج مشرقی یورپ، روس اور چین کے ساحلی شہروں میں آیا ہوا ہے اس کی مثال تو یورپ اور امریکہ کے غلیظ ترین معاشرہ میں بھی نہیں ملتی۔

اس سے ثابت ہوا کہ اشتراکی یا قوم پرست انفرادیت کوئی علیحدہ چیز نہیں سرمایہ دارانہ انفرادیت وہ انفرادیت ہے جو:

☆ الوہیت human being کی طالب ہے۔

☆ جس کے احساسات اور خواہشات پر حرص اور حسد شہوت اور غضب حاوی ہوجاتے ہیں۔

☆ اور جو اپنی عقل کو ان ہی رذائل کے اظہار کے لیے بذریعہ بڑھوتری سرمایہ استعمال کرتی ہے۔

یہ انفرادیت شخصی بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی [قومی طبقاتی] بھی دونوں صورتوں میں اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انفرادیت کو پہنچنے کے لیے سرمایہ دارانہ معاشرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں سرمایہ دارانہ معاشرت کی بنیادی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

سرمایہ دارانہ معاشرت:

معاشرہ نظامِ زندگی کے اس شعبہ کو کہتے ہیں جہاں افراد بہ رضا و رغبت اور بلا اکراہ و جبر دوسرے افراد سے اپنے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ معاشرتی تنظیم اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد یہ معاشرہ بنا اور چلا رہے ہیں ان کے میلانات و رجحانات اور خواہشات کیا ہیں اور وہ دوسرے لوگوں سے تعلقات استوار کر کے کن مقاصد کا حصول چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا سرمایہ دارانہ انفرادیت [خواہ شخصی خواہ اجتماعی] سرمایہ کی بڑھوتری کے ذریعہ آزادی اور ترقی [یعنی تسخیر کائنات] چاہتی ہے۔ وہ حرص اور حسد اور شہوت اور غضب سے مغلوب ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسرے کو اپنی خدائی میں شریک کرنے کو گوارا تو کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ دوسرا اسی جیسی خصوصیات کا حامل ہو] اور اصولاً مساوات کا قائل ہونے پر مجبور ہے۔ [اس مجبوری کی توجیہہ Hobbes نے سب سے واضح الفاظ میں بیان کی ہے اور سارتر Sartre کا یہ مشہور جملہ:

"Hell is other people" اس میں مجبوری کا اظہار ہے] لیکن عملاً وہ مسابقت [competition] اور نمائندگی کے ذریعے اس مساوات کی مستقل تحدید کرتا رہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ اور کنٹریکٹ:

سرمایہ دارانہ انفرادیتیں جس بنیاد پر غیر جبری [voluntary] روابط قائم ہوتے ہیں وہ غرض [interest] ہے۔ ہر فرد [شخصی یا اجتماعی] ان روابط کے ذریعے دوسرے افراد کو اپنی آزادی بڑھوتری سرمایہ کا ذریعہ بناتا ہے۔ روابط کے وہ نظام جو سرمایہ دارانہ انفرادیت میں بڑھوتری سرمایہ اور فروغِ آزادی اور ترقی کے لیے قائم کرتی ہیں اس نظام کو سرمایہ دارانہ معاشرت کہتے ہیں۔ ان روابط کو متشکل کرنے کے لیے جو قانونی ذرائع استوار کیے جاتے ہیں ان کو کانٹریکٹ [Contract] کہتے ہیں سب سے بنیادی معاہدہ وہ ہے جس کو روسو [Rousseau] نے معاہدہ عمرانی [Social Contract] کہا تھا۔ اس معاہدہ کے ذریعے ایک ایسی ریاست وجود میں آتی ہے جس کا مقصد وجود سرمایہ کی بڑھوتری اور فروغ آزادی ہوتا ہے۔ [یہی سرمایہ دارانہ ریاست یا Constitutional Republic ہے جس کی تفصیل میں انشاء اللہ اگلے حصے میں بیان کروں گا۔ اسی ریاست کی پشت پناہی اور قانونی اور عسکری تحفظ کے بل بوتے پر بارکیٹ [Market] وجود میں آتے ہیں۔

مارکیٹ سرمایہ داری کا بنیادی ادارہ ہے:

مارکیٹ سرمایہ دارانہ معاشرت کا بنیادی ادارہ ہے۔ مارکیٹ بازار نہیں ہے کیونکہ مارکیٹ ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ ملکیت [Corporate property] کو وجود میں لاتا ہے اور اس کی سماجی بالادستی کو مستحکم کرتا ہے۔ کارپوریشن وہ شخصیتِ قانونی ہے جس کا واحد مقصد وجود سرمائے کی بڑھوتری [Maximisation of Shareholder's value] ہے۔ کارپوریشن کو ایک ایسی انتظامیہ چلاتی اور قابو کرتی ہے جو سرمایہ کی بڑھوتری میں اضافہ کرنے کی مہارت رکھتی ہے۔ انتظامیہ میں شامل افراد کارپوریشن کے مالک نہیں ہوتے۔ کارپوریشن کی [فرضی] ملکیت لاتعداد حصص کنندگان کے پاس ہوتی ہے جو عملاً کمپنی کے معاملات میں دخل اندازی اور اس کی کاروباری حکمت عملی کی ترویج میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان کا مطالبہ کارپوریشن کی انتظامیہ سے صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے۔ انتظامیہ اس بات پر مجبور ہے کہ وہ صرف ایسی حکمتِ عملی اپنائے جس کے بروئے کار لانے سے سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار تیز سے تیز ہو اور Value Share holder کی زیادہ سے زیادہ [Maximize] ہو۔ اگر مینجمنٹ ایسی حکمتِ عملی اختیار نہیں کرتی ہے تو کارپوریشن دیوالیہ ہوجائے گی یا کسی دوسری مینجمنٹ کا اس پر قبضہ جما لینے بذریعہ [takeover-merger] کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ حقیقتاً نہ شیئر ہولڈر کارپوریشن کا مالک ہوتا ہے نہ مینجمنٹ اس کا مالک ہوتا ہے۔ کارپوریشن کا اصل مالک صرف سرمایہ۔ یعنی حرص اور حسد ہے۔ سرمایہ مینجمنٹ اور حصص کنندگان کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ صرف ایسی حکمت عملی اپنائیں جس کے نتیجہ میں حرص و حسد پورے معاشرہ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیں۔

مارکیٹ بازار کھا جاتا ہے کارپوریٹ ملکیت ذاتی ملکیت ختم کر دیتی ہے:

مارکیٹ کے ذریعہ لوگوں کی دولت کھینچ کھینچ کر کارپوریشنوں کی مینجمنٹ کے ہاتھوں میں مرتکز ہوجاتی ہے اور وہ اس دولت کو سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو مہمیز دینے کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے کارپوریشنوں کی بالادستی اور انتظامی فوقیت مستحکم ہوتی ہے ذاتی کاروبار اور بازار کا دائرہ کار محدود سے محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ مارکیٹ بازار کو کھا جاتا ہے اور کارپوریٹ ملکیت ذاتی ملکیت کو برباد کر دیتی ہے۔ ہر شخص سرمائے کا فرد بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اجرتوں کا نظام معاشرتی تسلط حاصل کر لیتا ہے۔ ٩٩ فیصد افراد کی آمدنی کا ذریعہ اجرت بن جاتی ہے۔ آدمی اپنی دولت خود استعمال کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ جیسے جیسے کارپوریشنیں معاشی عمل پر حاوی ہوتی ہیں اور جیسے جیسے مارکیٹ کا دائرہ کار وسیع ہوتا جاتا ہے آدمی اپنی دولت کو خود استعمال کر کے روزی کمانے کے قابل نہیں رہتا۔ ہر شخص بینک میں اکاؤنٹ کھولتا ہے، یا حصص اور بانڈ خریدتا ہے، یوں اس کی دولت اس کے تصرف سے آزاد ہو کر کارپوریشن کی مینجمنٹ کے پاس پہنچ جاتی ہے اور کارپوریشن کا مینجمنٹ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دولت کو بڑھوتری سرمایہ کو مہمیز دینے کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہے۔

زر کا بازار اور سرمایہ کی مارکیٹ: دو اہم ادارے

سرمایہ کی بڑھوتری اور ارتکاز کو فروغ دینے کے لیے دو منفرد بازار ۱۹ ویں صدی میں قائم کیے گئے۔ ایک زر کی مارکیٹ [money markt] اور دوسرا سرمایہ کا مارکیٹ [Capital Market]۔ ۲۰ ویں صدی سے قبل پوری اسلامی تاریخ میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے حضرت سلطان المعظم خلیفہ عبدالحمید ثانی کے انتقال تک] اس گھناؤنے کاروبار کا کہیں وجود نہ تھا۔ زر کے مارکیٹ اور سرمایہ کے مارکیٹ کے دو بنیادی وظائف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بچت کرنے والے [Saver] کی دولت کو کاروبار میں لگانے والے [invester] سے جدا کر دے۔ بچت تو عوام کریں لیکن اس بچائی ہوئی دولت کا استعمال صرف وہ مینجمنٹ کرے جو اس دولت کو صرف اور صرف سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو مہمیز دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور اس پر مجبور بھی ہے۔ یوں سرمایہ کا لامحدود ارتکاز ممکن ہوتا ہے۔ چونکہ سرمایہ محض حرص اور حسد ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی منجمد [concerete] حیثیت نہیں لہٰذا اس کی بڑھوتری [accumalation] کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کسی منجمد شے [مثلاً سیب یا زمین یا مشینری] اور کسی ایسی خدمت [مثلاً دنداں سازی، مکانوں کو خرید و فروخت کا کاروبار یا فوجی خدمات] جن کے نتیجہ میں کوئی جسمانی ضرورت پوری ہو لامتناہی بڑھوتری [Accumalation for the sake of accumulation] کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ مثلاً دندان سازی کے کاروبار کی حد دنیا بھر میں دانتوں کی تعداد متعین کرتی ہے۔ سیبوں کو لامتناہی مقدار میں جمع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور سڑ جائیں گے۔ فوجی خدمات کو اس حد سے زیادہ جمع کرنا بے معنی ہے جب وہ تمام عالم کو فتح کرنے کے لیے کافی ہو جائیں۔

سرمایہ دارانہ زر کیا ہے؟

لہٰذا سرمایہ، یعنی حرص اور حسد کی لامتناہی بڑھوتری [accumalation for the sake of accumulation] کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جس کی

☆ اپنی کوئی منجمد ماہیت نہ ہو

☆ جس کے ارتکاز اور اجتماع کی کوئی فطری حد نہ ہو۔

یہ شے سرمایہ دارانہ زر ہے سرمایہ دارانہ زر کے پیچھے کوئی منجمد شے مثلاً سونا، چاندی، دھات وغیرہ نہیں۔ سرمایہ دارانہ ریاست اور سرمایہ دارانہ نظام بینکاری جتنا چاہے اور جب چاہے سرمایہ دارانہ زر بنا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ زر کے اعتبار کی اجراء ضمانت صرف اور صرف سرمایہ دارانہ ریاست کی حاکمیت

[Soverignity] فراہم کرتی ہے۔ سونا یا چاندی کے ڈھیر یہ ضمانت فراہم نہیں کرتے۔ سرمایہ دارانہ زر کے اجراء اور گردش کا مقصد صرف اور صرف سرمایہ کی بڑھوتری ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ زر کی مقدار صرف سرمایہ کی بڑھوتری کے زمانی اور مکانی امکانات کرتے ہیں اور چونکہ سرمایہ یعنی حرص و حسد کی بڑھوتری کے کوئی اصولی حدود نہیں لہٰذا سرمایہ دارانہ زر بھی لامحدود بڑھوتری کا معمول [agent] ہے۔ دوسری جنگ عظیم [بالخصوص Bretton woods کے مالیاتی نظام کے انہدام] کے بعد سرمایہ دارانہ زر کا تعلق سونے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا گیا۔ ۱۹۷۹ء کے بعد سے سرمایہ دارانہ زر کا تعلق کاغذ سے بھی بتدریج منقطع کیا جا رہا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے حکام چاہتے ہیں کہ وہ وقت جلد آئے جب سرمایہ دارانہ زر صرف اور صرف کمپیوٹر کی یادداشت مقدارِ محض [Pure Quantity] کی اعدادی [Numerical] شکل اختیار کر لے۔

ہر شے اور عمل کی قدر زر کا بازار متعین کرتا ہے:

سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری سرمایہ دارانہ بازار زر کا بازار اور سرمایہ کا بازار ممکن بناتے ہیں۔ ان بازاروں کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہے کہ یہ ہر شے اور عمل کی قدر متعین کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی قدرِ مطلق [absolute value] یہ ہے کہ وہ human being کے کائناتی اختیار کو لامحدود بنا دے۔ [انسان کو خدا بنا دے] یہ قدرِ مطلق سرمایہ دارانہ معاشرہ میں سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری، حرص اور حسد کے لامحدود فروغ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ کی ضرورت ہے کہ وہ ہر شے اور ہر عمل کی تقابلی قدر [Relative value] اسی پیمانہ کی بنیاد پر متعین کرے، قدر کے تعین کا یہ کام سرمایہ دارانہ بازار انجام دیتے ہیں۔ سرمایہ کے بازار [capital market] میں حصص اور تمسکات [bonds] کی خرید و فروخت کا کاروبار ہر لحہ جاری و ساری رہتا ہے۔ ہر شیئر اور بانڈ کی قیمت اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کتنا منافع دیتا ہے۔ تصور کیجیے کہ حصص کے بازار میں دو کمپنیاں ہیں کمپنی الف جائے نماز بناتی ہے اور کمپنی ب فحش فلمیں بناتی ہے۔ جب بازار میں ان کمپنیوں کے حصص کی قیمتیں متعین کی جائیں گی تو اس چیز کو نظر انداز کیا جائے گا کہ کمپنی الف اور کمپنی ب کا کاروبار کیا ہے؟ سوال صرف یہ اٹھایا جائے گا کہ کونسی کمپنی زیادہ منافع کمانے کے قابل ہے۔۔ کونسی کمپنی زیادہ ڈیویڈنڈ [Divident] دے گی۔ اگر جائے نماز بنانے کا کاروبار زیادہ منافع بخش ہونے کی توقع ہے تو اس کے حصص کی قیمت فحش فلمیں بنانے والی کمپنی کے حصص کی قیمت کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔ اگر فحش فلمیں بنانے کا کاروبار زیادہ منافع بخش ہے تو اس کمپنی کے حصص کی قیمت جائے نماز بنانے والی کمپنی کے حصص کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔ جس کمپنی کے حصص کی قیمت زیادہ ہوگی پیسہ اس ہی کی طرف کھنچ کے آئے گا۔ اگر جائے نماز بنانے والی کمپنی کے حصص کی قیمت گرے گی تو اس کی مینجمنٹ اس بات پر مجبور ہوگی کہ وہ جائے نماز بنانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوڑ دے ورنہ کمپنی دیوالیہ ہوجائے گی۔فحش فلمیں بنانے والی کمپنی اس کو خرید لے گی اور فحش تصاویر کے ذریعے اس کاروبار کو فروغ دینے کے مزید ممکنہ طریقے تلاش کرے گی۔طلب ورسد کے کافرانہ قانون کے تحت یہ طرزِ عمل فطری قرار دیا جاتا ہے۔

شیئر بانڈ خریدنے والا اس کے مالک اور اس کے استعمال سے لاعلم رہتا ہے:

جب ایک عام خریدار شیئر یا بانڈ خریدتا ہے تو اس کو یہ بالکل علم نہیں ہوسکتا ہے کہ اس پیسے سے کیا کام کیا جائے گا۔اول تو ۹۵ فیصد حصص اور بانڈ کی ملکیت ہی نامعلوم ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس شخص کی ملکیت والے حصص یا بانڈ خرید رہا ہے۔دوسرے جو حصص یا بانڈ تازہ اجراء [New Issue] والے ہوتے ہیں ان کو خریدنے والے عملاً اس بات کو متعین کرنے سے قاصر ہیں کہ اس پیسہ سے حصص یا بانڈ جاری کرنے والی کمپنی یا حکومت کیا کرے گی۔یہی بات واضح کرتی ہے کہ سرمایہ دارانہ ملکیت ذاتی ملکیت نہیں۔اس نظام میں ذاتی ملکیت محض ایک قانونی دھوکہ [legal Fiction] ہے۔ایک عام فرد اس بات پر مجبور ہے کہ اپنی تمام بچتیں بینکوں یا کارپوریشنوں کے ذریعہ سرمایہ کے حوالے کردے اور صرف اس بات سے غرض رکھے کہ بچت کی اس سپردگی کے نتیجہ میں اس کو کتنا سود مل رہا ہے۔کتنا ڈیویڈنٹ مل رہا ہے کتنا capital gain ہو رہا ہے۔سرمایہ منجمد نہیں۔وہ ہردم اپنی بڑھوتری کے لیے اشیا اور خدمتوں کے درمیان گردش کرتا ہے۔سرمایہ حرص اور حسد ہے۔حرص اور حسد انسانی زندگی میں پوری طرح سرائیت کرنے کی متقاضی ہے جب تک معاشرے کا ہر فرد تاجر، مزدور، منیجر، حصص کنندگان، بینک کا ڈیپازیٹر اپنے آپ کو سرمایہ کے حوالے نہ کردے شیطنت یعنی humanism کو غلبہ عمومی حاصل نہیں ہوسکتا۔سرمایہ دارانہ معاشرت اسی ہی شیطنت humanism کے عام غلبہ کی غماز ہے۔

سول سوسائٹی کا مطلب مذہبی معاشرہ کا خاتمہ ہے:

سرمایہ دارانہ معاشرت مارکیٹ پر مسلط ہوجانے کا مسلسل عمل ہے۔سرمایہ دارانہ معاشرہ میں مارکیٹ زندگی کے ہر شعبہ کو مسخر کرلیتی ہے۔سرمایہ دارانہ معاشرت کا بنیادی غیر معاشی تعلق سرمایہ دارانہ معاشرت کا غلبہ اور استحکام اور زنا اور آزاد شہوت رانی کا عام ہوجانا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔سرمایہ دارانہ معاشرت غلاظت، نجاست اور پلیدگی کی نچلی ترین سطح ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک human یعنی شیطانی معاشرہ ہوتا ہے۔اس معاشرہ کو civil society کہتے ہیں۔یہ سول سوسائٹی لازماً مذہبی سوسائٹی کے انہدام کے ذریعہ قائم ہوتی ہے۔

سول سوسائٹی میں مذہبی اقدار لغو ہوتی ہیں:

جان اسٹیورٹ مل [John Steart Mill] نے حق زنا کو ایک human right کے طور پر پیش کیا ہے۔سول سوسائٹی تمام مذہبی اقدار و اعمال کو لغو اور لایعنی ثابت کرتی ہے۔سول سوسائٹی میں جو ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔وہ عقلیت ہے۔اس ذہنیت کو rationality کہتے ہیں اور اس کا اظہار سائنس اور فلسفہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔rationality ہر فعل کو خود ارادیت، خود تخلیقیت اور خود غرضیت کے پیمانے پر تول کر اس کی تقابلی قدر متعین کرتی ہے۔اس پیمانے پر تولا جائے تو للّٰہیت محبت، طہارت، عفت، تقویٰ، غیرت، ایثار، اور شہادت بالکل بے وقعت اور بے قدر نظر آتی ہیں۔سول سوسائٹی میں ان اوصاف کے پنپنے کی کوئی گنجائش نہیں سول سوسائٹی ان اوصاف کے فروغ پانے کو مشکل سے مشکل بنادیتی ہے۔اس کا نظامِ تعلیم تسخیر کائنات اور تمام فطری قوتوں کو human کے ارادہ کے مطیع بنانے کو مقصد کے طور پر قبول کرنے کی ایمانیات کو مستحکم کرتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظامِ تعلیم انسان کو زیادہ سے زیادہ خود غرض، سفاک لذت پرست، ہوسناک اور خدا کا باغی بناتا ہے۔سرمایہ دارانہ تصورِ عدل خود غرضیت اور خود ارادیت [liberty] کے مساوی [equal] فروغ کو تصور کیا جاتا ہے۔ایک ایسا معاشرہ جہاں خود غرضیت اور لذت پرستی کا فروغ مقصد وجود ہو اور جس کا پیمانہ عدل ہی خود ارادیت کے مساوی مواقع فراہم کرتا ہو وہاں شیطان ہر فرد کے دل اور دماغ پر قابض نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

انفرادیت کا اظہار صرف صارف کی حیثیت سے ہوتا ہے:

سول سوسائٹی کا ایک عام باشندہ اپنی انفرادیت کا اظہار عمل تصرف [Consumption] کے ذریعہ کرتا ہے۔human اختیار کے لامحدود ہونے کا اظہار عملاً اشیائے صرف کے درمیان لامحدود اختیار کے ذریعہ ہی کیا جاتا ہے۔مثلاً امریکہ میں آپ ۶ لاکھ قسم کے صابنوں میں سے کوئی بھی خرید سکتے۔کئی ہزار ٹی وی چینلز میں سے کوئی بھی دیکھ سکتے۔سینکڑوں طریقوں سے جنسی آسودگی حاصل کرسکتے ہیں۔لیکن کوئی بھی صابن خریدیں، کوئی چینل دیکھیں کسی بھی طریقہ سے جنسی آسودگی حاصل کریں مقصد آپ کا حصول لذت اور اپنے ارادہ کی تکمیل ہے۔حصول لذت اور ارادہ کی تکمیل کے سوا سرمایہ دارانہ معاشرہ اظہار ذات کے ہر دوسرے طریقہ کو ناممکن بنادیتا ہے کیونکہ حصول لذت اور تکمیل ارادے کے ذریعے ہی سرمایہ کی بڑھوتری کا نظامِ بالادستی قائم کرتا ہے۔حرص اور ہوس، لذت پرستی اور خود پرستی ہی سے فروغ پاتی ہیں۔ان کو فروغ دینے کے دوسرے کوئی ذرائع موجود نہیں۔

جہاں سرمایہ داری ہے وہاں گناہگاروں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے:

اس سے ثابت ہوا کہ سرمایہ دارانہ عقلیت [epistimology] اور سرمایہ دارانہ عمل [Practice] معاشی حدود تک محدود نہیں رہ سکتے۔دنیا میں آج کوئی ایسا ملک موجود نہیں جہاں سرمایہ دارانہ معیشت ترقی کررہی ہو۔لیکن خاندان تباہ نہ ہورہے ہوں۔زنا عام نہ ہو رہا ہو۔ادب اور ثقافت، دھوکہ، غلیظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترین اور فحش ترین رجحانات کی عکاسی نہ کر رہا ہو۔ استبداد اور جعل سازی اور ظلم عام نہ ہو۔ مارکیٹ contract کے تمام اعمال بھی مساوی آزادی [equal freedom] کا اظہار ہیں اور سول سوسائٹی اسی غلاظت، سفاکیت اور نجاست کا مرکب ہے۔

سرمایہ داری کا فطری نتیجہ زناکاری ہے جو آبادی ختم کر رہی ہے:

سرمایہ دارانہ معاشرت انسانیت کے رذیل ترین رجحانات کا اظہار سرمایہ دارانہ معاشرتیں اجتماعی خودکشی کر رہی ہیں۔ زنا کا معاشرتی غلبہ لامحالہ انسانی نسل کی کی تحدید پر منتج ہوتا ہے۔ جن ممالک میں سرمایہ دارانہ معاشرت نے فروغ پایا ان کی آبادی ۱۹۰۰ میں دنیا کی آبادی کا ۱۴ فی صد تھی۔ ۲۰۰۰ میں یہ شرح گر کر ۱۳ فی صد رہ گئی اور اقوام متحدہ کے اندازوں کے مطابق ۲۰۵۰ء میں یہ شرح ۴ فی صد رہ جائے گی۔ انہی اندازوں کے مطابق اگر موجودہ معاشرتی رجحانات برقرار رہے تو چند صدیوں میں جرمنی، جاپان، فرانس اور اٹلی کی قومیں مکمل طور پر مٹ جائے گی۔ جن ایشیائی ممالک نے سرمایہ دارانہ معاشرت کو اپنایا ہے ۔ بالخصوص چین، ہندوستان، جنوبی کوریا اور تائیوان۔ وہاں بھی قومی آبادی گھٹنا شروع ہو گئی ہے۔

جبر و ترغیب: سرمایہ داروں کے دو ہتھکنڈے

مرد و زن کے فطری دائرہ کار اور نظام تعلقات کو تباہ کر کے انسان کو شیطان human بنانے کا جو عمل سرمایہ دارانہ نظام زندگی نے رائج کیا ہے۔ اس کو جاری رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کے لیے ترغیب کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور جبر کی۔ جبر اور ترغیب کو منظم کرنے کے لیے جو ادارے بنائے گئے ہیں ان کے مجموعے کو سرمایہ دارانہ ریاست کہتے ہیں۔ اسی ریاستی نظام نے سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کو جنم دیا اور آج بھی سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کے استحکام اور پیدائش کے لیے سرمایہ دارانہ ریاست پر اس معاشرت کا انحصار ناگزیر ہے اب میں سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی اہمیت خصوصیات بیان کروں گا۔

سرمایہ دارانہ ریاست

ریاست اس نظام اقتدار کو کہتے ہیں جس کو معاشرتی مقبولیت یا برداشت حاصل ہو [اس کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں] سرمایہ دارانہ ریاست اس نظام اقتدار کو کہتے ہیں جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوں۔

☆ اس کا مقصد وجود سرمایہ کی بڑھوتری ہو۔

☆ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ سرمایہ دارانہ شخصیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت کو قائم اور مستحکم کرتی ہو۔

☆ حقوق اور فرائض کے اس نظام کو نافذ العمل بناتی ہو جس کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ شخصیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت فروغ پائے۔

سرمایہ دارانہ مفکر مذہب کا اخراج چاہتے تھے:

سرمایہ دارانہ ریاست کی چند مبہم تصویریں میکیاولی (Machiavelli) کی تحریروں میں ملتی ہے لیکن اس کی وضاحت سترھویں اور اٹھارویں صدی کے تنویری فکر سے متاثر مفکرین بالخصوص لاک (Locke) روسو (Roussoeau) مونٹیکو (Monteque) اور جیفرسن (Jefferson) نے پیش کیں۔ ان تمام مفکرین کا نکتہ اتفاق یہ تھا کہ مذہب کو سیاسی عمل سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ Locke اس مذہبی ریاست کا شدید مخالف تھا جو (Cromwell) نے ۱۷ ویں صدی کے وسط میں انگلستان میں قائم کی، روسو اور مونٹیسکیو کیتھولک چرچ کے کھلے دشمن تھے، جیفرسن امریکہ میں ایک سیکولر سرمایہ دارانہ وفاقی [federal] نظام اقتدار قائم کرنے کا خواہاں تھا یہ سب ریپبلیکن [republican] تھے اور اس لحاظ سے ان کی فکر کا افلاطون کی سیاسی فکر سے خاص تعلق تھا۔ افلاطون نے بھی سیاسی فلسفہ پر جو کتاب مرتب کی اس کا نام Republic رکھا اور اس کی نگاہ میں ریپبلیکن نظام اس سیاسی تنظیم کو کہا جا سکتا ہے جہاں خیر اور شر کے پیمانے اور ان کو نافذ کرنے والا نظام اقتدار انسانی فکر نے جرح اور تعدیل کے ذریعے مروج کیا ہو۔ ارسطو سمجھتا تھا کہ بحث اور جرح اور تعدیل کے ذریعے زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ دریافت کیا جا سکتا ہے اور وہ نظام اقتدار قائم کیا جا سکتا ہے جو تمام انسانیت کے مفاد میں ہو اور جو سب کو عدل مہیا کرنے کے قابل ہو۔

مرضی رب انسان کے ارادہ عمومی کا نام ہے:

اٹھارویں صدی کے تنویری سیاسی فلسفہ میں بھی بنیادی سوال یہی ہے کہ وہ نظام اقتدار کونسا ہے جو سب کے مفاد میں ہو؟ عیسائیت انسان کا مفاد رضائے الٰہی کے حصول میں دیکھتی تھی اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تحریک تنویر کے مفکرین اس کو قطعاً اور کلیتاً رد کرتے تھے۔ human being فطرتاً آزاد ہے۔ روسو نے کہا "Man is born free" اور سیاسی عمل کا مقصد ان زنجیروں [chains] کو توڑ دینا ہے جن میں کیتھولک چرچ نے اس کو جکڑ رکھا ہے۔ لاک [Lock] نے کہا کہ بائبل کسی واضح سیاسی تعلیمات کی نشاندہی نہیں کرتی لہٰذا مرضی رب human beings کے ارادہ عمومی [general will] کے ہم معنی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سٹیزن خیر وشر کے پیمانے خود بنا سکتا ہے:

تنویری سیاسیات [اس کو آج Political Science کہا جاتا ہے اور political science کی اولین باضابطہ تشریح امریکہ کے دستور سازوں کی تصنیف Federalist Papers میں ملتی ہے] کا کلیدی تصور ارادہ عمومی [general will] ہے۔ روسو نے کہا کہ اس جنرل وِل کے اظہار کا ذریعہ وہ معاہدہ عمرانی [social contract] ہے جس کے ذریعہ human being ایسی حکومت بناتے ہیں جو آزادی [liberty] کی منتہا بڑھوتری [maximisation] کو اپنے مقصد وجود کے طور پر قبول کرتی ہے۔ اس حکومت کا اساسی عقیدہ Liberty کی maximisation ہے اور اس عقیدہ کا اظہار ان human rights کو مقدس [sacrosanct] اور غیر متقبول مان کر کیا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ انفرادیت معاشرے اور نظامِ اقتدار کو قائم کرنے اور فروغ دینے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ human right ہر سرمایہ دارانہ ریاست کے دستور کا مقدمہ ہوتے ہیں اور یہ دستور صحیفہ مقدس [انجیل، توریت، قرآن، ویدا] کا عملی بدل ہے۔ دستور humanity کی لا محدود اور دائمی حاکمیت [sovergnity] کا اعلان کرتا ہے۔ human being کو سٹیزن بناتا ہے۔ اور سٹیزن وہ ہے جو اس بات پر ایمان لائے کہ وہ خیر وشر کی جو بھی تعبیر کرنا چاہے کرنے کا حق رکھتا ہے۔ سوائے اس تعبیر کے کہ خیر وشر کی کسی ایسی تعبیر کو قبول کیا جائے جو بجائے خود سٹیزن کے اس حق ہی کی نفی کرتی ہے۔

انسان کو Human بنانا کیوں ضروری ہے؟

یونان اور مغرب میں بنیادی فرق:

قدیم یونانی تصورِ جمہوریت اور تنویری تصور جمہوریت [اس کو لاک Representative government کہتا ہے] میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یونانی سیاسی مفکرین فلسفہ human rights سے آشنا نہ تھے Athens کے Citizens کا یہ حق تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی اور اپنے ماتحتوں کی آزادی سلب کریں اور ان کی ریپبلک آزادی کی لامحدود بڑھوتری [maximisation of liberty] کو اپنا مقصدِ وجود تسلیم نہیں کرتی تھی۔ انہی معنوں میں ایتھنز کی ریپبلک سرمایہ دارانہ ریپبلک نہ تھی اس کے برعکس ۱۸ ویں صدی میں قائم ہونے والی امریکی اور فرانسیسی ریپبلکوں نے اپنے دساتیر کے ذریعہ سرمایہ داری کو اپنے مقصدِ وجود کے طور پر قبول کیا۔ انہی معنوں میں امریکی اور یورپی ریاستیں سرمایہ دارانہ ریپبلک ہیں دستوری ریاستوں میں کسی سٹیزن کو یہ حق نہیں کہ وہ آزادی کی لامتناہی بڑھوتری [maximisation of liberty] کے سوا کسی اور مقصد کو ریاست کے مقصد وجود کے طور پر نافذ کرنے کی کوشش کرے اس بات کو واضح کرنے کے لیے روسو نے ارادہ اجتماعی [will of all] کو ارادہ عمومی [general will] سے ممیز کیا ہے۔ ارادہ اجتماعی اکثریتی رائے ہے اور وہ بدلتی رہتی

ہے۔ ارادہ عمومی [general will] غیر متبدل ہے وہ صرف اور صرف آزادی کی لامحدود بڑھوتری کا دوسرا نام ہے۔ ارداہ اجتماعی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزادی کی لامتناہی بڑھوتری کے مختلف طریقہ پسند کرے لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ وہ آزادی کی لامحدود بڑھوتری کے سوا کسی اور مقصد کو نظام اقتدار کے مقصد وجود کے طور پر اپنائے۔ روسو اور لاک سے لیکر دورِ حاضر کے تنویری سیاسی فلاسفہ [مثلاً Rawls، Habermas] اسی بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اگر ارادہ اجتماعی ارادہ عمومی [آزادی کی لامحدود بڑھوتری] کی نفی کرے تو دستوری ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسے ارادہ اجتماعی کو فسخ اور ساقط کرے تنویری مفکرین ہمیشہ ارادہ اجتماعی کے غیر سرمایہ دارانہ اظہار سے خائف رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ریاستوں نے جن معاشروں میں نشو ونما حاصل کی ہے ان میں بیشتر میں کم از کم بیسویں صدی کی ابتدا تک انسانوں کی اکثریت اور human being کی ایک قلیل اقلیت تھی جو معاشرتی وسائل پر قابض تھی انسانوں کو human بنائے بغیر ارادہ اجتماعی اور ارادۂ عمومی میں تطبیق پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ رائے دہندگان کے دائرہ کو اسی رفتار سے وسعت دی جا سکتی تھی جس رفتار سے انسان human بن رہے تھے۔ لاک اور جیفرسن نے اس عمل کو تیز کرنے کے لیے دو حکمت عملیاں مروج کیں۔

Human Being کا وجود سرمایہ داری میں کیوں ضروری ہے؟

لاک نے کہا کہ سرمایہ دارانہ ریاست کو نمائندہ حکومت [Representative government] ہونا چاہیے۔ ایتھنز میں ہر سٹیزن ریاستی فیصلہ میں شامل ہونے کا مجاز تھا۔ لاک نے کہا کہ یہ اصول قابل عمل نہیں۔ سٹیزن کو اپنا نمایندہ منتخب کرنے کا حق ہے اور حکومتی فیصلوں کا حق صرف نمائندگان کو ہے۔ چونکہ سرمایہ دار تنظیم میں معاشرہ اور معیشت کے ذریعہ وسائل human being کے پاس جمع ہوتے ہیں لہذا ان کا نمایندہ منتخب ہونے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایوان نمایندگان میں بہت کم انسان پہنچ پاتے ہیں اور عموماً معاشرہ میں اکثریت میں ہونے کے باوجود انسانوں کی نمایندگی سرمایہ دارانہ مقننہ اداروں میں human being ہی کرتے ہیں۔

جیفرسن [Jefferson] نے کہا کہ یہ پیش بندی کافی نہیں سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کو انسانیت سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نظامِ اقتدار کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مقننہ [Legslitive] انتظامیہ [executive] اور عدلیہ [judicrary]۔ نمایندگی کو صرف مقننہ کے ایوانِ زیریں تک محدود رکھا جائے۔ صرف وہی شخص عدلیہ اور انتظامیہ کا کارپرداز بن سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ علمیت کو پورے طور پر اپنی انفرادیت میں سمو چکا ہو۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے ہی human کارپرداز مقننہ کے فیصلوں کی عملی تشریح اور نفاذ کے ذمہ دار ہوں۔ weber نے بھی سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار انتظامیہ بالخصوص beaurocracy کی بالادستی کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری سمجھا ہے۔

سوشل ڈیموکریسی انسان کو Human بنانے کی تحریک:

انیسویں صدی کے وسط سے یورپ اور امریکہ میں انسانوں کو human بنانے کے لیے عوامی تحریکیں برپا ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم تحریک وہ ہے جس کو ہم سوشل ڈیموکریٹ [social democrat] تحریک کہتے ہیں۔ یہ تحریک سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کو حقوق دلانے کی تحریک تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حقوق کے طلب گار کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے human بنے۔ انسانوں کا تو کوئی حق سرمایہ دارانہ نظام قبول نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ لاک اور جیفرسن کروڑوں سرخ ہندیوں [Red Indians] کے قتل عام کے پرزور حامی تھے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے عوام کی بڑی اکثریت دورِ حاضر میں لاکھوں افغانیوں اور عراقیوں کے قتلِ عام کو ضروری سمجھتی ہے کیوں کہ اس مستقل قتل عام کے بغیر وہاں دستوری سرمایہ دارانہ ریاست قائم نہیں کی جاسکتی۔

سوشل ڈیموکریٹک تحریک کے فلاسفہ [مثلاً Mill، Weiser، TH. Green وغیرہ] نے کہا کہ مزدور human بننا چاہتے ہیں۔ ان کو سرمایہ دارانہ ریاستی نظام میں ضم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ human beings کے تصور میں توسیع کر کے مزدوروں کے اجتماعی حقوق [collective rights] کو تسلیم کیا جائے۔ ہر مزدور کا حق کہ اس کی آمدنی [basic income] اتنی ہو کہ وہ human rights سے مستفید ہوسکے۔ سرمایہ دارانہ ملکیت میں شمولیت حاصل کرسکے۔ سرمایہ دارانہ تعلیم پاسکے۔ سرمایہ دارانہ سیاسی اور سماجی شعور حاصل کرسکے۔ سرمایہ دارانہ زندگی گزار سکے۔ مزدوروں کی یونینیں مزدوروں کو human بنانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئیں اور چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کسی نہ کسی معنوں میں سرمایہ کا غلام اور مزدور ہوتا ہے لہٰذا یونینوں نے سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو مناسب human being ایسے افراد جو اجتماعی طور پر ارادہ عمومی یعنی آزادی کی لامتناہی بڑھوتری کو ریاست کے واحد مقصدِ وجود کے طور پر قبول کریں] فراہم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

کمیونسٹ تحریک نے انسان کو شیطان بنادیا؟

دوسری تحریک جس نے عام انسانوں کو human [شیطان] بنایا وہ کمیونسٹ [communist] تحریک تھی، اس تحریک کا بنیادی دعویٰ تھا کہ human صرف مزدور ہی ہیں۔ اور مزدوروں کا طبقاتی شعور ارادہ عمومی [general will] کی تشریح اور اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ معاشرہ میں مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ [Dictatorship of the Prolitariat] قائم ہونی چاہیے۔ لیکن یہ ڈکٹیٹرشپ Peoples Republic ہوگی جس میں مزدور طبقہ اپنی نمائندہ حکومت قائم کرلے گا اور مزدوروں کے نمائندے

تمام فیصلے ارادہ عمومی کے اظہار کے لیے کریں گے۔ پیپلز ریپبلک [People's Re Public] سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کی وہ ترتیب ہے جہاں مزدوروں کے طبقاتی شعور کو [class conciousness] ارادہ عمومی کے اظہار کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور جہاں مزدوروں کی نمائندہ جماعت یعنی کمیونسٹ پارٹی اس اظہار کا اجارہ دارانہ حق رکھتی ہے۔ اس نظامِ اقتدار اور لبرل سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار میں مماثلت یہ ہے کہ دونوں ارادہ عمومی [آزادی کی لامتناہی بڑھوتری کو ریاست کا واحد مقصد وجود تصور کرتے ہیں۔] لیکن دونوں میں اس اظہار کے جائز [legitimate] نمائندگان مختلف ہیں۔

قوم پرستی کی خطرناک ترین تحریک:

انسانوں کو human بنانے کی ایک اور تحریک جو بہت با اثر ثابت ہوئی ہے وہ قوم پرست [nationalist] تحریک ہے۔ اس تحریک کا دعویٰ ہے کہ ارادہ عمومی آزادی کی غیر محدود بڑھوتری کا صحیح اظہار صرف ایک برتر قومیت ہی کرسکتی ہے۔ human صرف اسی برتر قوم کے افراد ہی ہیں اور صرف اس برتر قوم کے قومی مفاد کو فروغ دے کر ہی آزادی سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ایک ایسا نظام اقتدار مروج کرنا چاہیے جس میں قومی مفاد کے لامتناہی فروغ کو ریاست کے مقصد وجود کے طور پر قبول کیا جائے اور یہی آزادی کی لامتناہی بڑھوتری کو ممکن بنانے کا واحد ذریعہ ہے۔ قوم پرست تحریکات ایک عام انسان میں قومی شعور [National conciousness] پیدا کر کے اس کو human بناتی ہیں۔

سرمایہ داریت اور قوم پرستی کا تعلق:

سرمایہ دارانہ ریاست، خواہ لبرل، خواہ سوشل ڈیموکریٹ، خواہ کمیونسٹ، خواہ قوم پرست، خواہ ان سب کا امتزاج] سرمایہ دارانہ معیشت اور معاشرت کے قیام استحکام اور فروغ کے لیے ضروری ہے کیوں کہ سرمایہ دارانہ ریاست ہی انسانوں کو human بنانے اور human رکھنے کی حقیقی ذمہ دار ہے۔ ۱۹ویں صدی میں سرمایہ دارانہ ریاستیں قومی تھیں وہ اپنی ریاستی حدود میں ہی سرمایہ دارانہ ذہنیت کو فروغ دینے اور سرمایہ دارانہ ملکیت کو مستحکم کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی تھیں۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ مارکیٹوں کا دائرہ کار قومی یا قومی استعماری علاقوں تک محدود ہوتا تھا۔ برطانوی سرمایہ برطانوی ریاست اور برطانوی استعماری نظام کے حدود میں مرتکز تھا اور یہیں اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتا تھا۔ غیر ممالک میں بھی برطانوی کارپوریشنیں اپنے تحفظ کے لیے برطانوی ریاست کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔

عالمی سرمایہ کے تحفظ کے لیے عالمی ریاست کی ضرورت:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۷۰ء کی دہائی سے سرمایہ دارانہ مارکیٹ کی قومی تشکیل میں بتدریج دراڑیں پڑ رہی ہیں اور سرمایہ دارانہ مارکیٹ بالخصوص Financial Market قومی نہیں رہی بلکہ بتدریج عالمی ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ بازاروں کو ایک ایسی عالمی ریاست کی ضرورت ہے جو

☆ انسانوں کو مسلسل قتل کرتی رہے۔ انسانوں کو بے بس لاچار اور مجبور بناتی رہے۔ انسانوں کی دولت اور وسائل پر قبضہ کرتی رہے۔

☆ انسانوں کو human [شیطان] بناتی رہی تاکہ ارادہ اجتماعی ارادہ عمومی آزادی سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری کا ذریعہ بن جائے۔

دنیا کی سب سے زیادہ مقروض ریاست:

۱۹۹۰ء میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد امریکہ کو وہ عالمی عسکری بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔ جس کو کوئی سرمایہ دارانہ ریاست چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں لہٰذا تمام سرمایہ دارانہ مارکیٹ امریکہ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کو تحفظ فراہم کرے اور ان کے کاروبار کو فروغ دے دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ہونے والی تمام امریکی حکومتوں نے عالمی سرمایہ کہ تحفظ اور فروغ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اور اب اس کے لیے ناممکن ہوگیا ہے کہ وہ اس ذمہ داری سے پیچھا چھڑائے کیوں کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ مقروض ریاست بن گئی ہے اور امریکی معاشی استحکام کا دارومدار چینی، جاپانی، کورین اور یورپی سرمایہ کاری پر مسلسل بڑھتا چلا جارہا ہے۔

امریکی عالمی سرمایہ دارانہ مارکیٹ کے فروغ اور تحفظ کی ذمہ دار ہے لیکن اس کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اپنی تاریخ اور اپنی ساخت کے اعتبار سے امریکہ ایک قومی ریاست ہے اس کا وجود کروڑوں ریڈ انڈینوں کے قتلِ عام کے نتیجہ میں ممکن ہوسکا۔ یورپ سے آئی ہوئی جن قوموں نے تین صدیوں پر محیط قتل عام، لوٹ مار اور جبر واستبداد کو برپا کیا وہ تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ ظالم، سفاک، مکار، خود غرض، ذلیل اور درندہ صفت قومیں تھیں اور بیسویں اور اکیسویں صدی میں امریکی استعمار کی خود غرضی، ظلم پرستی، سفاکیت، دہشت گردی میں مستقل اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ امریکہ کے حاکم جو اپنی قوم کے سب سے زیادہ ظالم، مکار ہیں اپنی اور انتہائی درجہ کی خود غرض قوم سے اپنی پالیسیوں کی تصدیق حاصل کرتے ہیں۔ عالمی سرمایہ دارانہ بڑھوتری کے تحفظ کے فروغ کے لیے اگر امریکی حکام ایسے فیصلے کریں جو امریکی عوام اپنے مفاد کے خلاف سمجھیں تو ان فیصلوں کی تصدیق کروانا ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔

سرمایہ داری چین وہندوستان میں کیوں؟

اس بات کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت سرمایہ دارانہ بڑھوتری کی رفتار کو مہمیز دینے

کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری چین اور ہندوستان میں کی جائے۔ ان ممالک کی آبادی فرداً فرداً امریکہ سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ ان ممالک کے سرمایہ دار اور ان کے کارندے امریکیوں سے بازی لے گئے ہیں۔ خود امریکہ میں بزنس، انجینئرنگ اور قانون کے شعبوں میں بہترین طالب علم عموماً چینی، ہندوستانی اور کورین ہوتے ہیں پھر چین اور ہندوستان میں سرمایہ داروں کو ہر سطح پر جو اجرتیں دینی پڑتی ہیں اور دیگر اخراجات [cost of production] برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ وہ امریکہ یورپ، اور جاپان کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ چینی اور ہندوستانی معاشرتی ڈھانچہ، امریکی سول سوسائٹی [Civil Society] کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مستحکم اور منظم ہے اور وہاں ابھرتی ہوئی عوامی قوتیں مثلاً B.J.P عالمی سرمایہ کی فطری حلیف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ اور سرمایہ دارانہ بڑھوتری کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عالمی سرمایہ امریکہ کے تیزی سے بوڑھے ہوتے ہوئے معاشرہ اور انحطاط کی طرف مائل ریاستی نظام پر اپنا انحصار کم کرے اور چین اور ہندوستان کی معاشرتوں اور ریاستوں سے اپنی وابستگیاں استوار کرے۔ اگر امریکی ریاست فی الواقع عالمی سرمایہ کی پشت پناہ اور فروغ دینے والی ریاست ہے تو عالمی سرمایہ داری اس امر میں حق بجانب ہے کہ وہ امریکی ریاست سے مطالبہ کرے کہ امریکی ریاست عالمی سرمایہ کی چین اور ہندوستان کی طرف منتقلی کو تحفظ اور فروغ دے گو کہ اس کا لازمی نتیجہ امریکی معیشت اور امریکہ کی ریاستی قوت کا زوال ہوگا۔

بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ کلنٹن [clinton] انتظامیہ عالمی سرمایہ کے اس مطالبہ کو بہت حد تک قبول کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ عالمی سیاسی اور معاشی نظام کو عالمگیریت اور مقامیت کے خطوط پر فروغ دیے۔ امریکی ریاست اپنی عالمگیری [global] ذمہ داریوں سے بتدریج بری ہوجائے اور یہ ذمہ داریاں ایسے عالمگیر اداروں کی طرف منتقل کردے جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو ایسے اصولوں کے مطابق چلائیں جو عالمی سطح پر سرمایہ کی بڑھوتری کو زیادہ سے زیادہ تیز کرنے کے لیے ضروری ہوں۔

معاشی اور انسانی قتل عام کے جدید طریقے:

اس دور میں سیاسی سطح پر جن گلوبل یا پیرا گلوبل [Para global] اداروں کو فروغ دیا گیا ان میں نیٹو اور اقوامِ متحدہ کی سیکیورٹی کونسل [security Council] اور اس کے پیس کیپنگ مشن [UN Peace Keeping Mission] ہیں۔ کلنٹن [Clinton] نے کئی لاکھ عراقی بچے، صومالی اور سوڈانی عوام اور روانڈہ اور برنڈی [Rawanda and Burundi] کے باشندے قتل کیے لیکن اس قتل عام کو Nato اور اقوام متحدہ کے پیس کیپنگ مشنوں نے منظم کیا اسی طرح یورپی، امریکی اور جاپانی لوٹ مار اور معاشی استحصال کو منظم کرنے کے لیے WTO، IMF، NAFTA، Asian Development bank اور Islamic Development

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

bankوغیرہ کواستعمال کیا گیا۔کاروبار اور دیگر لین دین کے معاملات کوگلوبل بنانے کے لیے [International Accounting Standards]IAS، ISO [International Standard Organisations] اور Rating Agencies وغیرہ کواستعمال کیا گیا۔

Evangilical چرچ کی تاریخ کیا ہے؟

بش نے عالمگیریت کے اس عمل کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔بش اور New Conservatives کے پیچھے جو عوامی قوت اور تحریک ہے وہ عیسائی بنیاد پرستی Christian Fundementalist کہی جاتی ہے لیکن عملاً یہ ایک خاص عیسائی فرقہ ایونجیلیکل [evangilicals] کا احیاء ہے۔Evanglicals امریکہ کی بجرنگ دل ہے یہ وہی فرقہ ہے جس کے پادری ان دستوں کی قیادت کرتے تھے جو نہتے ریڈ انڈین بستیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ جب ریڈ انڈین مردوں کے زندہ جسموں سے ان کی کھال اتاری جاتی تھی جب ریڈ انڈین عورتوں کو اجتماعی زنا کا شکار کیا جاتا تھا۔جب ریڈ انڈین بچوں کو آگ میں بھونا جاتا تھا یہ Evangilical پادری حضرت عیسیٰ [علیہ السلام] کو بھینٹ دینے کی رسوم منعقد کرتے اور بائبل کی تلاوت کرتے تھے۔آج ان Evangilicals کے Evangilical جانشین عراق اور افغانستان میں یہی کچھ کر رہے ہیں۔

Evangilical اتنے ہی عیسائی ہیں جتنے بجرنگ دلی ہندو ہیں اور جتنے zionist یہودی ہیں۔ Evangilicals کا عیسائیت سے صرف ایک منفی علامتی [negative symbolic] تعلق ہے۔ ان Evangilicals نے عیسائی تعلیمات کو امریکی دستوریت [constitutionalism] اور امریکی قوم پرستی کے تناظر میں مکمل طور پر اسی طرح مسخ کر کے رکھ دیا جیسے zionists نے یہودیت کو برباد کیا ہے۔

تمام عالمی ادارے واحد عالمی استعمار کے آلہ کار بن جائیں:

صدر بش ان اس کی انتظامیہ انہی Evangilicals کی آلہ کار ہے۔وہ امریکی قومیت کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔بش دیگر استعماری قوتوں [فرانس، جرمنی، برطانیہ، جاپان] سے مشاورت کے قائل نہیں وہ WOT، IMF، Nato، ورلڈ بنک اور Asian Development Bank کا کوئی غیر جانبدار اور آزادانہ کردار برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ان کی کوشش ہے کہ یہ تمام ادارے امریکی خارجہ پالیسی کو نافذ کرنے والے آلہ کار بن جائیں۔بش اور ان کی انتظامیہ اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ عالمی سرمایہ دارانہ مفاد کا تحفظ اور فروغ امریکہ کے نظاماتی [systemic] تسلط کو ابدی طور پر قائم رکھنے ہی کے ہم معانی ہے۔امریکی قوم پرستی کی اٹھتی ہوئی عوامی لہر اس رائے کی تائید کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے مبصرین کہتے ہیں کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد عالمگیریت ومقامیت [Globalisation and Localisation] کا دور گزر چکا اور اب ہم ایک ایسے دور

میں داخل ہو چکے ہیں جو روما [Roman] سلطنت کے زوال کے دور کے مماثل ہے۔

کیا ہونے والا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا:

کیا یہ دور ماضی کے طور پر [روم کی طرح] امریکہ کی تباہی پر ختم ہوگا۔کیا چین ۲۱ ویں صدی کی وسط میں امریکہ کی جگہ لے کر سرمایہ داری کو تحفظ اور فروغ دینے والی عالمی ریاست بن جائے گی کیا امریکہ کی جگہ استعماری ریاستوں کا ایک ایسا اتحاد لے گا جس میں یورپ، چین، جاپان، ہندوستان، روس اور عظیم اسرائیل شامل ہوں یا عالمی سرمایہ دارانہ نظام خود شکست وریخت کا شکار ہو جائے گا۔ان سوالات کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن مندرجہ ذیل باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہیں:

انسان کو Human بنانے کے طریقے:

☆ سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت اپنے وجود، بقا اور فروغ کے لیے ایک سرمایہ دارانہ ریاست [سرمایہ دارانہ تنظیم قوت اور اقتدار] پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔

☆ سرمایہ دارانہ ریاست مقامی بھی ہو سکتی ہے [۱۴ صدی کا فلارنس آج کا سنگاپور، ہانگ کانگ] قومی بھی ہو سکتی ہیں اور عالمگیر [global] بھی۔

☆ ہر سرمایہ دارانہ ریاست اپنے دائرہ اختیار خواہ، مقامی، خواہ قومی، خواہ عالمگیری] میں جبر اور ترغیب کے ذریعہ سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری کو انفرادی اور معاشرتی وجہ وجود [raison d'etra] ----- کے طور پر جواز فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔

☆ سرمایہ کی بڑھوتری یعنی آزادی کو وجہ الوجود کے طور پر قبول کرنا humanity [شیطنت] کا بنیادی عقیدہ ہے۔سرمایہ دارنہ ریاست وہ ریپبلک ہے جو کتاب الٰہی اور سنتِ انبیا کی جگہ ایک ایسے دستور کو نافذ العمل بناتی ہے جس کا کلیدی مقدمہ ہیومن رائٹس [human rights]۔سرمایہ دارانہ تصور ملکیت [Property]، سرمایہ دارانہ تصور وجود [Life] اور سرمایہ دارنہ تصور ضمیر برداشت [conciousness and toleration] فراہم کرتے ہیں۔غیر لبرل سرمایہ دار ریاستوں، قوم پرست اور اشتراکی ریاستوں میں یہ human right فرد کو حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس نمائندہ اجتماعیت [Collective] کو حاصل ہوتے ہیں جو human rights کے اصل مفاد کے مکلف تصور کی جاتی ہے۔

☆ اس دستور کے ماتحت سرمایہ کی حاکمیت ریاستی اداروں کے ذریعہ منظم کی جاتی ہے۔عدلیہ اور انتظامیہ سرمایہ دارانہ حاکمیت کے بلواسطہ مظہر ہوتے ہیں۔مقننہ میں سرمایہ کی حاکمیت کو مستحکم کرنے کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری ہے کہ ارادہ اجتماعی ارادہ عمومی کے مماثل ہو اور دونوں ہی سرمایہ کی بڑھوتری کو وجہ وجود [انفرادی اور اجتماعی] کی تصدیق کرتی ہوں۔ اگر یہ مماثلت موجود ہے تو سرمایہ دارانہ دساتیر جمہوریت کے لیے گنجائش پیدا کرتے ہیں اگر ایسا نہیں تو دستور کے اور دیگر ریاستی ضوابط کے ذریعہ جمہوریت کی تحدید ناگزیر ہو جاتی ہے۔

☆ رائے عامہ کو ارادہ عمومی [سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری کی فرضیت] سے مماثل کرنے کے لیے ریاست اور مارکیٹ دونوں سرمایہ دارانہ تعلیمی اور تشریحی نظام کو منظم اور مستحکم کرتی ہے۔

☆ سرمایہ دارانہ ریاست کا فرض ہے کہ غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کو بذریعہ جبر و ترغیب ختم کیا جائے۔ استعماریت [imperialism] اس فریضہ کی ادائیگی کی واضح ترین شکل ہے۔

☆ استعماریت اس حقیقت کا عملی اظہار ہے کہ ہیومن رائٹس کی فراہمی اور آزادی، مساوات اور ترقی کے عمل کو ہیومن [humans] کے لیے جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ غیر ہیومن انسانوں کو مستقلاً قتل کیا جاتا رہے۔ ان کے ممالک کو برباد کیا جاتا رہے۔ ان کے اموال کو چھینا جائے۔ تاریخی طور پر انسانوں کی عظیم اکثریت کو جبر کے ذریعہ ہی human بنایا گیا ہے عموماً دلیلوں سے قائل ہو کر انسان human نہیں بنتے۔

مستقبل کی حکمت عملی:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام کی پندرہویں صدی دین کے احیا اور تجدید کی صدی ثابت ہو رہی ہے۔ صدی کا آغاز جہاد افغانستان کے انعقاد اور ایران اور سوڈان جیسی اسلامی ریاستوں کے قیام سے ہوا جو آج تک اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ چیچنیا میں بھی ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی اور طالبانِ عالیشان نے تو امارتِ اسلامیہ کے ذریعے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے مبارک ادوار کی یاد تازہ کر دی۔ ریاستوں کے سقوط کے بعد ہر جگہ ایک ایسا جہاد برپا کر دیا گیا جس نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے اور آج عراق اور افغانستان میں شکست عالمی استعمار کا مقدر بن گئی ہے۔

جہادی تحریکوں کے ساتھ ساتھ انقلابی جماعتیں بھی برسرِ پیکار ہیں۔ تقریباً ہر مسلم ملک میں ایسی اسلامی جماعتیں موجود ہیں۔ جو رائج شدہ نظام کو اصولاً بالکلیہ رد کرتی ہیں اور جو اس پورے نظام کو اکھاڑ پھینک کر اسلامی نظامِ زندگی کو قائم کرنا اپنا مقصدِ وجود گردانتی ہیں ان جماعتوں کی عوامی مقبولیت میں ایسا اضافہ رونما ہوا ہے جس سے استعمار خائف ہو گیا ہے اور بالخصوص عرب دنیا میں واضح ہو گیا کہ جمہوری عمل کے ذریعہ اسلامی جماعتوں کو شکست دینا ایک مشکل بلکہ شاید ناممکن کام ہے۔

شمال مغربی افریقہ اور وسطی ایشیا میں صوفیا کی تحاریک کا احیا ہوا ہے اور برعظیم پاک و ہند اور کسی حد تک ترکی میں عوامی دعوتی کام نے فروغ پایا ہے۔ تبلیغی جماعت اور دعوۃ اسلامی کے بلا مبالغہ

کروڑوں مخاطبین ہیں اور صوفیا اور مبلغین کی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام یورپ اور امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے۔ اور ان ممالک میں اور ہندوستان میں ہر سال ایک لاکھ سے زیادہ افراد مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں۔

علوم اسلامی کا احیا ہوا ہے اور بیشتر مسلم معاشروں میں علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی عزت و وقعت میں اضافہ ہوا ہے۔ مدارس اور خانقاہیں اور زاویے، عرب دنیا اور وسط ایشیا میں، ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ بن گئے ہیں مدارس نے ایران میں عوامی اقتدار کو مرتب کرنے کا کام بخوبی انجام دیا ہے اور سیاسی عمل پر اپنے غلبہ کو خوب مستحکم کر لیا ہے۔

صرف اسلام واحد قوت ہے جو مقابلہ پر ہے:

حقیقت یہ ہے کہ دشمن آج جتنا اسلام سے خوف زدہ ہے خلافتِ عثمانیہ کے عروج کے دور کے بعد سے اب تک کبھی نہ تھا۔ اس خوف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم دنیا پر تقریباً دو سو سال حکومت کرنے کے باوجود مغرب اسلامی علمیت اور اسلامی انفرادیت کو مسخر کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ یہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے آج کی اسلامی پیش رفت کو ممکن بنایا ہے۔ تنویری علمیت [Enlightened epistomology] نے اسلام کے سوا دنیا کے ہر مذہب کی علمیاتی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا۔ عیسائیت نیو افلاطونیت [Neoplatonism] کانٹ کے ریشنل ازم [Rationalism] اور ہیوم کی تجربیت [empericism] شکار ہو گئی۔ بدھ علمیت اور چینی روایات اور رومی قدامت پرستی کو ہیگل اور مارکس کے تصورات [Dilectical Idealism, Historical Materialism] نے مسخر کر لیا قدیم ہندو اور یہودی فکر کو نطشے اور دیگر وجودی مفکرین [Existentialists] کے فلسفہ نے برباد کر ڈالا اور وہ قوم پرستی اور سوشل ڈیموکریسی کا شکار ہو گئیں۔ صرف اسلامی فکری رجحانات اور روایات اور رسوم تنویری علمیاتی یلغار کے آگے مضبوط بند باندھے رہی اور حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ نے یونانی فکری اثاثے کو منتشر کرنے کے لیے جو طریقہ methodology وضع فرمایا تھا اتنا مضبوط اور مستحکم ثابت ہوا کہ دورِ حاضر کی ابلیسی علمیت اس طریقہ [Method] میں ایک چھوٹی سی دراڑ بھی پیدا نہ کر سکی۔

اسلامی علمیت کو کس نے محفوظ رکھا؟

اسلامی علمیت، رسوم اور روایات کا دفاع کرنے والا پورے عالمِ اسلام میں صرف وہ عالم اور صوفی تھے جن کو استعمار نے تمام مادی وسائل سے محروم کر دیا تھا۔ ان کو سولی پہ لٹکایا گیا۔ بدترین تعذیب کا نشانہ بنایا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گیا۔ ان کی املاک چھینی گئیں۔ انہوں نے فاقہ سے مرنے والے اپنے بچوں کے جسد خاکی دفنائے۔ انہوں نے معاشرتی حقارت اور ذلت برداشت کی لیکن اسلام کی علمیت، روایات اور رسوم سے سرمو انحراف گوارا نہ کیا۔ استعماری غلبہ کے تاریک ترین دور میں علما اور صوفیا وہ تابندہ ستارہ بن گئے جنھوں نے امت مسلمہ کو تنویری فکر کی تاریکیوں میں گم ہونے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچالیا۔ اس دور میں علماء اور صوفیا کے کردار کے بارے میں شاعرِ اسلام حضرت حفیظ جالندھری نے یوں بیان فرمایا ہے۔

وہ مردِ حق تھا کتنے صاف و سادہ تھے اصول اس کے
وہ کہتا تھا خدا ایک ہے محمدؐ ہیں رسول اس کے
وہ کہتا تھا تھا محمدؐ سے محبت اصل ایماں ہے
بنائے وحدت ملت ہے پشتیبان ایماں ہے
نظر ڈالی نہ تھی کبھی اسباب و زینت پر
خدا رحمت کرے اس پاک بازو پاک طینت پر
عمل تھا تابع فرمان قرآن شریف اس کا
رہا وقفِ ریاضت عمر بھی جسم نحیف اس کا
وہ قائل تھا فقط اسلام ہی کی بادشاہی کا
دیا کرتا تھا درس اطفال کو علم الٰہی کا
کیا تھا خدمت ملت کا رستہ اختیار اس نے
اسی دامن میں بسایا گلشن کنج ہزار اس نے
مرے حب رسول اللہ کی بنیاد ہے مسجد
خدا آباد رکھے آج بھی آباد ہے مسجد

مغرب کے فلسفی اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں:

ابلیسی علمیت اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے علم بردار خوب جانتے ہیں کہ علمائے اسلام اور صوفیائے عظام کے اس عظیم الشان تاریخی کارنامہ نے اسلام کو ان کے لیے ایک ایسا خطرہ بنادیا ہے جس سے مقابلہ کرنا ان کے لیے روز بہ روز مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ آج تنویری علمیت بڑے اندرونی انتشار سے دوچار ہے۔ اپنے کلیدی مسلمات پر یقین قائم رکھنے کے لیے اس کے پاس دلیل مفقود اور خود اس کے چوٹی کے مفکرین Delueze Rorty, Focault, Derrida, Zizeb اور یہاں تک کہ Kant کے فکر کے سب

سے زیادہ راسخ العقیدہ فلسفی Jorgen Habermas اس بات کا اقرار کررہے ہیں کہ مغربی فلسفہ ماڈرن ازم مسلمات کو......

☆ ثابت کرنے کے لیے تنویری فکر کے پاس مضبوط دلائل موجود نہیں۔

☆ ان مسلمات کو قبول کرکے جو نظام زندگی قائم ہوتا ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام زندگی، اس میں ان اہداف کا حصول ناممکن ہے جو ان مفروضات کو قبول کرنے والا اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

☆ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ان معنوں میں مہمل اور لغو ہے کہ اس کا تصور قدر مطلق محض قدر کی نفی ہے۔ آزادی معنویت کی لاوجودیت کا دوسرا نام اور آزادی کے حصول کی جدوجہد یعنی ترقی [Progress] ایک فعل عبث ہے۔

☆ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی سے صرف وہ شخص یا گروہ مطمئن ہوسکتا ہے جو زندگی کا مثبت معنوی تصور نہ رکھتا ہو بلکہ زندگی کو محض کھیل تماشہ لہو ولعب تصور کرتا ہو یا اس کو اپنے کسی منفی جذبہ حرص اور حسد کی تسکین کا ذریعہ تصور کرتا ہو۔

ہم سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو ابلیسی اس لیے کہتے ہیں کہ شیطان بھی صرف آدم سے انتقام لینے کے لیے جی رہا ہے اور خوب جانتا ہے کہ آخرت میں اس کا کیا انجام ہوگا۔

تحریک تنویر کے تمام دعوے غلط ثابت ہوئے:

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی تباہی اور اس کا انتشار ان معنوں میں ناگزیر اور یقینی ہے کہ تحریک تنویر Enlightenment نے جو کلیدی مسلمات پیش کیے وہ لغو ثابت ہوئے ہیں ان معنی میں کہ ان مفروضات کی بنیاد پر جن مقاصد کو جواز ملتا ہے یعنی آزادی اور ترقی وہ اصولاً اور اور عملاً ناقابلِ حصول ہیں اور جو انسان بھی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی گزارنے پر [یعنی انسان کے human بننے پر] راضی ہوجاتا ہے وہ محض اپنے منفی جذبات [بالخصوص حرص اور حسد، شہوت اور غضب] کی تسکین کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ چونکہ یہ جذبات منفی ہیں لہٰذا ان کی وقتی اور واقعاتی [incidental] تسکین سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکتا۔ حرص و حسد، شہوت و غضب کی آگ ہمیشہ اونچی سے اونچی بھڑکتی رہتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اس آگ کے سپرد کردیتا ہے وہ ہر گھڑی جلتا مرتا رہتا ہے۔ اس کی انتہا وہ اجتماعی خودکشی ہے جو آج یورپ اور امریکہ کررہے ہیں اور جو ان کی تقلید میں کل چین اور ہندوستان کریں گے۔

سرمایہ داری کو درپیش خطرات:

www.KitaboSunnat.com

اس دائمی[Intrinsic] خطرہ کے علاوہ بھی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو بہت سے خطرات درپیش ہیں۔سرمایہ داری کی تاریخ بحرانوں کشمکش اور جنگ وجدل کی تاریخ ہے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے پاس قدرِ مطلق[absolute value] کا کوئی مثبت تصور موجود نہیں لہذا اس کے پاس کوئی ایسے اصول موجود نہیں جو ایک مثبت تصورِ عدل کو متعین کرسکیں۔ ہر بحران اور ہر کشمکش اور ہر تصادم میں فیصل کردار فریقین کی تقابلی قوت ہی ہوتی ہے اور جو فیصلہ بھی ہو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکتا کیوں کہ توازن،قوت میں تبدیلی کے ساتھ سرمایہ دارانہ عدل کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں کل تک سرمایہ دارانہ رہنما عالمگیریت و مقامیت [Globalisation and localisation] کا راگ الاپ رہے تھے اور بین الاقوامی سطح پر ایسے قوانین اور ضوابط نافذ کرنے کی کوششیں ہورہی تھیں جو عالمی سرمایہ دارانہ مشاورت اور مصالحت کے غماز ہوں۔آج گلوبلائیزیشن ایک داستانِ پارینہ بنتی جارہی ہے اور عالمی ادارے امریکی مفادات کی بالادستی کے تحفظ کو جواز فراہم کررہے ہیں۔کیا چین اور ہندوستان امریکہ کی نظاماتی بالادستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قبول کرلیں گے۔کیا Democratic Party امریکہ میں برسر اقتدار آ کر globalisation کی طرف رجوع کرے گی۔کیا سرمایہ دارانہ ریاست اور مارکیٹ میں جو توازنِ اختیار اور تقسیم کار[division of labour] آج موجود ہے وہ متزلزل نہ ہوجائے گا ان سوالات کے کوئی حتمی جواب اس لیے نہیں دیے جاسکتے کہ سرمایہ دارانہ تصور عدل کوئی ایسا پیمانہ فراہم نہیں کرتا جس کی بنیاد پر طے کیا جاسکے کہ سرمایہ کی بڑھوتری کو تیز کرنے کے لیے

☆مارکیٹ اور ریاست میں کونسا تقسیم کار موزوں ترین ہے۔

☆کونسی آراء[Speculative Forces] تقابلی قدر کو سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے سب سے زیادہ موزوں طریقہ پر متعین کرتی ہیں۔

☆سرمایہ عمومی[Capital in general] کا جائز اور موزوں ترین نمائندہ کون ہے۔ریاست؟حصص کنندگان[Share holder]؟فنڈ مینجر؟[Speculator]

☆بین الاقوامی تنظیم اقتدار کی کونسی حیثیت[structure] سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری کے لیے سب سے موزوں ہے۔یک قطبیت[unipolarity] علاقائیت[Regionalism]۔عالمگیریت Globalisatio

☆سرمایہ دارانہ ارادہ عمومی[general will] کی ترتیب اور تفویض میں میڈیا[Media] اور ریاست کا دائرہ کار کیا ہونا چاہیے۔وغیرہ

چوں کہ ان سوالات کے جوابات کسی متعین تصور سرمایہ دارانہ عدل کی بنیاد پر نہیں دیے

جاسکتے لہذا عملاً ان کے جوابات تصادم قوت کے ذریعہ ہی دیے جاتے ہیں اور تصادم قوت سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو بحران[crises] سے دوچار کرسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی قبولیت کہاں کہاں ہے؟

لیکن کیا وہ اجتماعی خودکشی جو ہر سرمایہ دارانہ معاشرہ اور ریاست کررہی ہے اور بحرانوں کا وہ سلسلہ جس سے سرمایہ داری وقتاً فوقتاً دوچار ہوتی رہتی ہے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو لازماً تباہ کردے گی؟ میری رائے میں مسلمانوں کی موجودہ نسل کی زندگیوں کے دوران اس کا امکان موجود نہیں۔سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی اساس روحانی پراگندگی اور اخلاقی رذائل فراہم کرتے ہیں۔سرمایہ داری بحیثیت ایک نظامِ زندگی یورپ میں غالب اس وقت آیا جب ان ممالک کی آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد عیسائی روحانی تعلیمات سے لاتعلق ہوچکی تھی اور رذائل اخلاق کو عمومی مقبولیت حاصل ہوچکی تھی۔ہر وہ شخص جو human ہے جو نہ صرف حرص اور حسد، شہوت وغضب کو اپنائے ہوئے ہے بلکہ ان اخلاقی رذائل کو اپنا حق اور فرض گردانتا ہے جو نہ صرف وحی سے اخذ شدہ روحانی حقائق کو رد کرتا ہے بلکہ اس تردید کی بنیاد پر ہی اپنی جاہلی علمیت تعمیر کرتا ہے۔ہر ایسا شخص فطرتاً سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو اپنی ذات کے لیے اپنے معاشرہ کے لیے اور اپنے ریاستی نظام کے لیے منتخب کرتا ہے۔یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ یورپ،امریکہ اور جاپان میں عوام کی بہت بڑی اکثریت human ہے وہ روحانی پراگندگی کا شکار ہے اور اخلاق رذیلہ کو اخلاق حسنہ تصور کرتی ہے۔ہندوستان میں غلبہ انہی کو حاصل ہے جو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو پسند کرتے ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو سرمایہ دارانہ معاشرت اور نظام اقتدار کو محض برداشت کرتے ہیں۔اس کو پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے کچھ مظاہر سے اعلان برأت بھی کرتے ہیں۔پاکستان میں بھی حالات اس سے زیادہ مختلف نہیں۔دونوں ممالک میں علما کی جدوجہد کے نتیجہ میں اس بات کا کچھ نہ کچھ یقین پیدا ہوا ہے کہ اسلام ایک متبادل نظام حیات ہے اور اس کے غلبہ اور تحفظ کے لیے رائج شدہ نظام زندگی سے،تصادم کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اس گفتگو سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

☆سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی اپنے اندرونی تضادات[inherent contradiction] کی وجہ سے نیست اور نابود نہ ہوگا۔

☆اس نظام کی تسخیر کے لیے ان لوگوں کا معاشرتی اور ریاستی اقتدار میں آنا ضروری ہے جو روحانی پراگندگی سے محفوظ ہوں اخلاق رذیلہ اور سرمایہ دارانہ عقلیت اور علمیت کو رد کرتے ہوں۔

☆جن معاشروں اور ریاستوں میں سرمایہ داری کے مخالفین کو غلبہ حاصل ہو وہاں کے باشندے اس اقتدار کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبول کرنے یا کم از کم برداشت کرنے پر راضی ہوں۔

میری رائے میں ہمیں اپنے اہداف اور طریقہ کار اس تناظر میں متعین کرنا چاہیے۔

ہمارا ہدف سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا مکمل انہدام اور اسلامی نظامِ زندگی کا تحفظ اور عالمی غلبہ ہے۔ یہ ایک طویل المدت جدوجہد ہے۔ نظام ہائے زندگی کا انہدام کئی صدیوں پر محیط عملی جدوجہد سے ممکن ہے۔ رومن تہذیب کا انہدام تقریباً ڈھائی صدیوں پر محیط ہے اگر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انحطاط کی شروعات ۲۰ ویں صدی کے آغاز سے تصور کی جائیں [جیسا کہ oswald spangla کا خیال ہے، تو غالب امکان یہی ہے کہ ابھی یہ عمل خاصی دیر جاری رہے گا اور عین ممکن ہے کہ مغرب کا زوال سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا انہدام ثابت نہ ہو بلکہ سرمایہ دارنہ نظامِ زندگی کے خلاف فیصل معرکے چین یا ہندوستان میں لڑے جائیں۔

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انہدام اور تحفظ اور غلبہ اسلام کی جدوجہد لازماً تین سطحوں پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے انفرادیت کی سطح پر معاشرت کی سطح پر اور ریاست پر۔ ہر سطح پر سرمایہ دارانہ علمیت [epistimology] اور عملیت [praxis] کو منہدم کرنے کی ضرورت ہے اس کام کو احسن طریقہ سے انجام دینے کے لیے ہمیں دو باتوں کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ وہ دو دنیاوی کمزوریاں ہیں جنھوں نے مستقبل قریب میں تحفظ اور غلبۂ دین کی جدوجہد کو قدرے بے اثر اور اس کے دائرۂ کار کو محدود کر دیا ہے۔

پہلی اور اہم ترین کمزوری: سرمایہ داری سے عدم واقفیت:

پہلی کمزوری یہ ہے کہ مجاہدین انقلابی مدافعین، مبلغین علما اور صوفیا سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا وسیع اور جامع ادراک نہیں رکھتے۔ اسلامی مفکرین اور قائدین کی رائے یہ ہے کہ ہماری جدوجہد عیسائیت، یہودیت، امریکہ یا مغرب کے خلاف ہے۔ اور وہ مکمل نظام حیات جس میں یہودیت، عیسائیت، امریکہ اور مغرب پیوست ہیں۔ ہمارے فکر و عمل کا ہدف نہیں یہ درست ہے کہ یہودیت اور عیسائیت ہی کی خاکستر سے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی برآمد ہوا۔ اور عیسائیت اور یہودیت ہی سرمایہ دارانہ تصورات کے ماخذ ہیں اگر عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ بناتی تو الوہیت انسانی یا شیطنت [human being] کا تصور پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اور عیسائیت اور یہودیت ہی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی تاریخی اور معاشرتی میراث فراہم کرتی ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی عیسائی اور یہودی تعلیمات سے انحراف بھی ہے اور یہ نظام زندگی یہودیت اور عیسائیت سے کچھ منتخب تعلیمات اور اعمال کو لے کر بہت سی دوسری روایات اور تعلیمات سے منسلک کرتا ہے اور ایک نیا علمیاتی اور عملیاتی منہج تعمیر کرتا ہے جس کی عیسائیت اور یہودیت محض ایک شق ہو کر رہ جاتی ہیں۔

معتزلہ: مغرب: سرمایہ داری

یہ بھی درست ہے کہ مغرب ہی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا مرکز ہے اور امریکہ ہی اس کی سب سے پشت پناہ ریاست ہے لیکن مغرب اور سرمایہ داری کا یہ تعلق وقتی اور حادثاتی ہے لازمی اور منطقی نہیں۔ اگر معتزلہ کی فکر نویں اور دسویں صدی عیسویں میں مسلم دنیا میں غالب آ جاتی تو اس کا بہت امکان تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام عرب دنیا میں پروان چڑھتا۔ معتزلہ کے پیرو اسلامی معیشت دان آج اسی چیز کا ماتم کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام نے کیوں مسلم دنیا میں جڑ نہ پکڑی اور متکلمین فقہا اور صوفیا کی فکر نے امام غزالی کی قیادت میں کیوں معتزلہ کو شکست دی۔

سرمایہ داری کا مرکز مغرب سے مشرق منتقل ہو سکتا ہے:

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ امریکہ اور یورپی ممالک کا زوال ہو لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا مرکز چین یا مشرقی ایشیا کے دیگر ممالک منتقل ہو جائے۔ ان حالات میں یہ ممالک اسلام کے تمدنی اور سیاسی حریف اور دشمن کے طور پر ابھریں گے اور مغرب کی مرتی ہوئی قوموں کی قوت ختم ہو جائے گی لہٰذا ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارا جہاد کسی قوم کے خلاف نہیں بلکہ ایک نظامِ زندگی کے خلاف ہے وہ نظامِ زندگی سرمایہ داری ہے۔ اس کا ایک مذہب ہے [جس کو آج سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے]۔ اس کی معیشت مارکیٹ یا پلان ہے اس کی سیاست ریپبلک اور دستور ہے اس کی معاشرت سول سوسائٹی ہے اور یہ تمام مظاہر ہیں اس انفرادیت کے جس کو ہیومن بینگ [human being] کہتے ہیں۔ ہم سائنس اور فلسفہ، مارکیٹ اور پلان، ریپبلک اور دستور، سول سوسائٹی اور ہیومن بینگ [human being] کو منہدم کرنے کے لیے جہاد کر رہے ہیں تا کہ علوم دین، بازار اور تجارت، خلافتِ الٰہیہ، مدنیت اور انسانیت کا غلبہ ہو۔ وہ انسانیت جس کی ہستی خدا کے حضور عبادت کے ذریعہ معنویت اور معرفت حاصل کرتی ہو۔ اسی چیز کو [being with God] کہا جاتا ہے اور یہ human being کی واضح اور حتمی تردید ہے۔

اس جہاد کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری امت مسلمہ کی حمایت اور قوت اس کے لیے مہیا [mobilize] کی جائے۔ اس سے پہلے کہ اس حکمت عملی کے خطوط پر گفتگو کروں جس کو اپنا کر ہم اس ہدف کو حاصل کر سکتے ہیں ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کی موجودہ حالت کے بارے میں میرے جو تاثرات ہیں وہ عرض کروں۔

مسلمانوں کی مجموعی آبادی تقریباً ڈیڑھ ارب ہے [۲۰۰۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق] اور ۲ء۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فی صد سالانہ کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے۔ یہ دنیا میں سب سے تیزی سے بڑھنے والی آبادی اور اس میں ۳۰ سال سے کم عمر افراد کی تعداد تقریباً دو تہائی ہے جو کہ لاطینی امریکہ کے southern cone کے برابر اور دنیا کے دیگر تمام ملکوں میں جوانوں کی مجموعی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہے۔ مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی سب سے بڑی اجتماعیت ہندوستان میں ہے جہاں ہماری تعداد کم از کم ۲۵ کروڑ ہے۔ چین، روس اور یورپ میں تقریباً ۱۰ کروڑ مسلمان آباد ہیں جن میں سے نصف سے زیادہ آبادی چین میں ہے۔ دو اسلامی ریاستیں قائم ہیں ایران اور سوڈان امارت اسلامیہ افغانستان اور چیچنیا کا ماضی قریب میں سقوط عمل میں آیا ہے۔ فلسطین کے چند محدود اضلاع میں یہودی تسلط کے زیر سایہ ایک اسلامی جماعت کو حکومت قائم کرنے کا موقع ملا ہے۔

سرمایہ داری سے عالم اسلام میں عدم واقفیت:

سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاستی نظام کی گرفت مسلم دنیا پر مستحکم اور مضبوط ہے اور اس نظام زندگی کے خلاف منظم اور مربوط جدوجہد نہ ہونے کے برابر ہے۔ عوام الناس کی بہت بڑی اکثریت سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو بحیثیت مجموعی قبول کرنے یا برداشت کرنے پر آمادہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے خلاف عوامی جدوجہد کے امکانات مفقود ہیں۔ جاہلانہ علمیت بلخصوص سائنس اور سوشل سائنسز کی گرفت مسلم ذہن پر مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور معاشرہ میں بہت سی ایسی چیزوں کو برداشت کیا جا رہا ہے جو پہلے معیوب سمجھی جاتی تھی اس میں سب سے خطرناک رجحان عورتوں کی پبلک لائف میں شرکت ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں صوفیا کی تحاریک اس قدر کم زور پڑ گئی ہیں کہ عوامی روحانیت کو فروغ دینا ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم سیکولر حکومتوں اور استعماری ذرائع سے چلنے والی فحاشی پھیلانے والی اور حقوق کی سیاست کو عام کرنے والی NGOs کا معاشرتی اثر بڑھ گیا ہے۔ کئی مسلم اکثریتی ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کو، بالخصوص آغا خانیوں، عیسائیوں، قبطیوں اور ہندوؤں کو [انڈونیشیا میں] معاشروں کو سیکولرائز کرنے کی ذمہ داری استعمار اور اس کے مقامی ایجنٹوں نے سونپ دی ہے۔

مسلم دنیا عالمی سرمایہ داری میں ضم نہیں ہو سکی:

اس سب کے باوجود مسلم دنیا کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنا ایک مشکل کام بن گیا ہے۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں ایک یہ کہ آج کے دور میں سرمایہ دارانہ جاہلی علمیت شکست و ریخت کا شکار ہے۔ اس کے کلیدی مفروضات اور اس کی عقلیت [Rationality] لغو بے معنی مہمل اور تضاد کا مجموعہ ثابت ہوئی۔ اس نے

جو معاشرتی دعوے کیے تھے وہ نہ صرف یہ کہ حاصل نہ ہوئے بلکہ یہ ثابت ہو گیا کہ ان کا حاصل کرنا ممکن ہی نہیں۔ جن اقوام نے اس جاہلانہ علمیت کو قبول کیا وہ آج اجتماعی خودکشی کر رہی ہیں۔ جن ممالک میں یہ جاہلانہ علمیت فروغ پا رہی ہے۔ بالخصوص چین اور ہندوستان وہاں کی فکری اشرافیہ خوب جانتی ہے کہ ان ممالک کا انجام کیا ہوگا یہاں بھی آزادی اور ترقی کے حصول کے لیے اجتماعی خودکشی کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ آبادی میں اضافے کی رفتار تیزی سے گر رہی ہے۔ عورتیں بچہ پیدا کرنے اور پرورش کے بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں۔ نسوانیت اور مردانگی تباہ ہو رہی ہیں اور انسانیت human being کے قالب میں ڈھل کر سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔

چین اور ہندوستان کا المیہ:

چین اور ہندوستان کا المیہ وہی ہے جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا المیہ تھا۔ ان ممالک میں سرمایہ دارانہ جاہلی علمیت کا موثر مقابلہ کرنے والی کوئی علمی روایت موجود نہیں۔ یورپ، چین اور ہندوستان کی مذہبی علمیت نے انبیاء کی تعلیمات کو مسخ کر دیا تھا اور نتیجتاً جب ان تہذیبوں کا سابقہ خالص علمی جاہلیت [فلسفہ اور سائنس] سے پڑا تو اس جاہلیت خالصہ کے فروغ کے لیے تمدنی میدان پہلے ہی سے زرخیز تھا۔ لہٰذا ان ممالک میں جاہلیت خالصہ کی مخالفت جزوی ہو گئی ان ممالک نے جاہلیت خالصہ اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی ایک تعبیر اور تشریح کو رد کیا لیکن اسی نظامِ زندگی کی دوسری تشریح کو اپنا لیا۔ مثلاً چینی کمیونسٹ نے ماؤ [Mao] کی فکر کا سہارا لے کر لبرل ازم کو رد کیا لیکن اشتراکیت [Socialism] کی بنیاد پر مقبولیت عام حاصل کی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے یہی مقام قوم پرستی کو دیا چینی کمیونزم اور ہندوتوا قوم پرستی جو قدیم چینی اور ہندو علمی اور تمدنی روایات شامل کی گئی وہ جاہلانہ علمیت میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ تاریخی عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ چینی کمیونزم اور ہندوتوا قوم پرستی کے غلبہ کے نتیجہ میں لاؤتسی [Laotse] اور کنفیوشس [Confucious] اور بھگوت گیتا اور ویدوں کی تعلیمات کا احیاء نہ ہوا بلکہ ہندوستان اور چین کو سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاستی نظام نے مسخر کر لیا۔

مسلم معاشرے سرمایہ داری میں تحلیل کیوں نہ ہوئے؟

مسلم انفرادیت، معاشرت اور نظام اقتدار کو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں ضم کرنے کی کوشش کی متوقع ناکامی کی دوسری بنیادی وجہ ہے کہ اسلامی علمی اور روحانی روایات آج بھی اسی طرح محفوظ ہیں جیسے استعمار کے غلبہ سے قبل تھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ جیسا عالم کسی دوسری امت کو نصیب نہ ہوا اور اس بات کا اظہار خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادق میں فرمایا ہے۔ حضرت حجۃ الاسلام نے اسلامی روحانیت و علمیت کو ایک ایسے مربوط نظام فکر میں سمو دیا جو نا قابل تسخیر ہے اور جس کو بنیاد بنا کر سرمایہ دارانہ جاہلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علیت کو مسخر کیا جا سکتا ہے۔ استعمار اور جاہلی علمیت کے اقتداری عروج کے دور میں علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے اس عظیم علمی اور روحانی ورثے کو کوڑے کھا کھا کر اور فاقہ پر فاقہ کر کر کے جاہلانہ عقلیت کے مغربی علم برداروں اور ان کے مقامی کاسہ لیسوں کو ایسی عبرت ناک شکست فاش دی جسکی تاریخ میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔

انیسویں صدی کے علمائے کرام اور صوفیا عظام کا یہ عدیم الشال کارنامہ وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ہم سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو منہدم کرنے کی حکمت عملی مرتب کر سکتے ہیں۔ اسلامی انفرادیت، معاشرت اور نظامِ اقتدار وہ ہتھیار ہیں جن سے عالمی سطح اور دنیا کے ہر گوشہ میں سرمایہ دارانہ جاہلی عقلیت اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے نہ کسی بقائے باہمی قائل ہیں نہ کسی تہذیبوں کے تصادم کے وہ اسلام کے سوا کسی تہذیب کے وجود کے قائل نہیں۔ اسلام کے سوا دنیا میں جو نظام زندگی بھی موجود ہے وہ جاہلیت خالصہ پر مبنی ہے اور عقل اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر جاہلانہ نظام زندگی کو جتنی جلد ممکن ہو تباہ کر دیا جائے۔ اسلام کا حق ہے کہ وہ دنیا کے ہر گوشہ میں غالب آئے۔ مسلم دنیا میں یورپ اور امریکہ میں چین اور ہندوستان میں لاطینی امریکہ اور افریقہ اسود میں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس غلبہ کے لیے قیامت تک مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔

جدوجہد برپا کرنے والے گروہ:

اب میں اس جدوجہد کو جاری رکھنے کی حکمت عملی کے چند پہلوں کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کروں گا۔

تحفظِ دین اور غلبہ دین کی جدوجہد برپا اور منظم کرنے والے چار ممتاز گروہ ہیں۔

☆ مدرسین اور مزکی

☆ مبلغین اور مصلحین

☆ انقلابی

☆ مجاہدین

مدرسین اور مزکیوں کا بنیادی ہدف اسلامی انفرادیت کا فروغ ہے۔ ان کا سب سے اہم ادارہ مدرسہ ہے۔ جس نے بیشتر مسلم ممالک میں خانقاہ کا نعم البدل پیش کیا ہے۔ مدارس کے فروغ کے نتیجہ میں مساجد کا سماجی دائرہ کار وسیع ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے زعما مدارس اور مسجد کے پھیلنے اور ان کے دائرہ کار میں آنے والی وسعت سے خائف ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ مدارس کو جاہلی علمیاتی نظام کے ماتحت کر دیا جائے اور مسجد کو حکومت اور غیر اسلامی سماجی اور معاشی تنظیموں کے ماتحت کیا جائے۔ روحانی تربیت کے اداروں کو بدعات کے عام

کرنے کے ذرائع کے طور پر استعمال کرنے کی منظم کوشش کی جا رہی ہے۔

مبلغین اور مصلحین ان گروہوں پر مشتمل ہیں جو دینی تہذیبی روایات کے تحفظ اور فروغ اور حلال کاروبار کے پھیلاؤ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں ان میں سب سے اہم تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی ہیں اور بلاشبہ ان دونوں جماعتوں کا عوامی اثر اور رابطہ دیگر تمام اسلامی صف بندیوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم اور توانا ہے۔ بہت سے بازاروں میں اسلامی تجارتی صف بندی بھی کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے اور برادریوں کا نظام حلال رزق اور اسلامی تجارتی نظام کے فروغ کے لیے ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ بھٹو کے دور تک فکر اسلامی مزدور یونین مزدوروں کی اسلامی صف بندی کے ضمن میں یہی رول ادا کرتی تھیں لیکن یہ یونینیں ختم ہو گئی ہیں۔

مصلحین اور مبلغین میں اسلامی سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ یہ تحفظ دین کی جدوجہد کو تقویت پہنچاتی ہیں اور شہری صوبائی اور مرکزی حکومتی اداروں میں شمولیت کے ذریعہ اسلامی اقدار اور روایات کا دفاع کرتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے زعما مصلحین کے ان گروہوں کو منتشر کرنے کے لیے مختلف حکمت عملیاں اختیار کرتے ہیں۔ عوامی مبلغین میں سیاسی عمل سے منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان میں سیکولر رجحانات کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اسلامی کاروباری صف بندی کو Financial مارکیٹ میں ضم کرنے کی سعی جاری ہے اور اس عمل کو اسلامی بینکاری کے ذریعے فروغ دیا جا رہا ہے۔ اسلامی سیاسی جماعتوں کو لبرل جمہوری روایات اصول اور ترجیحات کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

انقلابی گروہ وہ ہیں جو رائج شدہ نظام زندگی میں مکمل تبدیلی کے خواہاں ہیں یہ لوگ مولانا مودودی اور سید قطب علیہ رحمہ کی فکر کے وارثین ہیں اور ان کی بنیادی سعی غلبہ دین کے لیے ہے۔

اخوان اور اخوان سے نکلی ہوئی انقلابی اسلامی جماعتوں کی عوامی مقبولیت عرب دنیا میں بڑھ رہی ہے اور موجودہ استبدادی حکومتوں خواہ وہ بادشاہتیں ہوں خواہ آمریت کے متبادل قیادت کے طور پر اسلامی انقلابی جماعتیں ہی ابھر رہی ہیں۔

اسلامی انقلابی جماعتوں کو قوم پرست بنانے کی کوشش:

سرمایہ دارانہ استعمار کی کوشش ہے کہ اسلامی انقلابی جماعتوں کو جمہوری نظام میں ضم کر کے ان کو بنیادی طور پر مسلم قوم پرست بنا دے۔ قومی ترقی اور آزادی ان جماعتوں کے اصل سیاسی اہداف بن جائیں اور یہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں اس طرح ضم ہوں جیسے چین اور ہندوستان ضم ہو چکے ہیں لیکن اپنے مفادات کو پیش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر رکھتے ہوئے امریکہ اور یورپ کم از کم فی الوقت مسلم قوم پرست حکومتوں کو وہ مراعات دینے پر آسانی سے تیار نہ ہوگا جو وہ چین اور ہندوستان کو دینے پر آمادہ ہے ظاہر ہے مسلم قوم پرستی کو اپنانے کے بعد ان ریاستوں میں علماء کی قیادت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی اور اسلامی انقلاب فیصلہ کن شکست کھا جائے گا لہٰذا ان کو مسلم قوم پرست ایجنڈہ کو کلیتاً اپنانے پر راضی کرنا آسان نہیں۔

آفاقی جہادی ریاست:

افغان مجاہدین نے جو ریاست قائم کی وہ ایک قومی ریاست نہیں ایک آفاقی جہادی ریاست تھی اس ریاست نے اپنا وجود جہاد کو عالمی سطح پر جاری رکھنے کے لیے قربان کر دیا۔ سقوط افغانستان تاریخ اسلام کا ایک سنگ میل ثابت ہوا ہے بالخصوص ان معنوں میں کہ اس نے جہاد کو ایک عالمگیر تحریک کے طور پر برپا کر دیا۔ خلافت عثمانیہ کے دور کے بعد سے جہادِ افغانستان تک کے دور میں جہاد نے قومی جنگوں War of National Liberation کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ Wars of national Libration لازماً دفاعی نوعیت کی ہوتی تھیں اور ان کا مقصد کسی مسلم علاقہ کو استعمار سے آزاد کرانا ہوتا تھا ان کی قیادت خواہ اسلامی عناصر کے ہاتھ میں ہو خواہ قوم پرست ہاتھوں میں بنیادی طور پر ایک قومی ریاست کے قیام کے لیے جنگ کرتی تھی اور جہاد کا اختتام ایک مسلم قومی ریاست کے طور پر ہوتا تھا۔ چوں کہ جہاد کا مقصد کسی مسلم قوم کی آزادی ہوتا تھا لہٰذا فطرتاً اس ریاست میں ایک قوم پرست قیادت ہی برسر اقتدار آتی اور اس کی پہلی ترجیح قومی جدوجہد کے اسلامی تشخص کو ختم کر کے اسلامی عناصر کو ریاستی نظام اقتدار سے بے دخل کرنا ہوتا تھا۔ اس عمل کی سب سے واضح مثالیں الجیریا اور انڈونیشیا کی تحریک آزادی پیش کرتی ہیں۔

جہادِ افغانستان [اور غالباً جہادِ چیچنیا اور داغستان] war of national librations نہ تھی۔ طالبان نے جو ریاست فتح کی وہ فوراً عالمگیر اسلامی جہاد کا بیس کیمپ بن گئی اس میں کسی قوم پرست قیادت کا ابھر کر سامنے آنا ممکن ہی نہ تھا لہٰذا قوم پرست قیادت [شمالی اتحاد] امریکی استعمار کی باج گزار بننے پر مجبور ہو گئی اور سقوط امارۃ اسلامیہ کے بعد امریکہ کی باج گزار ریاست اس کی کٹھ پتلی قوم پرست نے قائم کی قومی اسلامی ریاستوں، ایران اور سوڈان میں قوم پرست قیادت ریاستی تنظیم اقتدار سے کبھی بھی پوری طرح بے دخل نہیں ہوئی کیوں کہ قومی اسلامی ریاستیں عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے پیوست رہتی ہیں۔ ان قومی اسلامی ریاستوں کے ساتھ عالمی سرمایہ پُرامن بقائے باہمی [peaceful coexistence] کی بنیاد پر معاملہ کر سکتا ہے چناں چہ سوڈان کو کسی حد تک برداشت کرنا امریکہ کی افریقیائی اسٹریٹیجک [stratigic] حکمت عملی کا حصہ ہے اور ایران نے امریکی کمپنیوں کو توانائی کے شعبہ تک میں سرمایہ کاری کی اجازت دینے سے گریز نہیں کیا۔ اپنی معاشی اور ریاستی تنظیم

میں بھی ان دونوں قومی اسلامی ریاستوں نے سرمایہ دارانہ صف بندی کو رد نہیں کیا۔ اس میں جزوی ترمیم پر اکتفا کیا اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے ان کے تعلق کا سب سے واضح اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ ایران اور سوڈان سرمایہ داری سے کامل قطع تعلق نہ کر سکے۔ لہٰذا دونوں اپنے آپ کو ری پبلک [republic] کہتی ہیں۔

قومی اسلامی ریاستیں سرمایہ دارانہ نظام کے لیے وقتی، علاقائی اور حادثاتی چیلنج اور خطرہ پیش کرتی ہیں لیکن بنیادی [foundational] اور نظاماتی [systemic] خطرہ پیش نہیں کرتیں۔ ان کو تباہ کرنا سرمایہ داری کے لیے ضروری [necessary] نہیں کیوں کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی وابستگیاں مستحکم کرنے کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

لیکن عالمگیر جہادی اسلامی ریاستوں سے اس نوعیت کی پرامن بقائے باہمی پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام ان کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا سرمایہ دارانہ نظام عالمی جہادی اسلامی ریاستوں کو تباہ کرنے پر مجبور ہے کیوں کہ اس کی جاہلانہ عقلیت کوئی ایسی دلیل فراہم کرنے سے قاصر ہے جو ان مفروضات کی اصلاح کر سکے جن پر یہ اسلامی آفاقی جہادی ترتیب اقتدار قائم ہوتا ہے۔ یہ بات آج کا سب سے نمایاں ماڈرنسٹ فلسفی Jorgen Habermes خوب جانتا ہے اور ۲۰۰۱ء کے بعد سے تواتر کے ساتھ اس کا اظہار کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حزب اللہ کی جدوجہد اور ایران کے مؤقف کی حمایت میں امریکہ اور مغربی ممالک سے بھرپور آوازیں اٹھتی ہیں لیکن چیچنیا اور افغان مجاہدین کے حق میں پورے مغرب سے ایک آواز بھی بلند نہیں ہوتی، یہ وہ واضح فرق ہے جو قومی اسلامی ریاستوں اور خالص جہادی آفاقی ریاستوں میں موجود ہے۔

جہاد افغانستان کے تسلسل نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جہاد جاری رکھنے کے لیے آفاقی جہادی ریاست کا وجود ضروری نہیں سقوط امارۃ اسلامیہ کے بعد بھی مجاہدین جہاد عالمی سطح پر جاری رکھے ہوئے ہے اور اس جہاد کو جاری رکھنا مجاہدین کی امتیازی ذمہ داری ہے اسی ذمہ داری کو قبول کر کے مجاہدین نے اپنے آپ کو دیگر اسلامی صف بندیوں [مدرسین، مبلغین، مصلحین اور انقلابیوں] سے ممیز کیا اور ممتاز کرتے ہیں۔

پاکستان میں انقلابی حکمت عملی کے خدوخال:

اب میں پاکستانی معاشرتی ریاستی تناظر میں ان امور پر گفتگو کروں گا جو سرمایہ داری کے خلاف اس جہاد کو جاری رکھنے کے لیے اہم ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستانی معاشرتی نظام میں مجاہدین کا وجود نہایت محدود ہے اور ریاستی نظام میں تو وہ سرے سے کوئی وجود ہی نہیں رکھتے۔ جن علاقوں میں ان کو عوامی اور قبائلی اقتداری تعاون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل ہیں وہ پاکستانی معاشرتی اور ریاستی نظام سے صرف واجبی طور پر منسلک ہیں مجاہدین کی معاشرتی اور ریاستی تنہائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایم ایم اے کی سرحد کی حکومت وانا [WANA] میں جاری فوج کشی کی مزاحمت پر نہ خود آمادہ ہوئی نہ اس پر اس فوج کشی کی مزاحمت کرنے کے لیے کوئی عوامی دباؤ پڑا۔

مجاہدین کی دوسری بڑی کمزوری یہ ہے کہ بیشتر مجاہدین کی صف بندیاں پاکستانی فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں پر انحصار کرتی رہی ہیں۔ یہ انحصار ان تنظیموں میں تو بہت زیادہ ہے جو جہاد کشمیر میں متحرک ہیں جہاد کشمیر تو خالصتاً ایک War of National Liberation ہے اور اسے سرمایہ داری کے خلاف برپا عالمی اسلامی جہاد سے منسلک کرنا کم از کم اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا عراقی مزاحمت کو اور فلسطینی انتفاضہ کو اس فرق کے ساتھ کہ عراق اور فلسطین میں مجاہدین کی ریاستی اور معاشرتی قوت کشمیر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ افغانستان میں بھی طالبان نے سقوط کابل کے بعد جو نظامِ اقتدار مشرقی اور وسطی صوبوں میں قائم کیا ہے اس کو ایجنسیوں نے penetrate کرنا شروع کردیا ہے۔

ان حالات کے تناظر میں یہ بات کہنا ناگزیر ہے کہ مجاہدین کی سب سے بڑی ضرورت مسلمانان عالم کی طرف سے اعانت اور حمایت ہے اس حمایت کے بغیر مجاہدین دنیا میں کہیں بھی ایک مستحکم عالمی جہادی ریاست قائم نہیں کرسکتے اور نہ مجاہدین کا اثر چند محدود علاقوں سے نکل سکتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں جمہوریت اور سرمایہ داری کا ربط حادثاتی [contingent] ہے ضروری نہیں ہے [یہ بات کم از کم قلیل مدت کے لیے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے، یہ ممکن ہے کہ جمہوری عمل [بشمول عمل انتخاب] ایک ایسا ارادہ کل [will of all] ترتیب دے جو ارادہ عمومی [general will] کی تحدید اور تردید کرے۔ اسی امکان کو مسترد کرنے کے لیے دستور اور ہیومن رائٹس [human rights] کی تقدیم کو جمہوری عمل کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اور جہاں بھی ارادہ کل [will of all] ارادہ عمومی [general will] کی نفی کرے وہاں سرمایہ ارادہ کل کے اس اظہار کی تردید کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ارادہ کل کے اس قسم کے فیصلوں کو مسترد کرنے میں وہ ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ ١٩٩٠ء کے الجزائر کے انتخابات کے نتائج کو مسترد کرنے میں جزواً اور ترکی کے ١٩٩٩ء کے انتخابات کے نتائج کو مسترد کرنے میں کامیاب ہوگیا [مختلف طریقوں سے] لیکن ایران کے ٢٠٠٥ء کے انتخابات کے اسی نوعیت کے نتائج کو مسترد نہ کرسکا اور ٢٠٠٦ء کے فلسطینی انتخابات کو رد کرنے میں کامیاب ہوگا یا نہیں یہ بات غیر یقینی ہے لیکن سرمایہ داری کی تاریخ اس بات کی شہادت ضرور دیتی ہے کہ اگر جمہوری عمل جاری رہے اور ہیومن رائٹس کی تقدیم کو طویل مدت تک چیلنج نہ کیا جائے تو ارادہ اجتماعی [will of all] ارادہ عمومی [general will] یعنی سرمایہ کی بڑھوتری کے مطابق ہوجاتا ہے۔ لہٰذا

انقلابی جماعتیں اگر انتخابات یا دوسرے جمہوری طریقوں کے ذریعہ برسرِ اقتدار آئیں تو وہ اقتدار کے جمہوری عمل کو معطل یا محدود کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو جمہوری عمل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انقلابی عمل کو معطل کردیتا ہے اسلامی جماعتوں کا جمہوری عمل میں شامل ہونا صرف اس صورت میں غلبۂ دین کے لیے مفید ہوسکتا ہے جب اس شمولیت کے نتیجہ میں دستوریت [یعنی نظامِ اقتدار میں ہیومن رائٹس کی فوقیت] کو کمزور کرنے کے لیے اس شمولیت کو استعمال کیا جائے ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ جماعتوں خواہ لبرل خواہ قوم پرست خواہ سوشل ڈیموکریٹ کے ساتھ الائنس قائم کرکے یہ ہدف حاصل نہیں ہوسکتا اور ایسے الائنس میں شمولیت کے نتیجہ میں اسلامی جماعتیں اپنا اسلامی تشخص کھو بیٹھتی ہیں، سرمایہ دارنہ نظام اقتدار کے ذمہ داروں میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے اور اس نظام کے ساتھ ان کی وابستگیاں وفاداریاں اور مفادات منسلک ہوجاتے ہیں اور سرمایہ دارانہ مخالف ادارتی صف بندی ان کے لیے ناممکن ہوجاتی ہے۔

جمہوری عمل میں شرکت کا اصل مقصد سرمایہ دارانہ مخالف ریاستی اور معاشرتی اقدامات کا تحفظ ہے۔ پاکستان کا تجربہ یہ ہے کہ حکومت میں شمولیت کے نتیجہ میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں اور کراچی کی شہری انتظامیہ نے ٢٠٠٢ء تا ٢٠٠٦ء کوئی بھی ایسے اقدامات نہ کیے جس کے نتیجہ میں شہری یا صوبائی سطح پر سرمایہ دارانہ مخالف اسلامی ادارتی صف بندی ممکن ہوتی، اس کے برعکس اسلامی جماعتوں کے کارکن سرمایہ دارانہ تعمیری پروجیکٹس کے کارفرما اور منتظم بن گئے اور بہت سے سرمایہ دارانہ گروہوں اور افراد نے اسلامی جماعتوں کو اپنے مقاصد کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا۔ اس سے اسلامی جماعتوں کا تشخص بری طرح مجروح ہوا اور شہری اور صوبائی سطح پر نہ اسلامی انفرادیت نے فروغ پایا نہ اسلامی معاشرت اور ریاستی اداری صف بندی نے۔

پاکستان کے موجودہ حالات میں کوئی بھی اسلامی جماعت وہ معاشرتی قوت نہیں رکھتی جو سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کو انقلابی ادارتی صف بندی کا آلہ کار بنانے کے لیے ضروری ہے۔ معاشرتی انقلابی صف بندی کے بغیر نظام اقتدار میں شمولیت لازماً مضر ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا کم از کم مستقبل قریب میں اسلامی سیاسی جدوجہد کا مقصد نظام اقتدار میں شمولیت نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا مقصد ایسی سیاسی قوت کی فراہمی ہونا چاہیے جو سیکولر حکومت پر دباؤ ڈال کر اس کو غیر اسلامی اقدمات سے باز رکھنے اور اسلامی معاشرتی ادارتی صف بندی کو گوارا اور برداشت کرنے پر مجبور کردے اس حکمت کو سیاست کے اندر ریاستی نظام تعمیر کرنے کی حکمت عملی [Building a state within a state] کہتے ہیں اور یہ حکمت عملی کامیابی کے ساتھ ایرانی علما نے مصدق کے زوال کے بعد سے ١٩٧٨ء تک اپنائی۔ اس حکمت عملی کی بنیاد اسلامی اتحاد فراہم کرنا ہے۔ یہ بات بلا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آج اتحاد دنیائے اسلام کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے اور اس اتحاد کے عدم وجود کی بنا پر امریکہ بہت فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اگر ایران اور طالبان کا اتحاد ہوتا تو ۲۰۰۲ء میں طالبان کی پسپائی ناممکن تھی کیوں کہ حکومت ایران طالبان کو کبھی بھی اس طرح تنہا نہ چھوڑتی، جس طرح ایک دھمکی پر افغانستان کے قدیم حلیف پاکستان نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ دیوبندی بریلوی اتحاد بھی نہایت اہم ہے۔ علوم اسلامی اور روایات اور رسوم اسلامی کے تحفظ کے لئے دیوبندی اور بریلوی مکاتیب فکر نے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ فطرتاً ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے والی complement کرنے والی ہیں۔ ان کے اختلافات فروعی ہیں اور ان اختلافات کو برطانوی استعمار نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فروغ دیا۔ حقیقتاً بریلوی اور دیوبندی علما اور ان کی عوامی جماعتیں بالخصوص تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی پاکستانی معاشرے میں ایک دوسرے کی فطری حلیف ہیں۔

جہاد اسلامی کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے مسلم عوام جہاد کی بھرپور اعانت پر آمادہ ہوں اس چیز کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں جتنا بھی کام تحفظ دین اور غلبہ دین کے لیے ہو رہا ہے وہ ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور فکر اور حکمت عملی کی تطبیق کے ذریعہ مختلف اسلامی جماعتوں اور گروہوں میں مسابقت اور رفاقت کی فضا قائم کی جائے اور ہر گروہ کو احساس دلایا جائے کہ دیگر تمام اسلامی جماعتیں اور گروہ اس کے فطری حلیف اور معاون ہیں فکر اور عمل کے اس ارتباط کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فروعی اختلافات سے صرف نظر کیا جائے اور ایک دوسرے کے عقائد اور اعمال کو شک کی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا جائے۔ بغیر اس کے ہم نہ تو مجاہدین کی جدوجہد کی عوامی مقبولیت کو منظم کر سکتے ہیں اور نہ استعمار کے ایجنٹوں کو معاشرہ اور ریاست کی سطح پر تنہا اور بے اثر کر سکتے ہیں۔

دوسرے مسلم ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مجاہدین کی جدوجہد کو عوامی سطح پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن مجاہدین کی یہ عوامی اعانت دو وجوہات سے بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ سب سے بڑی وجہ تو مختلف اسلامی گروہوں کے آپس کے شکوک اور شبہات ہیں انہی شکوک اور شبہات نے فرقہ واریت کو فروغ دیا ہے مسلمان آپس کی لڑائی ہی کو جہاد سمجھنے لگے ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اسلامی گروہ آپس ہی میں دست و گریباں ہوں گے تو وہ لازماً اس سے قاصر رہیں گے کہ ایک مربوط اور دوررس حکمت عملی تفویض کر سکیں۔ جو کچھ کام دفاع اور غلبہ دین کے ضمن میں ریاست اور معاشرہ کی سطح پر ہو رہا ہے لیکن اس کو ایک لڑی میں پرونے ایک نظاماتی ہیئت [structure] میں سمونے کا کوئی انتظام نہیں لہٰذا انتظام کی سطح پر مسلمانان پاکستان کی قوت نہ مجتمع ہو پاتی ہے اور نہ ایک فیصل قوت کے طور پر سامنے آتی ہے۔

ضروری ہے کہ تحفظ اور غلبہ دین کے کام کرنے والا ہر گروہ اس بات کو اچھی طرح سمجھے کہ اسلام ایک مکمل مربوط آفاقی اور عالمگیری نظام حیات ہے اور جو کام بھی کوئی ایک اسلامی گروہ کر رہا ہے اس کا تعلق دیگر تمام اسلامی گروہوں کے کام سے مربوط ہے تفہیم اور تفسیر کتاب مقدسہ کا کام پھیل نہیں سکتا اور محفوظ تک نہیں رہ سکتا اگر مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی قوت مضمحل ہو جائے جہاد جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی رسوم و رواج فروغ پائیں اور صوفیائے عظام معاشرہ کو اسلامی روحانیت سے سرشار کریں۔ مدرسین، مزکی، مبلغین، مصلحین، انقلابی اور مجاہدین یہ سب ایک دوسرے کے فطری حلیف اور ایک دوسرے کے پشتبان ہیں۔ کا یہی مفہوم ہے تمام اسلامی کام کی تطبیق کے ضروری ہے کہ ہر اسلامی تنظیم کا کارکن دو باتیں اچھی طرح سمجھ لے۔

پہلی بات تو یہ کہ اسلام ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہے تحفظ و غلبہ دین کی یہ جدوجہد کوئی ختم ہونے والی چیز نہیں یہ حضرت عیسی علیہ السلام کے ورود کے وقت تک مسلسل جاری رہے گی اور اس کی کامیابی کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ کوئی اسلامی ریاست لازماً قائم ہو جائے یا اگر قائم ہو جائے تو قیامت تک کے لئے باقی بھی رہے جدوجہد کے نتیجے میں ریاست قائم بھی ہوتی ہے تحلیل بھی ہوتی ہے۔ جدوجہد کو مادی مظہر قیام ریاست سے مشروط و محدود کرنا اسلامی انقلابی جدوجہد کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ اسے مادی اظہار سے لازماً منسلک کرنے کے مترادف ہے۔ کوئی مکمل اسلامی معاشرت یا معیشت وجود میں آجائے یا تمام مسلمان متقی اور مومن بن جائیں ہم دنیا کے سامنے کوئی ماڈل پیش کرنے کے مکلف نہیں۔ ایک ایسے آئیڈیل معاشرہ یا ماڈل ریاست جس میں گناہ کرنا ناممکن ہو۔ تمام لوگ سکون سے رہیں۔ تمام مسائل حل ہو جائیں۔ اور ترقی و آزادی بام عروج کو پہنچ جائے۔ افراد کی للّٰہیت بڑھتی گھٹتی رہے گی معاشرتی پاکیزگی اور پراگندگی میں اضافہ اور کمی ہوتی رہے گی اسلامی ریاستیں خواہ قومی خواہ آفاقی اور جہادی ہوں بنتی اور ٹوٹتی رہیں گی۔ تحفظ دین اور غلبہ دین میں کامیابی کا یہ مطلب نہیں کہ دین مکمل طور پر دنیا میں ہمیشہ کے لیے غالب آجائے حقیقت یہ ہے کہ تحفظ اور غلبہ دین کی جدوجہد کے ہر مرحلہ میں مسلمانوں کو مشکلات برداشت کرنی پڑیں گی۔ الآم اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اور آزمائشوں سے مسلسل گزرتا رہنا پڑے گا۔ خیر القرون اور پہلی ہجری صدی ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ تحریک تحفظ اور غلبہ دین کے نتیجے میں کامیابی کے مادی اظہار ریاست اور غلبہ و شوکت و فتح کے آثار کا ہر جگہ ظاہر ہونا ضروری نہیں، ہر جگہ اسلامی ریاستوں کا قیام بھی اس جدوجہد کا لازمی نتیجہ نہیں، لیکن اس جدوجہد پر ایمان و یقین اور اس میں مسلسل شرکت و تعاون اصل کامیابی و کامرانی اور اصل روح جہاد ہے۔ اگر اس روح کو کامیابی کے مادی مظاہر ریاست کے قیام وغیرہ سے مشروط کر دیا جائے تو یہ جدوجہد کمزور ہو جائے گی۔ مجاہد کامیاب اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے رب کے حضور پیش ہوتا ہے اس کو اللہ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رضا حاصل ہوتی ہے اور جنت میں داخلہ کا پروانہ ملتا ہے اسی چیز کو قرآن نے فوز العظیم سے تعبیر کیا ہے اور شہادت اس کی سب سے واضح علامت ہے۔ ہر وہ کارکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہے جس نے تحفظ اور غلبہ دین کی تگ ودو میں اپنی پوری زندگی گزاری اور "اسی دامن میں بسایا گلشن کنج مزار اس نے"

ہم دنیا میں جنت بنانے کی دعوت نہیں دیتے یا سرمایہ داری اور اس کے مذاہب لبرل ازم قوم پرستی سوشلزم کی دعوت نہیں دیتے بلکہ جنت میں جانے کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلبہ دین کے نتیجے میں جو ریاست قائم ہوتی ہے وہ ایک جہادی ریاست ہوتی ہے کوئی ویلفیئر اسٹیٹ [welfare state] نہیں ہوتی اور اس کے قائم ہوتے ہی کفار اس کو نیست اور نابود کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات جو تحریک تحفظ اور غلبہ دین کے ہر کارکن کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ کہ وہ جس نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے وہ آج کے دور میں زندگی کے ہر شعبہ پر غلبہ رکھتا ہے۔ تبلیغی جماعت اور دعوۃ اسلامی سرمایہ دارانہ انفرادیت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ مدارس اور اسلامی ٹریڈ یونینیں سرمایہ دارانہ معاشرت اور معیشت کے خلاف مصروف عمل ہیں، اگر تبلیغی جماعت اسلامی انفرادیت کی جدوجہد میں سرمایہ دارانہ معاشرت اور سرمایہ دارانہ نظام اقتدار سے اعانت حاصل کر سکے اور اسی معاشرت اور ریاستی نظام کا حصہ بن جائیں تو وہ اسلامی کردار کی تعمیر کے کام کو مستحکم بنیاد پر قائم نہ کر سکے گی اسی طرح اگر جماعت اسلامی اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں سرمایہ دارانہ معاشرتی صف بندی میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کرے یا سرمایہ دارانہ علیت کو قبول کرلے تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کو ناقابل حصول بنا دے گی۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہر جماعت اور گروہ اپنے منتخب دائرہ کار کو سرمایہ دارانہ نظام میں سموئے جانے سے محفوظ رکھے۔ یہ ایک نہایت مشکل کام ہے اور گو کہ تحفظ کی طرف پیش رفت کسی نہ کسی حد تک اتحاد اسلامی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن اصل ضرورت ایک ایسی علیت کی ہے جو سرمایہ داری پر بحیثیت ایک نظام زندگی حکم لگانے کی اہلیت رکھتی ہو اور جس کی بنیاد پر ایک ایسا علم الکلام تعمیر ہو سکتا ہے جو نظاماتی سطح [Systemic] پر سرمایہ دارانہ فکر اور عمل کی نامعقولیت ثابت کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں خواجہ گان چشتیہ اور حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کے ادوار کے بعد سے غیر اسلامی نظام ہائے زندگی پر محاکمہ اور ان کی علمی اور روحانی تسخیر پر سے توجہ ہٹ گئی اور اقتدار بالعموم اسلامی ریاستوں کے پاس رہا اس لیے علمی توجہ نظاماتی سطح سے ہٹ کر انفرادی سطح پر مرکوز ہو گئی۔ نظام تعلیم نظام معاشرت و معیشت اور نظام اقتدار چوں کہ اسلامی خطوط پر مروج تھا لہٰذا توجہ کا مرکز اس نظام کے اصول اور روح نہ رہی۔ فتاویٰ انفرادی اعمال پر نہ کہ نظاماتی خصائص پر مرکوز ہو گئے اور ۱۶ ویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک برعظیم میں جو علم کلام مرتب ہوا اس کا اصل موضوع اسلامی نظام زندگی میں

بدعات اور معاصی کا ورود تھا اس علم الکلام اور علم فقہ کے مخاطب مسلمان تھے اور وہ مسائل جو کہ کسی غیر اسلامی نظام زندگی کے ظہور اور غلبہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس فکر کا موضوع نہیں تھے۔

مغل سلطنت کی تباہی کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے ہیں اور برعظیم میں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو غلبہ حاصل ہو گیا اور اسلامی نظام زندگی کا غلبہ ریاستی سطح پر مطلقاً اور معاشرتی سطح پر جزواً معطل ہو گیا ہے۔ [اور یہی کیفیت بیشتر مسلم دنیا میں ہے] لہٰذا ایک ایسی فقہ اور علم الکلام کی تدوین کی اشد ضرورت ہے جو نظام [System] پر حکم صادر کرے اور سرمایہ دارانہ علیت کی اصلی اور اصولی نامعقولیت واضح کرے یہ کام اس بات کا متقاضی ہے کہ علما اور صوفیا فکرِ غزالی کے احیا کو تمام علمی اور روحانی کام کا مرکز اور محور بنالیں یہ بات افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ ہمارے مدارس میں حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ کی فکر اور تصانیف کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو ان کا حق ہے۔ تاریخ اسلام میں حضرت حجۃ الاسلامؒ کا فکری اور روحانی کارنامہ منفرد اور یکتا ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی اور اس کی جاہلانہ علیت کا اسلامی محاکمہ امام غزالیؒ کے فکر کے احیا کے بغیر ناممکن ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فلسفہ یونان کا ابطال: امام غزالی کا طریقہ کار

مغربی فلسفے کو غزالی بنیادوں پر مسترد کر دیا جائے

تحریر (انگریزی) علی محمد رضوی

ترجمہ: ریحان احمد

تعارف:

اس مقالے کو ضبطِ تحریر میں لانے کا مقصد ان اصولوں کی تفہیم کی کوشش ہے جو مغربی فلسفہ اور بالخصوص یونانی مابعد الطبیعات کی تنقید سے متعلق امام غزالی رحمہ اللہ کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ اس مطالعاتی جائزہ کو ہم کئی حصوں میں منقسم کر کے دیکھ سکتے ہیں مثال کے طور پر

۱) اس تناظر سے مکمل واقفیت حاصل کی جائے جس کے تحت امام غزالی یونانی فلسفہ کی بنیادوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں کیوں کہ اس سے ہمیں امام غزالی کی تنقید کے بنیادی محرکات کو جاننے میں بھی مدد ملے گی۔

۲) اس دور میں مختلف افکار و نظریات اور عقائد و اعمال کی جانب سے درپیش مختلف النوع خطرات کا تجزیہ اور ان کا سدباب۔ اس ضمن میں آپ کے اصول و تفریقات اہم ہیں۔

۳) فلسفہ و منطق کے وہ عمومی اصول جو استدلال کے دوران امام نے استعمال کیے اور ان کی کس طرح توجیہ بیان کی۔

۴) پھر وہ خاص اصول جو یونانی مابعد الطبیعات کی رد تشکیلیت کے سیاق میں امام نے نہایت عمدگی سے استعمال کیے۔

امام غزالی کے فکری کام کی اہمیت:

ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام غزالی کی منہاج کا مطالعہ کیوں ضروری ہے اس سوال کے جواب کے لیے مشہور مستشرق منٹگمری Watt کا تبصرہ قابل غور ہے۔

''مشرق و مغرب امام غزالی کے فکری مقام کی بلندی کے اس درجہ قائل ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام کو سب سے بڑا مسلمان گردانتے ہیں اور آپ بجا طور پر اس مقام کے مستحق بھی ہیں آپ کی شخصیت کی بلندی کے بیان میں جہاں دیگر پہلوؤں کو پیش کیا جا سکتا ہے وہاں یہ دو بالخصوص قابل ذکر ہیں فلسفۂ یونانی کے ساتھ مجادلہ عظیم کے دوران آپ فکر اسلامی کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور یقیناً اسلامی فکر اس پیکار سے نہ صرف یہ کہ فاتح بن کر نکلی بلکہ فکری سطح پر اسے مزید استحکام بھی ملا اور مغرب نواز افلاطونیت کی فکر پر ایسی کاری ضرب لگی کہ جس سے وہ پھر سنبھل نہ سکی۔ آپ کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے شریعت اور طریقت کے درمیان خلیج کو پاٹنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور دونوں گروہوں کے راہنما قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے حالانکہ علمائے شریعت اور پیران طریقت دونوں اب بھی اپنے اپنے افکار و اقدار کو ہی برتر تصور کرتے تھے لیکن دونوں فریقین ایک دوسرے کے مقام کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نظر آتے تھے علمائے شریعت صوفیاء کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے جب کہ دوسری جانب صوفیاء شرعی پابندیوں کے معاملے میں زیادہ محتاط رہنے لگے۔'' [intro pp.14-15]

آج اسلام کو مغربی فکر کی جانب سے ویسی ہی صورتحال درپیش ہے جو کسی زمانے میں یونانی فلسفہ کے ساتھ تھی اور آج اس کڑے دور میں مغربی علوم کے احیاء کی اسی قدر ضرورت ہے جیسا کہ امام غزالی کے وقت میں تھی اور اگر آج اہل اسلام اس موجودہ نازک صورتحال سے کامیابی سے نکلنے کے خواہش مند ہیں تو انہیں امام غزالی کی فکر کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔ [ibid P.15]

مغربی فکر کی جانب اب تک مسلمانوں کے بالعموم دو طرح کے رویے سامنے آئے ہیں ایک صورتحال یہ نظر آتی ہے کہ علماء کی اکثریت اور ان کے پیروکاروں نے مغربی فکر سے ہمیشہ دامن بچانے کی کوشش کی ہے تاکہ اسلامی فکر کو مغربی فکر کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ جدیدیت پسندوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا ہے جس نے صراحتاً اس امر کی کوشش کی یا تو ہر دو افکار کے درمیان تطابق و تفاہم کے رشتہ کو سامنے لایا جائے یا پھر اسلامی فکر کی مغربی حیثیت کو مغربی اصول تنقید اور مغربی منہاج کی مدد سے جانچا جائے۔

مغربی فکر کے ساتھ جدال کی اس کیفیت کے دوران جس شے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ غیر اسلامی افکار کا غزالی کے منہاج فکر کی روشنی میں جائزہ لینا اور اس کا محاکمہ کرنا ہے۔ آج امام غزالی کی فکر کی طرف رجوع کرنے کا مقصد و غایت بھی یہی ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو سمجھنے کے لیے قدیم اسلامی اصول تنقید کو ترویج دی جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدو جہد امام غزالی کی غایت وتناظر:

امام غزالی کی عظیم کاوش کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تناظر سے واقفیت حاصل کی جائے جس میں مغربی فکر کے محاکمہ کی ضرورت کا احساس دو چند ہو۔ صورت حال کچھ یوں تھی کہ اسلامی سلطنت کی توسیع کے دوران رومی یونانی تہذیب سے ٹکراؤ وہ پہلا ٹکراؤ تھا جب مسلمانان عرب انسانوں کے ایک ایسے گروہ سے برسر پیکار ہوئے جو ان تہذیبوں کے مقابلے میں تصور حق کے لیے متبادل فکری دلائل رکھتے تھے اس سے قبل تک جن اقوام سے مسلمانوں کا واسطہ پڑا تھا ان میں ایک کفار تھے جو اپنے عقائد کے لیے کسی قسم کی علمی بنیاد نہیں رکھتے تھے یا یہود و نصاریٰ کے گروہ تھے جو اسلام کے مماثل علمیت کے قائل تھے۔

ہر چند کہ یہ ٹکراؤ امام غزالیؒ کے زمانے سے دو صدی قبل سے جاری تھا لیکن آپ کے عہد میں اس تہذیبی ٹکراؤ سے برآمد ہونے والے علمی و فکری مسائل نے امت مسلمہ کے لیے ایک فتنہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور علماء میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے تدبر و تعقل کی بنیاد پر خود کو برتر تصور کرنے لگا تھا اس کے علاوہ وحی کو حق و صداقت کا منبع سمجھنے کی بجائے عقل و خرد کو صداقت کے حصول کا ذریعہ سمجھ رہے تھے۔ وحی کے لیے ان کا حقارت آمیز رویہ ان کے اسلامی طریقوں اور علامات کی دستبرداری سے ظاہر ہوتا تھا۔ امت کو درپیش اس نازک و پر فتن صورتحال کو امام غزالیؒ یوں بیان فرماتے ہیں:

''انہوں نے وہ تمام پابندیاں ترک کر دی ہیں جو اسلام اپنے پیروکاروں پر عائد کرتا ہے۔ وہ دین کے ان احکام کی ہنسی اڑاتے ہیں جن میں طرائق بندگی اور حلال و حرام کے قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ وہ الہامی و شرعی قوانین کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اپناتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ شریعت مطہرہ کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کو مطلق بجا نہیں سمجھتے بلکہ عقائد و ایمان کو مختلف النوع قیاسات کی کسوٹی پر پرکھنے لگے ہیں۔ ان کی مثال دراصل ان لوگوں کی ہے جو خدا کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور شیطان کی راہ پر چل نکلتے ہیں اور جو آخرت کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔''

امام اس نازک صورتحال کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ بیرونی فکر کس طرح عام مسلمانوں کے عقائد و اعمال پر اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ علمی معیارات میں یہ تبدل و تغیر، جو عقل و خرد کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بالخصوص کفریہ عقائد کے فروغ کے ضمن میں راہ ہموار کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔

آج ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہاں سقراط، بقراط، افلاطون و ارسطو وغیرہ کو علمی شخصیات کے طور پر غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اور ان فلاسفہ کے مقلدین مبالغہ کی حد تک انہیں مافوق الفطرت تدبر کے حامل افراد کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان عظیم عقلی صلاحیتوں کے بل پر جو اصول دریافت کیے گئے ہیں وہ کسی بھی قسم کی لغزش

سے پاک اور نا قابل تغیر تصور کرتے ہیں اس کے علاوہ ریاضیاتی، منطق طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی علوم کو بھی نہایت مکمل و جامع حیثیت میں پیش کیا ہے اور اس کے پس پشت وہ عظیم ترین عقلی صلاحیتیں ہی تھیں جن کی بنیاد پر استخراجی طریقہ کار کے ذریعہ کائنات کے پوشیدہ حقائق کو دریافت کیا گیا اور تدبر و تعقل کی ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ مذہبی احکام محض بے بنیاد مفروضوں اور غیر اہم حقائق سے متعلق بیانات کا مجموعہ ہیں اور انہیں کسی بھی قسم کی برتری کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

درج بالا سطور اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ہمیں ان وجوہات و اسباب کے بارے میں پتہ چلتا ہے جو امت مسلمہ میں کفریہ عقائد کی ترویج کا سبب بن رہے تھے ان اسباب کو نمبروار یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ذہنی و علمی برتری کے سبب فلاسفہ کو ہر ذی نفس بشمول انبیاء کرام سے بھی برتر سمجھنا۔

۲۔ فلاسفہ کے دریافت کردہ اصولوں کو غیر مشکوک اور بدیہی تصور کرنا۔

۳۔ استخراجی طریقہ کار کو ایسی منہاجیات کے طور پر تصور کرنا جس کے ذریعے بدیہی اصولوں سے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ نتیجتاً یونانی مابعد الطبیعات منطق اور طبعی علوم کی برتری پر یقین۔

۵۔ درج بالا عوامل مذہبی احکام و تعلیمات کی تحقیر و تذلیل کا سبب بنتے ہیں۔

درج بالا نکات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ان فلاسفہ کے مقلدین کے اندر ایک تکبر پیدا ہو گیا جس نے یونانی فلاسفہ ان کی منہاجیات علمیات میں تکبر پیدا کیا۔ جس کا مربوط اور مبسوط محاکمہ کرنے کے لیے امام غزالی نے تہافتہ الفلاسفہ جیسی کتاب تصنیف کی۔ آپ خود اس مقصد کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

''خرد سے عاری ان افراد کو جب میں نے اس فکر کو اپناتے ہوئے دیکھا تو یہ فیصلہ کر لیا کہ قدیم فلاسفہ کی فکر کے رد کے لیے ایک کتاب لکھنی چاہیے جو ان کے عقائد کی بے ربطی اور ان کے مابعد الطبیعاتی نظریات کی کجی کو واضح کر دے گی اور ان کی فکر کے کمزور ترین گوشوں کو اس طور پر عیاں کر دے گی کہ کچھ لوگوں کے لیے تفریح طبع کا سبب بنے گی تو کچھ لوگوں کی عقائد کی درستگی بھی۔...... اشارہ عقائد کے ان حصوں کی جانب ہے جن کی بنیاد پر وہ اپنے تئیں خود کو دوسروں سے ممتاز و برتر تصور کرتے ہیں۔

امام غزالی کا نظریہ علم اور مختلف علوم کی تقسیم:

علم کیا ہے اور اس کا حصول کن مقاصد کے تحت کیا جانا چاہیے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جنہیں امام غزالی کی فکر میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے علاوہ تنقید کے عمومی مقصد کو سمجھنے کے لیے بھی یہ سوالات نہایت اہم ہیں امام غزالی ابتداً علم اور حصول علم کی غایت سے متعلق کچھ ایسے تصورات و نظریات کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی بنیاد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر آپ نے مغربی فکر کی تنقید مرتب کی ہے۔

آپ کی نظر میں حصول علم کا مقصد (اس سے تصور علم کو بھی واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے) دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے (۱) معاد (۲) معاش۔ ان ہر دو مقاصد میں ایک نوع کا گہرا تعلق موجود ہے کہ معاد کا فروغ حلال رزق کے حصول کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا مطمح نظر معاد کا حصول ہونا چاہیے اور معاش کے حصول میں سرگرمی فقط اس وقت تک مستحسن ہے جب تک وہ معاد کے حصول میں معاون ثابت ہو۔ اسی طرح وہ تمام علوم جو معاد کے حصول کے لیے وضع کیے گئے ہیں یقینی طور پر علم کے دائرے میں آتے ہیں اور کسی بھی طرح اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتے۔ لہٰذا اصل علم معاد کا علم ہے امام غزالی طالبان صداقت و علم کی توجہ خاص طور پر اس نکتہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حصول علم کے لیے اس قدر شدید طلب رکھنے والے میرے دوست تم جو خود کو یہ احساس دلا رہے ہو کہ طلب علم کی راہ میں کس قدر صادق، پر جوش اور مستقل مزاج ہو کیا تم نے اس امر پر غور کیا ہے کہ اس جستجوئے علم کے پس پشت کیا مقصد کار فرما ہے؟ اگر تمہارا مقصد اپنی ذات کا نفع اور اپنے ہم جماعتوں میں ممتاز حیثیت کا حصول ہے تا کہ لوگوں کی توجہ حاصل کر کے دنیاوی نعمتیں سمیٹ لو تو جان لو کہ تم اپنے دین کے لیے بے فائدہ و بے کار ہو تم خود کو تباہ و برباد کر رہے ہو تم نے ابدی زندگی کو اس عارضی آرام و سکون پر قربان کر دیا ہے اور خوب سمجھ لو کہ یہ سودا خسارے کا سودا ہے اس بے سود تجارت میں کچھ نفع نہیں اور تمہارا استاذ جو تمہیں اس گمراہی میں پختہ کار کرتا ہے وہ بھی اس خسارے میں برابر کا شریک ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو ایک مسافر کو تلوار فروخت کرتا ہے۔ .... دوسری جانب اگر جویائے علم و صداقت کے ضمن میں تم یہ نیت رکھتے ہو کہ فقط بڑائی ظاہر کرنے کے لیے کچھ الفاظ نہ سیکھیں جائیں بلکہ صحیح راہنمائی حاصل کی جائے تو خوش ہو جاؤ کہ یہی درست راہ ہے۔ [TBG p.86]

سطور بالا سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حصول علم کا مقصد ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی اور علم دراصل خشیت الٰہی کا احساس ہے۔ یہاں علم اور معلومات کے درمیان بھی ہمیں واضح فرق دکھائی دیتا ہے کہ فقط کچھ حقائق جان لینے کا نام علم نہیں ہے بلکہ الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے جو رضائے الٰہی کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہو اور خوف خدا پیدا کرے، امام غزالی کے مطابق علم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس گفتگو کی روشنی میں ہم علوم کو بہ اعتبار درجات درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱) ایسے علوم جو کلی طور پر راست معاد سے متعلق ہیں مثلاً قرآن و حدیث کے علوم

۲) وہ علوم جو معاد کے لیے ضروری ہیں ان کے جاننے کا مقصد فقط ان علوم کو جاننا نہیں ہوتا بلکہ معاد کا حصول

ہوتا ہے اور اگر ان کو صرف ان کا علم حاصل کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ علوم مضر ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً عربی شاعری کی تعلیم قرآن کریم کی تفہیم میں کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

۳) ایسے تمام علوم جن کا معاد سے کسی طور پر واسطہ نہیں ہے جنہیں کلیتاً رد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صراط مستقیم کے بجائے گمراہی و ضلالت کی طرف لے جاتے ہیں، یہ شیطانی علوم ہیں جس کا حاصل کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے امام غزالی نے اس سیاق میں یونانی مابعد الطبیعیات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

۴) ایسے علوم شامل ہیں جو کلیتاً نہیں بلکہ آلاتی طور رمعاد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں جن کو بحیثیت مجموعی رد نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو شیطانی علوم کی معاونت کی وجہ سے رد کیا جاتا ہے اس ضمن میں یونانی منطق کو مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

۵) ایسے تمام علوم جو معاد کے حصول کی راہ میں نہ تو کسی بھی طرح سود مند ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ ضرر رساں قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کا رد کیا جانا نبی اکرم کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن کے ایمان کا حسن یہ ہے کہ وہ فضول و بے کار افعال سے الفت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر وہ علوم پیش کئے جا سکتے ہیں جنہیں ہم آلاتی علوم کہتے ہیں اور جو معاونت کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

درج بالا تقسیم کے حوالے سے کلیت اور آلائیت کے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن بنیادی درجہ بندی وہی رہتی ہے۔

امام غزالی کی یونانی علوم پر تنقید:

علم کی یہ تعریف و مفہوم اس درجہ بندی اور عمومی اصولوں کے سیاق کو سامنے رکھتے ہوئے امام غزالی مختلف یونانی علوم کا نہایت بسیط محاکمہ پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی علمیاتی تناظر میں ان کا صحیح مقام بھی مرتب فرماتے ہیں۔ زیریں سطور میں مختلف یونانی علوم پر امام کی تنقید کو مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

منطق:

امام غزالی کی رائے میں منطق ایک آلاتی علم ہے اس میں استدلال کے مختلف طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور مباحث کے ایسے اصول سکھائے جاتے ہیں جنہیں ہر دو فریق میں سے کوئی بھی اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ اندازِ استدلال اور اصول جو کسی بھی استدلال کو مضبوط اور قوی بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں دراصل صرف قضایا کی ساخت سے گفتگو کرتے ہیں انہیں قضایا کے معنی و مفہوم سے کچھ بحث نہیں ہوا کرتی۔ اسلام منطق کو بطور آلہ علم رد نہیں کرتا اور نہ ہی اسے رد کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ نہ تنہا آپ کی ذات والا صفات ہی کا کارنامہ تھا کہ آپ نے اس وقت کی موجود منطقی باریکیوں کو نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر سمجھا بلکہ ان کی مدد سے غیر اسلامی عقائد میں موجود بے ربطی اور کجی کو بھی واضح کر دیا۔ امام اس صورتحال کو یوں بیان فرماتے ہیں: ''جہاں تک اس تناظر کا تعلق ہے کہ منطقی اصولوں وضابطوں کے بغیر کوئی بحث مکمل نہیں ہوتی ان کا یہ موقف بالکل درست ہے لیکن یہ بھی اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہئے کہ منطق ان کی اجارہ داری نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ وہی شے ہے جسے ہم فن علم الکلام میں کتاب تحقیق نظری کے نام سے موسوم کرتے ہیں فلاسفہ نے اسی کا نام تبدیل کر کے منطق رکھ دیا ہے اور اس کے بارے میں ایسا تصور قائم کر دیا ہے کہ عوام اس کے نام سے ہی مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ علم کی کوئی ایسی شاخ ہے جس سے متکلمین کلی طور پر ناواقف ہیں اور صرف فلاسفہ ہی منطقی موشگافیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔'' [Tp.10]

امام غزالی علم منطق کے منفی پہلوؤں سے اجتناب برتنے کی بار ہا تلقین کرتے ہیں اور اس سے متعلق خوش فہمیوں کا بھی نہایت عمدگی سے پردہ چاک کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ان حدود کو سمجھنا چاہئے جن میں منطقی اصول اپنی جادوگری دکھا سکتے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ منطق صرف دو قضایا کے درمیان تعلق کی نوعیت کو مکمل یقین کے ساتھ بیان کرنے کی اہلیت رکھتی ہے جس کو اقتباساً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ ان قضایا کے معنی و مفہوم سے متعلق بھی قطعیت کے ساتھ رائے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

امام فرماتے ہیں ''ایک عام معارف جس میں عموماً طالبان منطق گھرے ہوئے پائے گئے ہیں کہ وہ اس علم کی بنیاد پر کچھ ایسے معیارات وضع کر لیتے ہیں جن پر پورا اترنے والے قضایا کو بھی صحیح و درست تصور کیا جاتا ہے اور جب وہ انہی معیارات کے ساتھ مذہبی احکام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ مذہبی احکام ان معیارات پر پورے نہیں اترتے لیکن وہ اپنے طے کردہ معیارات کے ضمن میں یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں مزید غور و فکر کی گنجائش ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے کہ مذہبی بیانات بدیہی حیثیت کے حامل نہیں ہوا کرتے لہٰذا ان کا اثبات وانکار بھی کرنا ممکن نہیں ہے سوائے اس صورت کے کہ اس کو استدلال کی صورتوں کے تبدل کے حوالے سے نہ جانچا جائے بلکہ ان عقائد ونظریات کے حوالے سے پرکھا جائے جو ہر دو مخالف صورتوں میں پائے جاتے ہیں جو منطق کی بجائے مابعد الطبیعات اور اس جیسے دیگر علوم کا میدان ہے۔ چنانچہ وہی لوگ اس مغالطہ میں گھرتے ہیں جو ساخت اور مفہوم کے اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ''کفریہ عقائد جن کا فلاسفہ اپنی فکر میں اظہار کرتے ہیں۔ منطق کے اصول و معیارات پر پورے اترتے ہیں اور اس طرح وہ ان عقائد کی برتری پر بھی ایمان لے آتے ہیں۔

امام بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ منطق کا کوئی بھی اصول چاہے وہ قیاس کی

مادی صحت جانچنے سے متعلق ہو یا اس کی صفوی صحت سے بحث کرتا ہو یا مفروضہ ہی کیوں نہ ہو جو منطق کی عمارت کے نہایت اہم ستون ہیں کسی بھی نوعیت کی تکنیک مابعد الطبیعاتی علوم کی بحث میں ان کی معاونت کرنے کی اہل نہیں ہے۔ [Tp.10]

ریاضی:

ریاضی ایک آلاتی علم ہے جو دیگر مقاصد کے حصول میں معاونت کا کام کرتا ہے اور کئی علوم میں اس کی ضرورت نہایت اہم ہے مثلاً میراث سے متعلق مسائل کی تفہیم کے سلسلے میں علم ریاضی مفید ہے یا نماز کے اوقات معلوم کرنے کے لیے بھی اس علم کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر دو خطرات ایسے شدید و مہلک ہیں کہ جنہیں علم ریاضی کے سیاق میں بالخصوص اور دیگر علوم میں بالعموم سمجھنا چاہئے۔

۱۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ علم الحساب کی قطعیت اور اظہار بیان کی ندرت کو دیکھ کر عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے تمام علوم ریاضی سے مشابہہ صحت کے حامل ہیں جس خدشہ کو مکمل سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا جانا چاہئے وہ یہ کہ اس کائنات سے متعلق وہ حقائق جن کے بارے میں مختلف آراء موجود رہی ہیں اور بہت سے اذہان بھٹک کر گمراہ ہو گئے۔

تہذیبوں کے درمیان تصادم اور تاریخ کے اوراق کے مطالعہ کرنے والے طالب علم کو درپیش علمی مسائل کے حل کے لیے امام غزالی ایسا کلیہ پیش کرتے ہیں کہ جس سے تشفی بخش جوابات کی تلاش میں بہت مدد ملے گی ''ایک ایسا شخص جو کسی فن میں مہارت حاصل کرتا ہے اور اس میں نام پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر فن میں اسی قابلیت کا حامل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک شخص جو قانون والٰہیات کا نہایت عمدہ عالم ہے اور اس کی باریکیوں کو بہت عمدگی سے سمجھتا ہے تو وہ فن طب کے اصولوں سے بھی واقف ہوگا یا فلسفہ و دیگر عقلی علوم سے ناواقف شخص قواعد (گرامر) کے اصولوں سے بھی نابلد ہوگا۔ ہر علم کے کچھ ایسے ماہرین ہمیشہ موجود ہوتے ہیں جو کہ ایک فن میں ماہر ہوتے ہیں مگر دوسرے فن کے لیے مطلق جاہل ہوتے ہیں۔''

سطور زیریں میں امام غزالی علم ریاضی اور دیگر علوم کے مابین تفریق نہایت وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں: ''ریاضی کے بنیادی اصول اپنی ماہیت میں اظہاری ہیں جب کہ الٰہیات (مابعد الطبیعات) کی بنیاد قیاسات پر ہے جو اہل علم ان علوم کا غائر مطالعہ کر چکے ہیں وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں۔'' اسلام اور سائنس کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ اہم ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان بنیادی طور پر کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن مسائل وہاں جنم لیتے ہیں جب سائنس اپنی تحدیدات نظر انداز کرتے ہوئے مابعد الطبیعات والٰہیاتی مباحث کو اپنے عمومی اظہاری طریقوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے علاوہ سائنسی فکر اس بات کا بھی تقاضا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتی ہے کہ زندگی کے اسرار و رموز کلی طور پر سمجھنے میں اس کی رائے کو مقتدر و محترم سمجھا جائے اور اس طرح علماء دین کی رائے کو سائنسی فکر کے تابع کر دیا جائے۔ لیکن امام کا قول اس قضیہ کو یوں مٹاتا ہے کہ کسی ایک فن میں مہارت تامہ رکھنے والا شخص دوسرے فن میں اسی مقام و مرتبہ کا حامل نہیں ہو سکتا یعنی مابعد الطبیعاتی اور الہیاتی مباحث میں سائنس کی رائے کسی طور پر اہم و برتر متصور نہیں ہو سکتی لیکن ایسے افراد جو ان ہر دو فکری مقامات میں فرق نہیں کر سکتے وہ مابعد الطبیعات و الہیاتی معاملات میں سائنس کو اس کی دیگر مخصوص شعبوں میں برتری کے سبب مقتدر و محترم تسلیم کر لیتے ہیں اور اس رویہ کی بدولت صراط مستقیم سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں علم ریاضی کے حصول کے بارے میں امام کی قطعی رائے یہ ہے کہ

''وہ طلباء جو ریاضیاتی علوم کا نہایت دلجمعی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں انہیں اس سے روک دینا چاہیے چاہے وہ اسے مذہبی معاملات کی تفہیم میں بھی کیوں نہ استعمال کریں لیکن چونکہ یہ فلسفیانہ علوم کی بنیاد ہے اس طرح طالب علم فلاسفہ کی فکری بدعقیدگیوں اور انتشار ذہنی کا شکار ہو سکتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا ذہن خشیت الٰہی کے تصور سے خالی ہو جاتا ہے۔

ریاضی اور سائنس کے حوالے سے دوسرا خطرہ افراد کا وہ گروہ ہے جو یہ سمجھتا ہیں کہ ''فلاسفہ کے دریافت کردہ ہر علم کے رد کے ذریعے ہی مذہب کا دفاع ممکن ہے اور اس طرح وہ ان کے تمام علوم کا انکار کرتے ہیں اور خود کو جہالت کی عمیق گہرائیوں میں لا پھینکتے ہیں۔ یہ رویہ مذہب اسلام کے لیے کسی بھی طرح سے سودمند قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ اس سے یہ باطل تصور نکلتا ہے کہ اسلام کی بنیاد حقائق سے انکار پر ہے جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ امام فرماتے ہیں ''وہ شخص اسلام کا شدید ترین دشمن ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا دفاع ریاضیاتی علوم کے انکار کے ذریعے ہی ممکن ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ ان علوم کے مقابلے میں الہامی تعلیمات تہی دامن ہیں اور یا پھر یہ کہ مذہبی صداقتوں کے مقابلے میں یہ علوم طفلان شیر خوار ہیں۔''

فطری علوم Natural Sciences:

امام فطری علوم کو علم طب کے مماثل سمجھتے ہیں کہ جس طرح طب میں انسانی جسم سے متعلق تحقیق و جستجو کی جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش ہے اور اسلام طبی علوم کو رد نہیں کرتا لہٰذا فطری علوم کا رد بھی اسلام کے لیے لازم نہیں ہے لیکن ان علوم کے اس تصور کو پسندیدہ نہیں سمجھتے جو یونانی فکر کے بطن بطون سے نکلتی ہے اور اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ فطرت پسندی کا نظریہ ان علوم کا استخراج نہیں ہے بلکہ یہ ایک مابعد الطبیعاتی تصور ہے جو ان علوم کی تفہیم میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اس تصور کی اصلاح کی ضرورت ہے کہ فطرت آپ اپنی مالک نہیں ہے بلکہ ایک مخلوق و واسطے کے طور پر اپنے افعال انجام دے رہی ہے۔ چاند سورج، ستارے و

سیارے سب اس کی تابع ہیں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو آپ اپنی مرضی کی مالک اور بدیہی طور پر وجود رکھتی ہو۔

المختصر کسی بھی سائنسی نظام فکر کے پس پشت مابعد الطبعیاتی تناظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور انہیں نہ صرف یہ کہ تعدیلی اہمیت کا نہ سمجھا جائے بلکہ یہ بھی اچھے طریقے سے جان لینا چاہیے کہ کسی بھی سائنسی نظام میں موجود عمومی حقائق کو ان سے جدا کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اسلام فطری علوم کی حیثیت پر کارفرما یونانی فکر کو تو تنقید کا نشانہ بناتا ہے لیکن تجرباتی حقائق کو بسر و چشم قبول کرتا ہے۔

سیاسیات واخلاقیات:

ہر چند کہ سیاسیات و اخلاقیات سے متعلق امام غزالی نے مفصل گفتگو نہیں کی ہے لیکن یہاں ہم عمیق منہاجیات کی غرض سے نکات کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ سیاسیات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''فلاسفہ کی سیاسی فکر عموماً اس الہامی پیغام سے مستعار شدہ ہے جو انبیاء کرام بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے لے کر آئے اور اس کے علاوہ اولیاء کرام کے افکار سے بھی خوشہ چینی کی ہے'' اخلاقیات کے علم کے متعلق بھی کم و بیش آپ کی یہی رائے ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر دو علوم میں آپ نے ایسے اضافے بھی کیے ہیں جن کا اطلاق علم۔ باست پر بھی ہوتا ہے ان فلاسفہ نے اپنے فضول کام کو چمکانے کے لیے ان تعلیمات کو اپنی طویل و بے مقصد بحثوں میں خلط ملط کر کے رکھ دیا ہے۔

مابعد الطبعیات:

یونانی فکر کے محاکمہ و تنقید کا اصل مقصد درحقیقت یونانی مابعد الطبیعاتی عقائد کا بطلان ہی ہے جو امام غزالی مابعد البطعیاتی قضایا کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اول قسم میں وہ مباحث شامل ہیں جن میں الفاظ کے معنی و مفہوم پر بحث کی جاتی ہے مثال کے طور پر لفظ 'جوہر' کو خدائے واحد کی ذات کے طور پر موسوم کیا جاتا ہے اور اگر وجود حقیقی کے معنی و مفہوم پر اتفاق ممکن ہو جائے تو لفظ جوہر کے مفہوم کو اس سیاق میں اشتقاقی نقطۂ نظر سے جانچنا ہوگا اور اگر اس نقطۂ نگاہ سے لفظ جوہر کے اس استعمال کا جواز مل جائے تب بھی یہ سوال تشنہ ہی رہے گا کہ آیا مذہبی فکر اس استعمال کو سند بخشتی ہے یا نہیں اور یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ در پیش تنازعہ کی لفظی اور غیر لفظی حیثیت جاننے کے لیے نہ صرف یہ کہ الفاظ کے عمومی استعمال کو سمجھا جائے بلکہ ان الفاظ کے عمومی معانی پر بھی اتفاق پیدا کیا جائے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ افرد کے درمیان الفاظ کا یکساں استعمال ان کے معانی کے یکسانیت پر بھی دلالت کرتا ہو۔

تیسری قسم میں وہ فلسفیانہ نظریات شامل ہیں جو مذہب کے بنیادی اصولوں سے متخاصم ہیں مثلاً: زمانے کے اندر تخلیق کائنات کا مذہبی تصور، خالق کائنات کے وجود کی صفات سے متعلق عقائد، قیامت میں اجسام کا دوبارہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھایا جانا۔ ان تمام عقائد کا فلاسفہ نے صریحاً انکار کیا ہے۔

(2) دوسری قسم میں ایسی چیزیں شامل ہیں جن پر فلاسفہ یقین رکھتے ہیں اور وہ مذہب کے کسی بھی اصول سے متخاصم نہیں ہیں۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا فقط کلیات کا علم رکھتا ہے اور جزئیات سے اسے کچھ مطلب نہیں ہے امام نے اسے صریح کفر قرار دیا ہے۔ تہافتہ الفلاسفہ میں امام غزالی نے تیسری قسم میں شامل قضایا سے بھرپور بحث کی ہے اور ان قضایا پر مشتمل نظام کی کجی و کمزوریوں کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

۶۔ Mode of Critique تنقید کے مختلف مناظر:

امام غزالی نے مغربی فکر پر جو بھرپور تنقید کی ہے اس کو ہم مختلف سطحوں پر سمجھ سکتے ہیں۔

۱۔ داخلی ۲۔ خارجی ۳۔ اقل حقوق ۴۔ لازمی

داخلی تنقید کے باب میں تنقید کرنے والا اس مخصوص تناظر میں گفتگو کرتا ہے جس میں وہ رہتا بستا ہے اور اس کے مخاطب وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اور وہاں کی رائج شدہ اقدار برتتا ہے لیکن علمی و فکری برتری کے سبب وہ ترویج شدہ نظریات میں نہ صرف یہ کہ کسی بھی قسم کی خرابی کو جان لیتا ہے بلکہ یہ اس کے سدباب کی بھی کوشش کرتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غزالی کی تنقید داخلی تنقید نہیں ہے کیوں کہ فلسفہ کا محاکمہ پیش کرتے وقت آپ کی تمام تر وفاداریاں اسلامی فکر سے منسلک ہیں اور آپ اسلامی علمیت کی برتری کے بھی غیر متزلزل طور پر قائل ہیں آپ کی محاکماتی تحریروں کا اصل مقصد یونانی فلسفہ کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور اس کی علمی برتری کے حوالے سے پھیلے ہوئے غلط العام تصورات کی بیخ کنی ہے تاہم آپ علمی تحقیق کے اس انداز سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ کسی بھی تنقید کو موثر بنانے کے لیے خود اس کے درون میں کمزوریاں تلاش کی جاتی ہیں اور جس فکر کو تنقید کا ہدف بنایا جائے اس سے مکمل واقفیت و آگہی حاصل کی جائے ورنہ بھرپور و جامع تنقید ممکن نہیں ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں:

''میری رائے یہ ہے کہ ایک شخص کسی بھی علم پر تنقید کا کوئی حق نہیں رکھتا جب تک وہ نہ صرف یہ کہ ان علوم کا اس قدر ماہر نہ ہو جائے کہ جس طرح خود اس علم کے ماہرین سے جس گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ان گوشوں پر بھی نگاہ ڈالنے کی اہلیت رکھتا ہو جو ان ماہرین کی نظر سے اوجھل رہے ہیں اس وقت اس کی تنقید کو اس علم کے حوالے سے اہمیت دی جائے گی۔''

امام کے نقطۂ نظر سے ''کسی نظام فکر کی مکمل تفہیم اور اس کی گہرائی و گیرائی کو سمجھے بغیر اس کی تردید کرنا عبث و بے فائدہ فعل ہے۔ اس نکتہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو امام غزالی کی فکر اپنے پیش رو متکلمین سے جدا نظر آتی ہے

کیوں کہ متکلمین کا عمومی رویہ یہی رہا کہ وہ بنیادی فلسفیانہ فکر کو رد کرنے کے بجائے عالم اسلام میں موجود علمی بدعات پیدا کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے یونانی فلسفہ سے متعلق ان کا مبلغ علم اس قدر سطحی اور چند منتشر قسم کے قیاسات پر مشتمل تھا کہ اپنی تحریروں میں ان کا فلاسفہ سے کسی قسم کا مناظرہ موجود نہیں تھا۔ مبہم اور منتشر خیالات کے علاوہ انکے دلائل اس قدر بکھرے ہوئے تھے کہ ایک عام فراست کا شخص ان سے دھوکہ نہیں کھا سکتا تھا۔ یہ متکلمین یونانی فلسفہ کو ہدف تنقید بنانے کی بجائے ان لوگوں کے نظریات سے بحث کر رہے تھے جو آہستہ آہستہ اہل اسلام میں در آئے تھے اور شریعت اسلام کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس ضمن میں وہ یونانی فلسفہ سے مستعار شدہ تصورات اور تکنیک سے بھی مدد لے رہے تھے۔ یونانی فکر سے بحیثیت مجموعی ناواقفیت کی بنا پر ان متکلمین کا انداز تنقید خارجی و آلاتی تھا۔

جب علم الکلام ایک باقاعدہ علم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو متکلمین نے شریعت کے دفاع کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور جواہر و حوادث بشمول انکی ماہیت و خصوصیت سے متعلق مقاصد میں مشغول ہو گئے لیکن وہ ان مسائل پر بھرپور و جامع طریقے سے غور و فکر نہ کر سکے جس کے نتیجے میں وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو انسانی فکر کو گمراہیوں سے مکمل طور پر نجات دلا سکتے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ متکلمین کا مخاطب وہ گروہ تھا جو اسلام کے بنیادی نظریات و عقائد پر ایمان رکھتا تھا لیکن کچھ اصولوں کی تشریحات میں وہ معروف سے اختلاف کیا کرتے تھے اور بیرونی فکر کے استدلال کو اصولیات دین کے سمجھنے میں استعمال کو مستحسن سمجھتے تھے۔ یہاں اگر دور حاضر کی کیفیت پر نگاہ دوڑائی جائے تو آج بھی ایک گروہ اسی نوعیت کی کوشش و کاوش میں مصروف عمل ہے یعنی آج کی غالب سائنسی فکر کے پیش کردہ حقائق کو درست تسلیم کرتے ہوئے اسلامی عقائد کو ان کی مدد سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ نکتہ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اس قسم کے استدلال فقط ان لوگوں کو قائل کر سکتے ہیں جو پہلے ہی اسلامی فکر کی برتری کے قائل ہیں لیکن سائنسی علوم کے تربیت یافتہ افراد کے لیے اس قسم کے استدلال ناقابل قبول ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی نظام کی مکمل تنقید کے لیے جس طرح کی تفہیم کی ضرورت ہوتی ہے وہ علم الکلام میں شاذ ہی نظر آتی ہے علم الکلام کے مباحث زیادہ تر شریعت اسلامی کے دفاع سے متعلق ہیں کہ بیرونی فکر سے متاثر افراد کی نت نئی اختراعات کو استدلال کے ذریعے غلط اور غیر مربوط ثابت کیا جائے اور تضادات سے بھرپور ان کی فکر کے منفی اثرات و نتائج کو بھی واضح کیا جائے۔ اس قسم کے طریقۂ کار مخالفین کے اس گروہ کے لیے تو کارآمد ہو سکتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن وہ جو عقل و خرد کی برتری کے قائل ہیں ان کے لیے یہ بے فائدہ و لاحاصل ہے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فکر کے حامل افراد کے درست طریقہ یہ ہے کہ مخالف کی فکر کے بنیادی اصولوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی مکمل گہرائی و گیرائی کے ساتھ تفہیم حاصل کی جائے اور اس نظام فکر کی بنیاد میں موجود التباسات و تسامحات کو واضح کیا جائے تاکہ خود اس کے بطن بطون سے اس کی تباہی جنم لے۔ جس بات کا ادراک بہت کم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے سے تسلیم شدہ دلائل سے تسلیم کروانا بے کار محض ہے۔ سائنس کے افرد کے لیے دوسرے قسم کے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ امام کلام کے اثرات کو رد نہیں کر رہے مگر ان کے خیال میں یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دوائیں مرض کی نوعیت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔

ان کی زیادہ تر منہاجیات ان اصولوں پر مبنی ہے کہ اپنے مخالفوں پر تضادات کو واضح کرنا اور جو منطقی نتائج وہ تسلیم کر چکے ہیں کے حوالے سے تنقید کرنا۔'' [A1 p 28]

یہ طرز عمل ان مخالفین کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان مخالفین کے خلاف جو کچھ بھی تسلیم نہیں کرتے یہ طریقہ تنقید لاحاصل ہے اس طرح مخالفین کے لیے ضروری ہے کہ مخالف کے طریقہ کار کو ممکنہ حد تک داخل کیا جائے اس حد تک کہ اپنا ضابطہ اخلاق متاثر نہ ہو اور اس نظام کی بے ربطگی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح وہ اندرونی طور پر ہی تباہ ہو جائیں گے۔

کسی بھی فکری نظام میں موجود ربط کو دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ منطقی ربط ۲۔ مجموعی نظام کا ربط

منطقی ربط کسی نظام کے (صوری) اندرونی ربط سے متعلق ہوتا ہے۔ اس نوع کی تنقید (جس کا مقصد کسی نظام میں موجود صوری ربط کی صحت کو جانچتے ہیں) کو اقل کل تنقید کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے جس کو ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے جب کہ انتظامی ربط سے مراد کسی نظام کے اندرونی ربط کو مکمل طور پر ساختی اور وجودی طور پر سمجھنا ہے جب امام غزالی فلاسفہ مغرب کے افکار کی اندرونی بے ربطگیوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں تو اس کا مقصد فقط فلسفیانہ عقائد و نظریات میں موجود کمزوریوں کی نشاندہی نہیں بلکہ وہ اس مخصوص علیت کے تضادات کو بھی بڑی صراحت کے ساتھ واضح کرتے چلے جاتے ہیں جس میں عقل مخفی کو خود مکتفی اور واحد راہنما کے طور پر تصور کیا جاتا ہے بایں وجہ امام غزالی کے ردو اعتراضات کو جز کی شکل میں نہیں بلکہ کل کے طور پر سمجھنا چاہیے اور اسی بنیاد پر امام غزالی کی تنقیدی فکر ایک خاص مقام کے حامل ہے کہ یہ کسی نظام کے خارجی و داخلی ہر دو پہلوؤں سے مکمل طور پر بحث کرتی ہے اس کی وضاحت یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح متکلمین نے غیر اسلامی فکر پر تنقید مرتب کرتے ہوئے ہمیشہ اسلامی علمیت کی برتری کو جزو ایمان سمجھا اور اسکو محور و مرکز بناتے ہوئے باطل فکر کو ہدف تنقید بنایا اس انداز فکر کو بیرونی تنقید کا عنوان دیا جا سکتا ہے جب کہ دوسری جانب خارجی تنقید کے ضمن میں اس نظریہ کی

مکمل طور پر تفہیم حاصل کی جاسکتی ہے جس پر تنقید کا مقصد یہ ہوتا کہ اس استدلال کی غلطی و کجی کو خود اس کے دروں سے واضح کی جائے۔

ہر چند کہ امام غزالیؒ کی یونانی تنقیدی فکر مکمل طور پر مربوط حیثیت کی حامل ہے لیکن اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ہر چند کہ امام غزالیؒ کی یونانی فکر پر تنقید کئی سطحوں پر مبنی ہے لیکن اس سے اس کی مربوط حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس فکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اول یہ ثابت کرنا کہ فلاسفہ جن تصورات کو بدیہی و غیر مشکوک تصور کرتے ہیں وہ بدیہی نہیں ہیں۔ دوسرے مرحلے میں امام غزالیؒ کچھ اپنے متبادل نظریات پیش کرتے ہیں جنہیں فلاسفہ کے تصورات کی مانند بدیہی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس طرح اس بنیادی دعویٰ کی حیثیت کو کمزور کر دیتے ہیں کہ ان کی فکر کی بنیاد عقل کی مدد سے حاصل کردہ بدیہی قضایا پر ہے۔ امام غزالیؒ فلاسفہ کے تحقیق کائنات کے نظریہ کو غیر منطقی اور لایعنی تصور کرنے سے یوں بحث کرتے ہیں۔

''آپ حضرات کو یہ کیوں کر علم ہوا کہ کسی بھی وقوعہ کی ابتداء ارداہ الٰہی کو قرار دینا غیر منطقی و محال ہے؟ آیا اس کے پس پشت کوئی ناقابل تردید بدیہی عقلی دلیل ہے یا کوئی اور نظریاتی بنیاد ہے اور کیا آپ کے اس بیان میں کوئی حد اوسط موجود ہے یا نہیں؟ اگر معاملہ یہ ہے کہ اس بیان میں حد اوسط موجود ہے اور آپ استخراجی طریقہ کار کے عامل ہیں تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ حد کیا ہے اور اگر آپ اسے بدیہی قرار دیتے ہیں تو آپ کے مخالف اس کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ جب کہ وہ لوگ جو کائنات کو حادثہ تصور کرتے ہیں ایک خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں لہٰذا فلاسفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ منطق کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کائنات کی ابتداء کو ارادہ الٰہی کے تابع ہونے کو محال قرار دیں۔

درج بالا استدلال کی مدد سے نہ صرف فلاسفہ کے عقائد و نظریات کے غیر حقیقی پن کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے استدلال میں ربط کا بھی پتا چلتا ہے کہ یہ فلاسفہ ریاضی اور منطق کے اظہاریوں سے متعلق یکساں رائے کا اظہار کرتے ہیں لیکن مذہبی اور مابعد الطبیعاتی عقائد کا معاملہ آتا ہے تو نزاع کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر صداقت تک رسائی کے لیے عقل ہی واحد راہنما اور راہبر ہوتی تو اس کے مقلدین کے درمیان یہ تفرقات جنم نہ لیتے۔ امام فرماتے ہیں

''ان فلاسفہ کے ہاں کوئی شے مستقل و غیر متغیر نہیں ہے۔ ان کے تمام بیانات اندازوں اور قیاسات پر مبنی ہوا کرتے ہیں اور ان کا واسطہ نہ تو مذہبی عقائد سے ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو تجربی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ ریاضیاتی اور منطقی علوم کی مدد سے مابعد الطبیعاتی نظریات اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ریاضیاتی علوم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مانند ان کے مابعد الطبیعاتی عقائد ونظریات بھی قطعی ومستند ہوتے تو ان کے درمیان اختلاف کی کوئی صورت نہ ابھرتی"۔

سطور بالا میں واضح طور پر امام غزالی اس نکتہ کو بیان فرماتے ہیں کہ اگر یہ مابعد الطبعیاتی عقائد غیر مشکوک، واضح اور قطعی ہوتے تو ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ فلاسفہ اپنے استدلال کو مستحکم کرنے کے لیے ان خود ساختہ عقلی اصولوں پر انحصار نہیں کر سکتے اور اس سے ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ ان مسائل کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ جنہیں کسی نوع کے واقعاتی یا تاریخی شواہد کی مدد سے حل کیا جا سکے۔ اسی طرح یہ دلیل بھی ثابت کرتی ہے کہ اختلاف منطقی تضاد سے نہیں ابھرتا اور نہ یہ ابھر سکتا ہے اور ثبوت کی ذمہ داری فلاسفہ پر ہے جو مابعد الطبیعاتی عقائد کو واضح اور عقلی اصولوں کے مطابق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہمارا تعلق منطق اور حقیقی عمل سے ہے اور ان فلاسفہ کے برخلاف غیر منطقی عقلی شواہد اور بدیہی تصورات کے وجود کو صحیح تصور نہیں کرتے۔

امام غزالی کے پس پشت کارفرما مقصد یہ ہے کہ عقل کے خود مکتفی و راہنمائے واحد کے نظریہ کے بودے پن کو ثابت کیا جائے اور یہی آپ کی فکر کا نہایت اہم نکتہ ہے۔ مابعد الطبیعاتی عقائد سے متعلق بیانات اپنی نوعیت میں ترکیبی ہوتے ہیں جن کے لیے حد اوسط کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حد اوسط اپنے موضوع موجود معلومات سے بڑھ کر فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ استخراجی طریقہ کار کے درست ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بنیادی قضایا بدیہی و غیر مشکوک ہوں جب کہ امام یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مابعد الطبیعاتی عقائد کا اظہار کرنے کے والے بیانات کے لیے یہ شرط ضروری نہیں۔ اگر بنیادی قضایا بدیہی و غیر مشکوک نہیں ہیں تو اس سے کوئی لازمی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ دوم نتیجہ کی لزومی حیثیت ثابت کرنے کے لیے حد اوسط کا ہونا ضروری ہے جب کہ مابعد الطبیعاتی بیانات کی نوعیت تحلیلی کی بجائے ترکیبی ہوتی ہے لہٰذا ان بیانات میں حد اوسط کا ہونا ممکن نہیں۔ اب اگر تحلیل و تجزیہ کی مدد سے حد اوسط کو نہیں سمجھا جا سکتا تو کچھ ایسے ذرائع ضرور ہونے چاہییں جن کی مدد سے حد اوسط تک رسائی ممکن ہو اس ضمن میں یونانی فلاسفہ کا خیال تھا کہ عقل میں بذات خود وجدانی وانکشافی صلاحیت موجود ہے، جس کی مدد سے وہ علم میں خاطر خواہ اضافہ کو ممکن بناتی ہے اور اسی صلاحیت کی بدولت بدیہی و قطعی قضایا بھی وضع کیے جاتے ہیں۔ مغربی فلاسفہ کے غیر منطقی لزومیت کے خود مکتفی ہونے کے نظریہ پر یقین کی بنیاد یہی ہے جس کو امام غزالیؒ بالخصوص ہدف تنقید بناتے ہیں۔

عقلی لزومیت کے اس نظریہ کے بودے پن کو ثابت کرنے کے لیے امام ایک اور طریق استدلال کا سہارا لیتے ہیں جسے دلائل تضمین کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طریق استدلال میں امام ایک دوسرے استدلال

جسے فلاسفہ یونان بدیہی تصور کرتے ہیں، کو غلط اور لغو ثابت کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر ابتدائی استدلال کو بھی مہمل قرار دیتے ہیں اور یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ عقلی لزومیت کا نظریہ اس قدر بدیہی و قطعی نہیں ہے کیوں کہ اگر کسی ایک استدلال کو مشکوک ثابت کر دیا جائے تو منطقی عقلی لزومیت اور خود وجودیت کا مکمل نظریہ مشتبہ وغیرہ بدیہی قرار پاتا ہے لہٰذا جب وہ کائنات کی ابدیت کے نظریے سے بحث کرتے اور اس میں شامل عقلی لزومیت اور خود مکتفی کو اس کے اجزاء کے طور پر لیتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی وہ افلاطون کے پیش کردہ روح کی ابدیت کے نظریہ کو بھی شامل بحث کر لیتے ہیں جسے وہ اسی انداز میں بدیہی و قطعی سمجھتا ہے۔ امام غزالی افلاطون کے عقیدے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"افلاطون کا خیال تھا کہ روح ابدی ہے اور جب اجسام میں جاتی ہے تو یہ تقسیم ہو جاتی ہے اور اجسام سے نکل کر واپس اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے"۔ امام اس عقیدے کو دلائل تضمین کی مدد سے تجزیہ کرتے اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ بدیہی نہیں ہے۔

'اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عقیدہ اس درجہ قابل مذمت ہے کہ اسے فوری رد کرنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا زید کی روح عمر کی روح کے مماثل ہے؟ اگر اسے مماثل قرار دیا جائے تو یہ نہایت لغو بات ہوگی۔ زید و عمر دونوں اپنے وجود سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دونوں آپس میں یکساں خصوصیات کے حامل نہیں۔ اگر ارواح اپنی نوعیت میں مماثل ہوتیں تو وہ یقیناً وقوفی حیثیت میں بھی یکساں تصور کی جاتیں جو ارواح کی لازمی و ضروری صفات ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ زید کی روح عمر کی روح سے اپنی نوعیت میں مختلف ہے اور دونوں ارواح کے دو مختلف اجسام میں منقسم ہونے کے نتیجہ میں ایک دوہریت وجود میں آتی ہے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اس جوہر کی تقسیم، جسے روح کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کو کسی ماہیت یا مقدار کی اکائیوں میں نہیں سمجھا جا سکتا، قطعی ناممکن و محال ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ روح جو اکائی کی شکل میں ہے اسے ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر دوبارہ اسی سابقہ اکائی میں واپس آ جائیں۔ اس نوعیت کا عمل فقط ان اشیاء کے ساتھ ممکن ہوتا ہے جو کسی مقدار اور ماہیت کی حامل ہوں۔ مثال کے طور پر سمندر کے پانی کو دریاؤں وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ان کا دوبارہ سمند کی صورت بن جانا بھی ممکن ہے لیکن ایک غیر مقداری بے ماہیتی شے کو کس طرح منقسم کیا جا سکتا ہے؟

ایک ایسا استدلال جس کی علمی حیثیت کو قطعی و غیر مشکوک سمجھا جاتا تھا اس کی کمزوری کو مکمل طور پر واضح کر دیا۔ اس کے بعد آپ اس استدلال کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو اصل موضوع بحث ہے۔ اس تمام استدلال کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ کائنات کی بذریعہ ارادہ الٰہی کی تخلیقی کے نظریے کو اپنے مخالفین کے لیے نہیں چھوڑ سکتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے جب کہ وہ ایسی کوئی چیز دلیل کے برعکس ثابت نہ کر دیں مگر جب یہی دعویٰ ان کے فلاسفہ نے اپنے عقیدے کو جھٹلاتے ہوئے کیا تو ان کے لیے اس تنقید پر خاموشی اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اور یہ ایک ناقابل فرار حالت تھی۔

امام غزالی نے اسی طریقہ استدلال کے ساتھ کام لیتے ہوئے فلاسفہ کے انکار تخلیق کائنات بذریعہ وحی الٰہی کے نظریہ سے بحث کی ہے۔ 'فلاسفہ کا بیان ہے کہ اگر کائنات کی تخلیق ارادہ الٰہی کے ماتحت ہوتی ہے تو یہ اب کیوں ہوا اور اس سے پہلے کیوں نہ ہوا؟'

آپ جواباً یوں بحث کرتے ہیں 'ایسا کیوں کر ہوا کہ شمال و جنوب میں دو نقاط کو قطبین تصور کر لیا گیا؟ کیا وجہ ہے کہ دائرۃ البروج کا رہگزر کسی اور دو نقاط سے نہیں ہوا اس طرح تو دائرۃ البروج کے مخالف نقاط کو بھی قطبین قرار دیا جانا چاہیے تھے؟ بہشت کی ماہیت و جسامت میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو سکتی ہے لیکن ایک قطب کو کسی بھی دوسرے مقام سے کیوں کر ممیز کیا جا سکتا ہے؟ یا وہ کیا وجہ تھی جس کی بنا پر کسی مخصوص نقطہ کو دیگر تمام نقاط کے مقابلے میں ایک قطب کے طور پر منتخب کر لیا گیا؟ کیا تمام نقاط مشابہہ نہیں ہیں جیسا کہ ایک دائرہ کے تمام اجزاء مساوی ہوتے ہیں؟ فلاسفہ اس مسئلہ کو کسی صورت میں بھی حل نہیں کر سکتے' اس تمام گفتگو سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ فلاسفہ کا عقلی لزوم اور خود وجودیت پر ایمان اور اساس کی بنیاد پر تمام عقائد کی پرکھ فکر کی گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے اور خود یہ فلاسفہ اس درجہ اہلیت کے لائق نہیں کہ وہ فطرت اور مظاہر فطرت کی اپنی واقعاتی تشریح کے دفاع میں مضبوط و مستحکم استدلال پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس داخلی سقم کی بھی آگہی ملتی ہے کہ دوسروں کے عقائد و نظریات پرکھنے کے لیے جن براہین سے کام لیا جاتا ہے خود اپنے افکار کے سلسلے میں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

امام غزالی نے اپنی تنقیدی فکر میں جس استدلال سے کام لیا ہے اسے متکلمین ازمنہ وسطیٰ کے دانشوروں اور مناظرہ کے فن میں اساتذہ کا درجہ رکھنے والوں کے ہاں 'الجواب الالزامی' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن یونانی مابعد الطبیعات کے ضمن میں اس طریقہ استدلال کو امام غزالی کی بدولت ایک نیا عروج حاصل ہوا۔ اس انداز تنقید میں ایک جانب تو یہ داخلی تنقید مرتب کی جاتی ہے اور مخالف عقیدہ کی صحت کو پرکھا جاتا ہے دوسری جانب اپنے عقائد و نظریات کو مخالف کے اصولوں کی نذر نہیں کرتے اور ان پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اس سے ایک منفی سا تاثر ابھرتا ہے کہ یہ انداز فکر مخالف کو تو سوالات سے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے جب کہ خود پر کسی نوع کا اعتراض وارد نہیں ہونے دیتا اور اس کی علت یہ ہے کہ ابتدائی طور پر مدمقابل کو خود اپنے وضع کردہ معیارات کے مطابق اپنے دعووں کو ثابت کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اس میں کسی خارجی معیار کو شامل نہیں کیا جاتا لیکن خود اپنے نظریات کو ان کے معیارات کے مطابق جانچنے کی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ اس سے ماقبل وہ ان معیارات

پر دلائل کی مدد سے اپنے شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں مہمل و بے معنی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس طرح یہ ممکن نہیں رہتا کہ ان معیارات کی بنیاد پر ان کے عقائد و نظریات کو پرکھا جائے۔

اس مقصد کے لیے مختلف سطحوں پر مختلف دلائل کی ضرورت پڑتی ہے جس کا تفصیلی بیان اوپر آ چکا ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس بنیادی دعویٰ کو رد کرنا کہ مابعد الطبیعاتی عقائد اور دیگر تنازعوں کی بنیاد پر کسی قسم کی قطعیت پر ہے اور جواب میں ایسی مثالیں پیش کرنا جس کی مدد سے ان کے متبادل دعووں کو بھی مذکورہ دعووں کی طرح قطعیت کا حامل قرار دیا جائے۔

۲۔ مخالف کے عقائد و نظریات میں موجود تاریخی و واقعاتی اغلاط کو واضح کرنا۔

۳۔ مخالف کے عقائد و نظریات میں موجود منطقی تضادات واضح کرنا۔

۴۔ ان نکات کی مدد سے عقل کے مکتفی کے نظریہ کے ابہام کو واضح کرنا۔ اس ضمن میں اوپر بحث کیے گئے دلائل تضمین کو بھی شامل استدلال کیا گیا ہے۔

خارجی تنقید:

خارجی تنقید سے مراد خود آپ اپنے وجود سے جدا دیگر افکار کو پرکھنا و جانچنا ہے۔ بیرونی فکر کی صحت کو اس طرح بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ اس کے اندرونی ربط کو دیکھا جائے کہ وہ اپنے ذروں میں کس قدر مربوط و منضبط ہیں اس کے علاوہ خود ان کے وضع کردہ معیارات کی بنیاد پر بھی ان کے افکار کی صحت میں آزمائش کی جا سکتی ہے جیسا کہ عقل کی فضیلتوں کی تنقید کے بیان میں امام غزالی کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

داخلی و خارجی ہر دو تنقیدات کا یہ امتزاج اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ عقل کی موثر فضیلتوں کو درست طور پر سمجھا جائے اور اس اشتراک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیگر عقائد و نظریات کو کمزور و غیر مستحکم ثابت کر دیا جائے اور اس سطح پر ہمیں ہر قسم کے تیر و تفنگ سے کام لینا پڑے گا لہٰذا اس امر کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی کہ حالت جنگ کی نوعیت کو درست طور پر سمجھتے ہوئے ہر طرح کی تنقید کو ایک کل میں سمو کر مخالف کی پوزیشن کو کمزور کیا جائے۔ درحقیقت ہم آج ایک خاص طور کی حالت جنگ میں ہیں جو عقائد و نظریات کی برتری کی جدوجہد ہے، جس میں ہر سو فریقین مصروف عمل ہیں اور اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسا ماحول یا فضا تخلیق کی جائے جو ہمارے حق میں ممد و معاون ثابت ہو اور مخالف افکار کے لیے غیر معاونت کا سبب بنے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس فضا کے سازگار ہونے میں ماہ و سال نہیں صدیاں لگ سکتی ہیں۔ یہ ایک طویل المیعاد علمی و تہذیبی جنگ ہے اور کسی بھی جنگ کی مانند اس میں بھی کبھی اقدامی حالت ہوگی تو کبھی پسپائی کی حکمت عملی اختیار کرنا پڑے گی' کبھی شب خون مارنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑے گا تو کبھی دبک کر بیٹھ جانے میں عافیت ہوگی۔ غرض ہر طرح کی تدبیر سے کام لینا ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں:

'یہ خوب جان لو کہ ہماری جدوجہد کا مقصد ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنا ہے جو فلاسفہ یونان پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں اور ان کی فکر کو کسی بھی نوع کے اشتباہ سے مبرا و منزہ سمجھتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ یونانی فکر میں موجود تضادات واغلاط کو مکمل طور پر عیاں کیا جائے اور اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی فکر کے بجائے ان عقائد ونظریات پر حملہ آور ہوا جائے'

یہاں اس نکتہ کو مکمل اہمیت کے ساتھ محسوس کیا جانا چاہیے کہ داخلی واندرونی تنقید کے دوران امام غزالی نے اپنے اعتقادات کی حیثیت کو ہمیشہ برتر محسوس کیا اور آپ کی فکر کے مکمل مطالعہ میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ وہ کسی قسم کی مصالحت آمیز فکر کے قائل نہیں لیکن آپ اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک مضبوط و مستحکم تنقید مرتب کرنے کے لیے یونانی فلسفہ کے بنیادی اصولوں کے حوالے سے مکمل ادراک حاصل کیا جائے خود اس فکر کے اندر سے تنقید کے لیے کمزور گوشے تلاش کئے جائیں۔ مزید برآں یہ کہ آپ کسی بھی نوع کی معروضیت یا تجریدیت کے بھی قائل نہیں ہیں۔ آپ کی تمام تر گفتگو اسلامی علمیت وصداقت کی برتری کے حوالے سے متشرح ہے جب کہ یونانی علوم وفلسفہ کو آپ کفریہ عقائد کا مجموعہ تصور کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بنیاد تصور کیے بغیر مغربی تہذیب کا کسی قسم کا اسلامی محاکمہ سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اصولی طور پر یوں کہہ لیجئے کہ اندرونی تنقید کو خارجی تنقید کے تناظر میں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

امام غزالی واضح طور پر یہاں فرماتے ہیں کہ عقلی بنیادوں پر صداقت کا حصول ممکن نہیں ہے بلکہ فقط وحی الٰہی اور رحمت خداوندی وہ کنجی ہیں جن کی بدولت انسان راہ حق پا سکتا ہے۔ کسی فرد کا کفریہ عقائد سے تائب ہو کر اسلام قبول کر لینا خداوند تعالیٰ کی عطا سے ہی ممکن ہے اس میں کسی منطقی استدلال اور عقلی موشگافیوں کو کچھ دخل نہیں ہے۔ اندرونی تنقید کے باب میں یہ باور رکھنا چاہیے کہ آپ عقل کی خود مکتفی حیثیت کے قائل نہیں ہیں اس کے برعکس خارجی تنقید کو خاص اہمیت دیتے ہیں کہ جس کے تحت اندرونی تنقید اپنا تاثر قائم کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ داخلی تنقید کی نوعیت منفی ہوا کرتی ہے جب کہ اس کے اثبات کو خارجی وبیرونی تنقید کے باب میں سمجھا جا سکتا ہے۔ امام مثبت کے طور پر اس فیصلہ کن دلیل کو رد کرتے ہیں۔

مطلق سچائی تک پہنچنے کے لیے کوئی عقلی میدان موجود نہیں ہے' مطلق سچائی کا انحصار مکمل طور پر رحمت خداوندی اور رہنمائی پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کام کا بے جا طور پر کارتیسی نظریاتی سے موازانہ کیا گیا ہے۔ امام واضح طور پر کہتے ہیں کہ کسی شخص یا گروہ میں تبدیلی (یونانی عقیدہ سے اسلام میں) کا انحصار رحمت خداوندی پر ہے نہ کہ محض دلیل کی خود انحصاریت پر۔ امام غزالی کی داخلی تنقید دلیل کی خود انحصاریت پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ مستقل

طور پر خارجی تنقید کے ضمن میں دیے گئے مواد کی تصدیق کرتی ہے۔ لہٰذا اندرونی تنقید خارجی تنقید کی دلالت کی حد تک منفی ہے۔

اب امام غزالی کی سطور کا جائزہ لیجیے

''یہ امر طے شدہ ہے کہ مطلق صداقت تک رسائی کسی دلیل یا عقل کی بدولت نہیں بلکہ خدا کی اس رحمت کی بدولت ہوا کرتی ہے جسے وہ راہ راست پر رکھنا چاہتا ہے اس کے دل میں اپنا نور داخل کر دیتا ہے اور یہ نور خداوندی کا ایک جزو لازم ہے جب نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے جب شرع کے معنی دریافت کیے اور اس آیت کے حوالے سے مطلب پوچھا کہ 'جب خدا کسی کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے تو اس کے سینے کو اسلام یعنی خدا کی محبت کے لیے کھول دیتا ہے' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'یہ وہ نور عظیم ہے جسے خدا دل مین داخل کر دیتا ہے' پوچھا گیا 'اس کی نشانی کیا ہے؟'' فرمایا ''ایسا شخص گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر فکر آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے'' اس نور خداوندی کے متعلق آپ کا ارشاد ہے 'خدا نے مخلوق کو تاریکی میں تخلیق کیا اور پھر ان میں اپنا نور پھونکا' اسی نور خداوندی کی بدولت ہی اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور یہ نور متعین عرصہ میں رحمت خداوندی کی جانب پھوٹتا ہے اس کے قرب ودیار کے لیے یقیناً کوشش کرنا چاہیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ 'آج اس دور میں رب کائنات کی رحمتوں کا دریا عروج پر ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ خود کو سیراب کرنے کی کوشش کرو'

کوئی اندرونی تنقید اسلامی عقائد وشعائر کو تسلیم کیے بغیر حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی اور تمام دیگر نظریات کو اسلامی علمیت کی بنیاد پر ہی جانچا پرکھا جائے اور یہ فقط خارجی تنقید کے ضمن میں ہی ممکن ہوتا ہے کہ دیگر عقائد کی مکمل تفہیم اور ان پر تنقید اسلامی فکر کو معیار سمجھتے ہوئے کی جائے۔

یہاں تہافہ کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے جو خالص اسلامی علمیت کے ساتھ ہی مخصوص ہے کہ اپنے عقائد کو ترک کیے بغیر خارجی تنقید مختلف نظام ہائے فکر پر ان کے بطن بطون سے تنقید مرتب کی جائے اس طرح داخلی وخارجی ہر دو انداز تنقید کے منفرد امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔

اسلام یک آفاقی پیغام کا حامل مذہب ہے جس کی ترویج اشاعت کے لیے ابتدائے کائنات ہر قوم ونسل میں انبیاء کا ظہور ہوا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کا گروہ جس قدر بھی صراط مستقیم سے کیوں نہ ہٹ جائے ان کے قلوب میں حق کی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور موجود ہوگی۔ جسے کوشش وکاوش سے مزید روشن کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کا ہر علم اپنے دور میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ رکھے ہوئے ہے جو دراصل کسی نہ کسی طور پر انبیاء کی تعلیم کا استخراج ہے جنہوں نے خدا اور آخرت پر یقین کو ہمیشہ مرکزی حیثیت دی اور دور حاضر کے علوم (چاہے قدیم ہوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا جدید) کسی حد تک ان عقائد سے متعلق نظر آتے ہیں۔

ایسے افراد جو ان بنیادی اصولوں سے منکر ہیں انہیں مکمل طور پر گمراہ سمجھنا چاہیے اور ان کے علمی مقام کو اہمیت دینے کی بھی چنداں ضرورت نہیں اور نہ ہی ان کی گفتگو پر دھیان دیا جائے۔ یہ لوگ درحقیقت شیاطین کے بہکاووں میں آ کر گمراہی و جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکے ہیں۔ ایک باشعور و فہیم شخص یقیناً غلط العام تصورات سے فوری چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جنہیں گمراہی و ضلالت کا شکار ان قوموں کو حکمت و دانش کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

اس سیاق میں امام غزالی کی فکر کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یونانی فلسفہ میں موجود ان عناصر کو سمجھا جائے جو صداقت کے حصول اور کذب سے برأت کے اظہار میں معاونت کا سبب بنتے ہیں اس مقصد کے تحت آپ ہر دو ادوار کے یونانی فلسفہ کے نظریات کے درمیان امتیاز کرتے ہیں تو دوسری جانب یونانی فکر و فلسفہ کے مختلف مکاتب کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ اول جز کے بارے میں آپ فرماتے ہیں:

'یہ کتاب (تہافہ) اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ قدیم فلاسفہ کے وہ مقلدین جنہیں دہریے تصور کیا جاتا ہے وہ دراصل اس الزام کے مستحق نہیں ہیں۔ انہوں نے مذہبی قوانین کا کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ نہ صرف وجود باری تعالیٰ کے قائل ہیں بلکہ انبیاء کرام پر بھی یقین رکھتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ معاملات میں وہ التباس کا شکار ہو کر صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور دوسروں کے لیے بھی گمراہی کا سبب بنے۔ ہم اس تصنیف میں ان کی غلطی کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جن کی بناء پر وہ باطل کا آلۂ کار بن گئے۔'

آپ یونانی فلسفہ کو ان کی فکر کے اعتبار سے تین مکاتب میں تقسیم کرتے ہیں

۱۔ مادیت پسند ۲۔ فطرت پسند ۳۔ مذہب پسند

ان مکاتب فکر سے متعلق امام کی رائے کو مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ آپ مادیت پسند کو فلاسفہ کا وہ گروہ تصور کرتے ہیں جو کائنات کی ابدیت کے قائل ہیں کہ یہ ازل سے موجود ہے۔ یہ گروہ خالق کائنات کا بھی منکر ہے۔ امام غزالی اس فکر کے حامل افراد کو کافر و زندیق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے گروہ میں وہ حکماء شامل ہیں جو عالم فطرت سے متعلق تحقیقات میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور حیوانات کے اعضاء جسمانی کی جراحت کے علم کے بارے میں ان کی کاوشیں قابل ذکر ہیں لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تخلیق کے عمل میں گہری تفہیم اور عجائبات عالم پر اس قدر شدید غور و فکر کے بعد بھی انہیں یہ احساس نہ ہوا کہ اس عالم آب و گل کے پس پشت اک عظیم ہستی کارفرما ہے جو علیم و خبیر ہے اور جس نے اس تمام کائنات کو خلق کیا ہے۔

اس کے بجائے وہ فطرت کو خود مکتفی اور مانند از خدا سمجھنے لگے۔ وہ ذات باری تعالیٰ کے انکاری نہیں تھے بلکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ خدا کائنات کی تخلیق کے بعد کائنات سے ایک معنوں میں لاتعلق ہو گیا ہے اور اب وہ قوانین فطرت یا انسانی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا۔ ان کا یہ تصور خدا بعد کے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فطرتیت پسندوں کے گھڑی ساز خدا کے نظریہ کے مماثل نظر آتا ہے۔ آپ ان کے عقائد کے بارے میں فرماتے ہیں:

'یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ موت روح کو آتی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کی طرف نہیں لوٹتی اس کے علاوہ دوزخ' بہشت کی ابدی زندگی' اجسام کے دوبارہ اٹھائے جانے اور پھر ان کے بھی مماثل نہیں' یعنی آخرت فرمانبرداروں کے لیے جزا اور گناہ گاروں کے لیے عذاب کا عقیدہ ان کے لیے درست نہیں ہے۔'

امام غزالی ان لوگوں کا شمار بھی کافروں میں کرتے ہیں کہ یہ خدا اور اس کی صفات کے تو قائل ہیں لیکن روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

۳۔ تیسرے گروہ میں سقراط' افلاطون اور ارسطو کے نام قابل ذکر ہیں۔ امام کی رائے میں خدا پرستوں کے اس گروہ نے مادیت پسندوں اور فطرت پرستوں کے نظریات پر اس درجہ کڑی تنقید کی کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی اور قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

"خدا نے ان کی آپس کی لڑائی میں ایمان رکھنے والوں کو بخش دیا"...... تہافۃ الفلاسفہ میں اسی قسم کے کلمات معتزلہ اور دیگر گروہوں کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام فرماتے ہیں:

"ان فرقوں کے بارے میں میرا نظریہ کچھ اس نوعیت کا رہا ہے کہ ہم تمام تر اختلافات کے باوجود فلاسفہ کے مقابلے میں باہم متفق و متحد ہیں جب کہ اختلاف عموماً فقط معاملات کی تشریح کے حوالے سے ہی ہے لیکن فلاسفہ کے مذہبی عقائد پر اعتراضات کے جواب میں ہم اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف ایک ہیں اور ہمیں اس مقصد کی خاطر اپنے ذاتی تنازعات کو لازمی طور پر پس پشت ڈالنا ہوگا۔" [tp.8]

یہ سطور اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ہمیں امام غزالی کے طریقۂ کار کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ امام اسلام کے دشمنوں کے خلاف جن قوتوں سے اشتراک و اتحاد کو ممکن قرار دیتے ہیں ان کے عقائد میں خدا اور روز آخرت پر ایمان ضرور شامل ہونا چاہیے اور یہی وہ معیار ہے کہ جو اہل اسلام کے ساتھ اشتراک عمل کی بنیاد بنتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ حق و صداقت کا تنہا و واحد معیار اسلام ہے اور دیگر قوتوں کے ساتھ کسی نوعیت کا عارضی اتحاد فقط مقصد کے حصول تک محدود رہنا چاہیے اور مستقل نوعیت کے اشتراک سے گریزاں ہی رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مادیت پسندوں اور فطرت پسندوں کے مقابلے میں ان اللہ پرستوں کو ترجیح دینے کے باوجود آپ انہیں کافر قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور اس کے علاوہ افلاطون و ارسطو کے مسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقلدین مثال کے طور پر ابن سینا' فارابی وغیرہ کو بھی ان کے افکار کی بدولت مسلمان تصور نہیں کرتے۔

اگرچہ امام تینوں گروہوں کے افکار کو مسترد کر دیتے ہیں لیکن الٰہ پرستوں کے معاملے میں آپ عارضی نوعیت کی مصالحت کو ممکن سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ گروہ بھی خدا اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر کسی طرح کا اشتراک عمل ممکن نہیں۔

اس سے قطع نظر کہ یونانی الٰہ پرستوں کے حوالے سے امام کا تجزیہ تاریخی طور پر درست ہو یا نہ ہو اہمیت ان اصولوں کی ہے جن کی بنیاد پر وہ مختلف عقائد و نظریات کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ ان کے نام نہاد الٰہ پرستوں کے خلاف امام غزالی کی فکر کو Watt نے مختصراً یوں بیان کیا ہے'' الغزالی کی اصل کامیابی افلاطونی دلیل پر طرز فکر کی تعمیر اور پھر اس کا استعمال کرنا تھا اور پھر اسلامی الٰہیات کی از سر نو تعمیر تاکہ نئی افلاطونی تعلیمات کو اسلام سے ہم آہنگ کر سکے اور ان کے تمام دوسرے فلاسفہ کی کمزوریوں کو واضح کر سکے۔ یونانی فلسفیانہ طریق استدلال کا اسلامی عقائد کے ساتھ اشتراک' العشری' تک تقریباً مکمل ہو چکا تھا اگرچہ اس پر مزید کام غزالی کے بعد لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی نے ان نو افلاطونی فکر سے بہت کچھ سیکھا مگر یہ الزامات کہ انہوں نے بعض ان بنیادی فلسفوں سے استفادہ کیا ہے جس کی انہوں نے ابتداء میں تردید کی تھی' قابل تردید ہیں۔ یہ الزامات ان افکار کی بنیاد پر لگائے گئے ہیں جو غلط طور پر غزالی سے منسلک کیے جاتے ہیں۔

درج بالا سطور سے ایک بنیادی اصول یہ سامنے آتا ہے کہ جس طرح ہر دور میں ہر جگہ خدا کے نیک بندے پائے جاتے ہیں اور دنیا کبھی ان سے خالی نہیں رہی یہ کائنات کے قائم و دائم رہنے کی علت ہے اور انہی کی وجہ سے دنیا پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صداقت کو کہیں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بدعقیدوں اور فلاسفہ کے افکار کو سچ اور جھوٹ کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ تنقید نگار کا کام اس جوہری کی طرح سے ہو جو اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے کھرا اور کھوٹا علیحدہ کر لیتا ہے۔

لازمی تنقید کے باب میں استدلال کا طریقہ کار کچھ یوں ہوتا ہے کہ اس میں شہادت سے مدد لی جاتی ہے اب چاہے وہ شہادت تاریخی ہو یا واقعاتی ہم اس انداز تنقید کو کسی فکر کے واقعاتی سقم کو جانچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اگر وہ واقعاتی سقم اس فکر میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں تو پھر ان کو مشکوک طور پر صحیح ثابت کرنے سے اس فکر کی مقام و اہمیت کم ہو جائے گی۔ جہاں تک امام غزالی کے تنقید سے متعلق اصولوں کا تعلق ہے۔ تو اس لازمی تنقید کو تین زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے اول امام نہایت قطعیت کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام عقائد و اعمال میں سے کچھ بھی ان نام نہاد دنیادی عقائد سے متصادم نہیں ہے۔

منطقی تنقید کسی بھی نظریے کے منطقی ربط سے منسلک ہوتی ہے۔ نظریے کا اندرونی ربط اس کی حقانیت کی

دلالت کرتا ہے جب اس کی بے ربطگی اس کو جھوٹا ثابت کرتی ہے۔ تہافہ میں امام منطقی طریقہ استدلال کو استعمال کرتے ہیں یونانی فکر و فلسفہ کی بنیادی بے ربطگی کو ظاہر کیا ہے۔

امام کے خیال میں عقلی سطح ہی کسی مقام کی منطقی لزومیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لہٰذا تہافہ میں اپنے جوابی دلائل میں انہوں نے بار بار اپنے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ وہ امام کے پیش کردہ قیاسی متبادل کے متضاد خیالات میں کسی بھی قسم کا خود تضاد تلاش کریں وہ کہتے ہیں کہ عقلی بنیاد پر فلاسفہ اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ امام غزالی بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ:

''کیا چیز ہمیں ان چیزوں پر یقین رکھنے سے دور رکھتی ہے نیز اس میں کیا تضادات پائے جاتے ہیں۔''

[Tp.16]

امام قانون تضاد کو یونانی فلسفہ کے اندر موجود بے ربطگی کو ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

''آپ کہتے ہیں کہ زحل کی گردش سورج کی گردش سے تیس گنا کم ہے اور دونوں یکساں طور پر لامحدود ہیں۔ پھر کس طرح محدود اور لامحدود کے دو مقام ایک ہی چیز اور وقت کے لیے ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ چیز کسی فرد کو مایوس کن خود تضادی کا شکار نہیں کر دے گی۔ ان فلاسفہ کے بارے میں اس دلیل کو ناکافی سمجھتے ہوئے امام نے ان فلاسفہ کی خود تضادی اور بودے پن کو مزید واضح کیا ہے۔

دوسری طرف امام غزالی نے یونانی فلاسفہ اور یونانی علوم کے حاصل کردہ تاریخی حقائق کے درمیان تناؤ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے یونانی فلاسفہ کے ابدیت کے نظریہ اور یونانی طبیعات اور فلکیات کے کائناتی اشیاء کی خاص تعداد میں گردش کے نظریہ پر بھی نکتہ چینی کی۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے مخالفین کو کس طرح رد کر سکتے ہیں جب وہ کہتے ہوں کہ دنیا کی ابدیت ناممکن ہے۔

لازمی تنقید کے ضمن میں امام غزالی اسلام اور یونانی فلاسفہ کے اس بنیادی اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اختلافات مابعد الطبیعیاتی یا محض اعداد و شمار کے نہیں ہیں جن کو حقائق کی بنیاد پر حل کر لیا جائے۔ امام فرماتے ہیں ''ایک مذہبی آدمی اور فلسفی کے درمیان تنازع محض دنیا کے فانی یا غیر فانی ہونے پر نہیں ہے اگر دنیا کی ابتداء کے وقت کا تنازع حل ہو جائے تو دنیا کے گول' چوکور یا شش پہلو یا ہشت پہلو ہونے پر اور زمین کی تہوں پر اختلافات ہو جائیں گے۔ اس طرح حقائق کی تحقیق مابعد الطبیعیاتی سے متعلق نہیں ہے۔ ہمارے دلچسپی کا موضوع یہ ہے کہ دنیا خدا کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے خواہ یہ عمل کسی طرح بھی انجام پایا ہو۔ امام کہتے ہیں:

''کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کائنات کی گردش جفت یا طاق ہے اگر آپ اسے جفت اور طاق دونوں کہیں گے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہ تو جفت ہے اور نہ طاق' یہ بے ہنگم بات ہے۔ اگر آپ اسے جفت کہیں تو محض ایک کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اضافہ اسے طاق بنادے گا اور اگر آپ طاق کہیں گے تو ایک کا اضافہ اسے جفت بنادے گا ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز جو لامحدود ہے محض ایک عدد کے اضافہ سے جفت سے طاق بن جائے یعنی آپ کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ عدد نہ تو جفت ہے نہ ہی طاق''۔ یہ خود تضادی کی ایک شاندار مثال ہے۔

د) لازمی تنقید میں ہم ساختی دلیل استعمال کرتے ہیں جو کہ تاریخی یا حقیقی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس طریقہ تنقید کو ہم کسی نظریے کے حقیقی نقائص کو تلاش کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ امام کے اصول تنقید کے حوالے سے ہم لازمی تنقید کو تین حوالوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے امام غزالی غیر مبہم انداز میں واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں کوئی عمل متضاد یا مبہم نہیں ہے۔ تہافہ کے تمہیدی باب میں امام اس بات کو کلی طور پر رد کرتے ہیں کہ بعض احادیث حقیقت سے متصادم ہیں' ان احادیث کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ ناجائز اضافے ہیں' ہمیں اس کے مصنف کو جھوٹا سمجھتے ہوئے اس کی ملامت کرنی چاہیئے۔ رسول کے الفاظ صرف وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ اضافے اصل میں تو ان کی وضاحت کی ضرورت ہے نہ کہ ان کو حقائق برخلاف ثابت کرنے کی۔

حرف آخر:

تنقید کی پوری حکمت عملی کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی ہے۔

☆ گمراہ اقلیت کو ان کے داخلی خیالات کی بے ربطگی واضح کر کے مسترد کیا جائے اور یہ کام لازمی خارجیت کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک حد تک نفوذ کے ذریعے ممکن ہے۔

☆ داخلی تنقید اسلام کی حقانیت کے ایک واضح پیکر میں مضبوط عقیدے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔

☆ یکسانیات کو نمایاں کر کے اللہ اور آخرت کے بنیادی تصور کے لیے راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

بلاشبہ یہ تنقید اس تمام مثبت کام پر ایک ابتدائی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس مقالے میں وسعت نہیں کہ وہ اس تمام کام کو سمیٹ سکے۔

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ

کثیر الاستعمال سرمایہ دارانہ اصطلاحات

[نوٹ: کتاب میں بہت سی اصطلاحات ایسی استعمال ہوئی ہیں جو معمولی تغیر کے ساتھ ہمارے اہلِ علم میں بھی رائج ہیں، مگر ان کا وہ معنی ومفہوم جو ہمارے ہاں مراد لیا جاتا ہے مغربی فلاسفی میں نہیں...... ذیل میں وہ اصطلاحات جو کتاب میں استعمال ہوئی ہیں اور وہ بھی جن کا اس کتاب کی ابحاث سے کچھ نہ کچھ تعلق بنتا ہے' کا ترجمہ دیا جارہا ہے۔ یہ تمام اصطلاحات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی کتاب ''بزنس ایتھکس اِن پاکستان'' سے لی گئی ہیں۔ ان کو اردو قالب جناب زاہد صدیق مغل صاحب نے پہنایا ہے۔]

جن اصطلاحات کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا یا تو انکا ترجمہ ممکن نہیں اور یا ہم انکی مناسب متبادل اردو اصطلاحات سے واقف نہیں۔ اصطلاحات کے سامنے قوسین میں دی گئی دیگر اصطلاحات دیکھنے سے انکے معنی سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اکثر اوقات درج ذیل میں سے بہت سی اصطلاحات کو مسلم مفکرین اور علمائے کرام انکے اصل معنی کی بجائے انکے لغوی معنی پر محمول کر لیتے ہیں۔ یادرکھنا چاہیئے کہ کسی لفظ کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں فرق ہوتا ہے اور جب کسی لفظ کا بطور ایک مخصوص علمی اصطلاح استعمال عام ہوجائے تو اسے لغوی معنی میں استعمال کر کے کوئی اور معنی پہنانا غیر علمی رویہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'فقہ' اور 'اصول فقہ' محض عربی زبان کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اسلامی علمیت سے نکلنے والی اصطلاحات ہیں اور کسی بھی دوسری زبان میں انکا لغوی ترجمہ کر کے انہیں کوئی اور معنی پہنانا غلط ہوگا۔ مثلاً اگر اسلامی اصطلاح 'اصول فقہ' کا ترجمہ 'سمجھ بوجھ کے اصول' یا انگریزی میں rules

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

of understanding کرلیا جائے اور پھر اسے سائنس کے طریقہ علم پر یہ کہہ کر چسپاں کردیا جائے کہ دیکھئے اس کے بھی تو rules of understanding یعنی سمجھ بوجھ کے اصول ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ اسی طرح مغربی اصطلاحات کو لغوی معنی میں استعمال کرنا یا انہیں اپنی طرف سے کوئی اور معنی پہنانا غیر علمی رویہ ہے، جیسے Enlightenment کی اصطلاح کا کوئی فرضی اسلامی تصور قائم کرلینا۔ اصطلاحات کے معنی ایک تہذیب کی علمی تاریخ سے گذرنے کے بعد متعین ہوتے ہیں اور کسی دوسری زبان میں انکا لغوی ترجمہ کرلینے سے انکی علمی تاریخ و معنی نیز اس تہذیب میں انکا کردار وغیرہ پس پردہ چلے جاتے ہیں۔

(1)Abstracti (تجرید)

تحقیقی عمل کے دوران کسی شے کی اساسی و متعلقہ خصوصیات پر توجہ مرکوز کرنا اور غیر متعلقہ کو نظر انداز کرنا۔ اس عمل میں شے کی چند خصوصیات کو چند دیگر خصوصیات پر فوقیت دے کر اسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً جب تصور 'مسلمان' کی مجرد انداز میں تعریف بیان کی جاتی ہے تو صرف ان اعمال کا لحاظ کیا جاتا ہے جو وہ ارادتاً رضائے الٰہی کے مطابق ادا کرتا ہے جبکہ غیر ارادی طور پر سرزد ہونے والے افعال کو اس کی تعریف سے خارج از بحث سمجھا جاتا ہے۔

(2) Anarchism (انارکزم)

سرمایہ دارانہ نظم زندگی کا ایک نظریہ جو ہر قسم کے ربط و تنظیم (order) کا مخالف ہے کیونکہ اس سے آزادی میں تحدید ہوتی ہے۔ اس نظریئے کے حامی ریاست کو لازمی برائی قرار دیتے ہیں۔

(3) Act Utilitarianism (عملی افادیت پسندی)

ہر عمل کی اخلاقی قدر (خیر و شر) اس بنیاد پر جانچنا کہ وہ عمل کتنی انسانی لذت اور تکلیف کا باعث بنتا ہے (دیکھئے utilitarianism نیز rule utilitarianism)۔

(4) Autonomy (خودارادیت، خودمختاری)

انسان کی صمدیت کا اقرار یعنی یہ ماننا کہ انسان قائم بالذات ہے۔ تعیین خیر و شر کے معاملے میں ارادہ الٰہی کو بنیاد بنانے سے انکار کرنا (دیکھئے freedom نیز humanity)۔

(5) Bad faith (بدعقیدگی، فاسد و باطل عقیدہ)

مشہور فلسفی سارتر کا تصور جس کا مطلب ہے انسانی ذات کی حقیقت کے بارے میں غلط تصور

(self-deception) کا شکار ہونا۔ مثلاً جب ایک مسلمان اپنی ذات کے قائم بالذات ہونے کا انکار کرتا ہے تو وہ بدعقیدگی میں ملوث ہوتا ہے۔

(6) Capital (سرمایہ)

مقدار محض جسکا مقصد بڑھوتری برائے بڑھوتری ہو۔ سادہ لفظوں میں دولت یا ملکیت کا وہ حصہ جسے بڑھوتری برائے بڑھوتری (accumulation for the sake of accumulation) کے عمل میں کھپا دیا گیا ہو۔

(7) Capitalism (سرمایہ داری)

ایسا معاشرتی نظم جہاں عبدیت کو رد کر کے آزادی کو بطور آفاقی قدر قبول و فروغ دیا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اہم خصوصیت سرمایہ دارانہ یعنی کارپوریٹ ملکیت کا فروغ اور نظام قدر کا فائنانشل مارکیٹ کے تابع ہوجانا ہے

(8) Categorical imperative (غیر مشروط فرض)

اعمال کی قدر (خیر و شر) متعین کرنے کا ایک اہم مغربی اصول جسکا مطلب ایسے اخلاقی اصول کے مطابق اعمال کی قدر متعین کرنا چاہیئے جو صفت آفاقیت سے متصف ہوسکے۔ کانٹ کے اس اصول کو principle of universalizability بھی کہتے ہیں۔ کانٹ کے خیال میں ہر وہ کام اخلاقاً جائز ہے جسے فرد تمام انسانوں کو کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہو۔ نظریہ اخلاق کے اس اصول کے مطابق شرک سے منع کرنا اور زنا پر قدغن لگانا غیر اخلاقی و غیر قانونی اعمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(9) Civil Society (سول سوسائٹی)

افراد کی اغراض پر مبنی تعلقات سے ابھرنے والی معاشرتی صف بندی۔ سول سوسائٹی درحقیقت مارکیٹ سوسائٹی ہوتی ہے اور یہ محبت اور صلہ رحمی پر مبنی مذہبی معاشرت کی ضد ہے۔

(10) Citizen (سٹیزن)

ایسی عوام جو اصولاً حاکم ہو۔ یہ اسلامی تصور رعایا کی ضد ہے۔

(11) Consequentialism (نتیجیت پسندی)

اعمال کی قدر (اچھائی یا برائی) انکے نتیجے کے اعتبار سے جانچنا (دیکھئے Deontological)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Consistency (12) (ہم آہنگی، ربط)

سوچ یا اعمال میں تضاد نہ ہونا۔ مثلاً ایک شخص کا مسلمان ہونا اور ہیومن رائٹس کیلئے جدوجہد کرنا تضاد ہے۔

Corporation (13) (کارپوریشن)

شخص قانونی (legal personality) جو اپنے تمام مالکان سے علی الرغم اپنا علیحدہ تشخص اور وجود رکھتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ملکیت کی اصل شکل ہے جسکا مقصد بڑھوتری برائے بڑھوتری کے سواء اور کچھ نہیں۔ کارپوریشن نجی ملکی ختم کر دیتی ہے اور ملکیت میں تصرف کرنے کے حق کو فرد سے چھین کر ایسے افراد کے ہاتھوں میں مرکوز کر دیتی ہے جو فیصلے صرف بڑھوتری سرمایہ (profit maximization) کے اصول پر کرتے ہیں۔

Cultural Relativism (14) (ثقافتی اضافیت)

یہ تصور کے اخلاقی قدریں آفاقی نہیں ہوتیں بلکہ یہ معاشرتی تناظر پر منحصر ہوتی ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ہم جنس پرستی جائز ہے جبکہ پاکستان میں ناجائز (دیکھئے ethical absolutism)۔

Democracy (15) (جمہوریت)

ایسا ریاستی نظم جسکا مقصد مساوی آزادی یعنی سرمائے کی منتہا بڑھوتری کا حصول ممکن بنانا ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں ارادہ عمومی (General Will) کو اصل منبع قانون ماننا۔

Deontological (16)

ایسا اخلاقی نظام جس میں اعمال کی قدر (اچھائی یا برائی) کسی اصول کے مطابق طے کی جائے۔ یہ تصور consequentialism کا مدمقابل تصور ہے جسکے مطابق خیر و شر کا تعلق نتیجے کے بجائے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی پر منحصر ہونا چاہئے (دیکھئے consequentialism)۔

Difference principle (17)

مشہور فلسفی رالز کے نظریہ عدل کا دوسرا اصول جسکے مطابق آمدنیوں میں ایسا تفاوت (distributional inequalities) جائز ہے جسکے نتیجے میں معاشرے کے پس ماندہ ترین طبقے کو فائدہ پہنچے۔

Distributive justice (18) (عادلانہ تقسیم دولت)

ذرائع و دولت کی عادلانہ معاشرتی تقسیم کا ایک مخصوص سرمایہ دارانہ تصور جسکے مطابق ذرائع کو اسطرح تقسیم ہونا چاہئے کہ انکی مختتم پیداوار (marginal productivity) اور مختتم لاگت (marginal cost) کا حاصل تقسیم (ratio) برابر ہو جائے۔

Dogma (19) (بے اصل عقیدہ)

کانٹ کے مطابق انسان کی آزادی اور خودارادیت کے علاوہ کسی دوسری بات پر ایمان رکھنا۔ مثلاً راسخ العقیدہ مسلمان کا خدا کی صمدیت پر ایمان رکھنا dogma ہے کہ وہ اسے انسان کی آزادی کے پیرائے میں جواز فراہم نہیں کرتا۔ اسکے مقابلے میں چونکہ جدیدیت پسند مسلم مفکرین انسان کی آزادی کو بطور قدر قبول کرتے ہیں اور عقیدہ باری تعالیٰ کو اسی پیرائے میں بیان کرتے ہیں لہٰذا انکا تصور خدا dogma نہیں کہلائے گا۔

Duty (20) (فرض)

اخلاقی ذمہ داری (دیکھئے rights)۔

Egoism (21)

یہ تصور کہ اخلاقی نظام اور اعمال کا مقصد ذاتی اغراض کا حصول ممکن بنانا ہے۔

Emotivism (22)

یہ تصور کہ اخلاقی تصورات وقدریں محض فرد کی ذاتی ترجیحات وخواہشات کا مظہر ہوتی ہیں اور دوسرے افراد پر انکی اثر اندازی اور قبولیت کی وجہ انکا آفاقی (logical) ہونا نہیں بلکہ مخصوص جذبات سے مغلوب ہو جانے کی بنا پر ہے۔

Empiricism (23) (تجربیت)

یہ تصور کہ علم کا بنیادی اور اصل ماخذ حواس خمسہ سے حاصل ہونے والا مشاہدہ (perception) ہے (دیکھئے rationalism)۔

Enlightenment (24) (تحریک تنویر یا رد وحی)

انسان کی صمدیت پر ایمان لانا، یہ ماننا کہ ادراک حقیقت کیلئے کسی وحی کی ضرورت نہیں بلکہ انسان اپنے کلیات کی بنا پر حقیقت جان سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(25) Epistemology (علمیت)

ماخذات علم، حاصل شدہ معلومات کی درستگی کے معیارات کی جانچ پڑتال اور معلومات کی حد بندی دریافت کرنے کا عمل۔

(26) Essence (جوہر)

کسی شے کی وہ خصوصیات جنکی بناء پر وہ دوسری اشیاء سے ممیز کی جاسکے۔ مثلاً جیسے مسلمان کیلئے عبدیت (دیکھئے existence)۔

(27) Essentialism (جوہریت پسند)

یہ نظریہ کہ اشیاء کا وجود انکے جوہر کے بغیر متحقق نہیں ہوسکتا۔

(28) Ethical absolutism (اخلاقی آفاقیت پسندی)

یہ تصور کہ اخلاقی معیارات آفاقی ہوتے ہیں اور انکا انفرادی خواہشات و ترجیحات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا (دیکھئے cultural relativism)۔

(29) Ethics

مغربی فلسفے کی وہ شاخ جو اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ فرد جب دوسرے فرد سے معاہدہ کرے تو اسے ''کیا کرنا چاہئے''، اسکے لئے ''کیا صحیح ہے اور کیا غلط''، ''کیا جائز ہے اور کیا ناجائز'' (دیکھئے morality)۔

(30) Ethnocentrism

یہ تصور کہ ہماری مخصوص معاشرتی اقدار اور روایات دیگر تمام معاشرتی اقدار اور روایات سے اعلیٰ و برتر ہیں۔ جدیدیت اور پس جدیدیت مابعد عیسائی مغربی معاشرتی اقدار (آزادی، مساوات و ترقی) کو سب سے اعلیٰ گردانتی ہیں

(31) Equality (مساوات)

یہ تصور کہ سب انسانوں کا حق خود ارادیت برابر ہے، دوسرے لفظوں میں تمام تصورات خیر برابر معاشرتی حیثیت کے حامل ہیں۔ مساوات سرمایہ دارانہ نظم اور انفرادیت کی دوسری اہم قدر ہے اور یہ نظام ہدایت کا رد ہے

(32) Existence (وجود)

کسی شے یا انسان کا اسکے جوہر سے علی الرغم ہونا یا ہوتے رہنا (دیکھئے Essence)

(33) Existentialism (وجودیت پسندی)

یہ تصور کہ وجود (ہونا) جوہر سے ماقبل ہے اور اسپر فوقیت رکھتا ہے، یعنی جوہر رکھنے کیلئے 'ہونا' لازم ہے۔ اسکے مطابق چونکہ وجود جوہر سے پہلے ہوتا ہے، لہذا اسکا کوئی جوہر نہیں ہوتا، یعنی وجود کچھ ہوتا نہیں بلکہ ہوتا رہتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق انسان کا کوئی بنیادی جوہر نہیں، بلکہ انسان جو ہونا چاہے آزادانہ طور پر ہوسکتا ہے (دیکھئے Essentialism)۔

(34) Falsificationism (تردیدیت)

سائنس طریقہ علم کا ایک نظریہ جسکے مطابق سائنسی علم وہ ہے جسے تجربے کے ذریعے غلط ثابت کرنا ممکن ہو، سائنسی تحقیق کا مقصد چیزوں کو ثابت نہیں بلکہ غلط ثابت کرنا ہوتا ہے، یعنی سائنس کا علم نفی کے اصول پر ترقی کرتا ہے۔ اس نظریئے کے حامی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نظریئے کے بغیر مشاہدہ ممکن نہیں بلکہ مشاہدہ کسی نہ کسی نظریئے کی تصدیق یا تردید کے حق میں حکم لگانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(35) Freedom (آزادی)

انسانی خودمختاریت کا دعویٰ، عبدیت کا رد۔ انسان کا یہ حق ماننا کہ وہ خیر و شر کی جو تعبیر کرنا چاہے کرنے کا مکلّف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی کلیدی قدر اور قرآنی اصطلاح کے مطابق آزادی کا معنی بغی ہے (دیکھئے autonomy)۔

(36) Hedonistic calculus

مشہور فلسفی بینتھم (Bentham) کا مجوزہ طریقہ کار جسکے ذریعے افعال سے حاصل ہونے والی لذت و تکلیف کا کمیتی شمار و بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس تصور کے مطابق اعمال کی قدر متعین کرنے میں صرف وہی لذت قابل لحاظ ہے جسے نمبروں میں شمار کرنا ممکن ہو، دوسرے لفظوں میں لذت کی کیفیت (quality) نہیں بلکہ انکی کمیت (quantity) اصل اہمیت کی حامل ہے۔

(37) Honesty (ایمانداری)

سرمایہ دارانہ تناظر میں اس سے مراد ہے سرمایہ دارانہ حقوق کو بجالانا، سرمایہ دارانہ معاہدات کی روح اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مندرجات کے بیان میں غلط بیانی سے کام نہ لینا۔ مثلاً فرد ایمانداری کے کسی اور تصور کی بنیاد پر یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ تجارتی راز یا کمپنی کی دیگر معلومات کو عام کر دے۔

Human being (38) (ہیومن بینگ)

وہ انفرادیت جو اپنے الصمد (قائم بالذات) یعنی آزاد ہونے کا اقرار کرے (دیکھئے autonomy اور freedom)۔

Humanity (39) (انسانیت پرستی)

وہ تصور انسان جسکے مطابق انسان قائم بالذات یعنی الصمد ہے اور جو ارادہ انسانی کی تکمیل کو زندگی کے اصل مقصد کے طور پر قبول کرتا ہے Humanity جدیدیت کا کلیدی تصور ہے (دیکھئے autonomy)۔

Human Rights (40) (ہیومن کے حقوق)

سرمایہ دارانہ نظم مساوی آزادی یعنی سرمائے کی بڑھوتری کیلئے فرد کو تین بنیادی حقوق تفویض کرتا ہے جو ہر قسم کی مداخلت سے ماوراء سمجھے جاتے ہیں: (۱) زندگی کا حق (یہ تصور کہ فرد اپنی زندگی اور بدن کا مالک ہے)، (۲) اظہار ذات کا حق (یہ تصور کہ تمام تصورات خیر مساوی ہیں اور ہر فرد کو حق ہے کہ اپنی خواہشات کی جو ترتیب چاہے مرتب کر لے)، (۳) سرمایہ دارانہ ملکیت کا حق (یہ تصور کہ دیگر تمام مقاصد کے مقابلے میں بڑھوتری سرمائے کی فوقیت بدیہی (self-evident) شے ہے)۔ جمہوری دستوری قانون کا نفاذ قائم کر کے ان حقوق کو مسلط کرنا ہی سرمایہ دارانہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ہوتا ہے۔

Inductionism (41) (استقرائیت)

سائنسی طریقہ علم کا ایک نظریہ جسکے مطابق سائنسی علم حسیات سے حاصل ہونے والے مشاہدات پر تعمیر ہوتا ہے اور ان مشاہدات کی بنیاد پر نظریات وضع کر کے تجربات کئے جاتے ہیں۔

Justice (42) (عدل)

مخصوص مقاصد کے حصول کیلئے حقوق و فرائض اور جزا و سزا کی تقسیم کار۔ سرمایہ دارانہ تصور کے مطابق عدل کا تقاضا یہ ہے کہ مساوی آزادی کے حصول کو دیگر تمام مقاصد زندگی پر فوقیت دی جائے نیز حقوق و فرائض کی تقسیم اس بنیاد پر ہو کہ فرد کے کسی عمل کے نتیجے میں سرمائے میں کتنا اضافہ ممکن ہوتا ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق عدل کا معنی ہے شریعت اسلامی۔

Liberalism (43) (لبرل ازم)

سرمایہ داری کی اہم انفرادی (individualistic) تعبیر۔ سرمایہ دارانہ ملکیت اور ہیومن رائٹس پر مبنی جمہوری ریاست کا فلسفیانہ جواز فراہم کرنے کا نظریہ (دیکھئے human rights نیز democracy)۔

Libertarianism (44) (لبرٹیرئین ازم)

یہ تصور کہ انسانی صلاحیتوں اور کوششوں کے تفاوت کو معاشرتی (مارکیٹ کی) سطح پر سراہا جانا چاہئے اور اسکی صورت معاوضوں کا تفاوت ہونا چاہئے۔ یہ نظریہ ریاست کی مارکیٹ میں کم از کم مداخلت کا قائل ہے۔

Liberty principle (45) (اصول آزادی)

رالز کے نظریہ عدل کا پہلا اصول جسکے مطابق عادلانہ معاشرہ وہ ہے جہاں افراد کو زیادہ سے زیادہ ممکنہ مساوی آزادی (خود مختاریت) کا حق دیا جائے۔

Logical positivism (46) (منطقی اثباتیت)

یہ تصور کہ حقیقت وہی ہے جس تک ہم منطقی ذرائع اور تجربات کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ حقیقت کیلئے لازم ہے کہ اسے حسی تجربات کی بنیاد پر جانچا جاسکے، یعنی وہ لازماً مادی ہوتی ہے۔ اس مکتبہ فکر کے نزدیک مابعد الطبعیاتی سوالات کا جواب تلاش کرنا عبث ہے کہ انکا تجربہ کرنا ممکن نہیں۔

Market (47) (مارکیٹ)

تعلقات کا وہ جال جو لوگ اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کیلئے قائم کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد وہ جگہ بھی ہوتی ہے جہاں خود غرض افراد قیمتاً اشیاء کی لین دین کرتے ہوں۔

Maxim (48) (اصل الاصول)

کسی فعل کے پس پردہ مفروضات یا ایمانیات۔

Metaphysics (49) (مابعد الطبعیات)

فلسفے کی وہ شاخ جو حتمی حقیقت کی نوعیت سے بحث کرتی ہے۔

Modernism (50) (جدیدیت)

تحریک تنویر سے نکلنے والی علمیت (سائنس و سوشل سائنس) اور اسے اختیار کرنے کو انسان کی آفاقی ضرورت ماننا۔ جدیدیت کا بنیادی تصور انسانیت پرستی (humanity) ہے (دیکھئے humanity)۔

Modernist Islam (51) (تجدد پسندانہ اسلام)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام کا جدید تصور جو نہ صرف یہ کہ اسلام کی تشکیل و تعبیر نو کا پرزور حامی ہے بلکہ حالات کے تقاضوں کی روشنی میں ردشریعت، رد روایت اور رد اجماع کے امکان کو بھی تسلیم کرتا ہے تاکہ اسلام کو مغربی تہذیب یعنی سرمایہ دارانہ نظم میں سمویا جاسکے (دیکھئے revisionist Islam نیز Orthodox Islam)۔

Morality (52) (اخلاقیات)

اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ 'مجھے اپنی خواہشات کس طرح مرتب کرنا چاہئے'، یعنی 'مجھے خواہشات میں ترجیحات کا کونسا پیمانہ قائم کرنا چاہئے، مجھے کیا چاہنا چاہئے اور کیا نہیں'۔ جدیدی (مثلاً کانٹ یا رالز کے) مباحث میں ان سوالات کا کوئی جواب دینا سرے سے ناممکن ہے کیونکہ وہ آزادی کو بنیادی احساس کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ جدیدیت اور پس جدیدیت ethics اور morality کو غلط طور پر ہم معنی سمجھتی ہے (دیکھئے ethics)۔

Multiculturalism (53) (تعدد ثقافت، کثیر ثقافتی نظام)

یہ تصور کہ تمام اقدار اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے اور شناختیں (مثلاً مسلم و کافر، امریکی و افغانی، سندھی و بلوچ وغیرہ وغیرہ) عقلاً و اخلاقاً مساوی حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں سے کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔ لہذا تمام افراد اور گروہوں کو اپنے اپنے شناختی اختلافات قائم رکھتے ہوئے ٹولرنس کا مظاہرہ کرکے مل جل کر رہنا چاہئے۔

Naturalism (54) (فطرت پرستی)

یہ تصور کہ کائنات چند لگے بندھے اصولوں کی پابند ہے اور ان اصولوں کا کوئی مخصوص مقصد نہیں کیونکہ فطرت اندھی قوت ہے (دیکھئے telelogical)۔

Natural law (55) (قوانین فطرت)

کائنات اور انسانی رویوں کے آفاقی اصول جنہیں عقل سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کشش ثقل، قوانین طلب و رسد کو ایسے فطری قوانین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

Normative analysis (56) (اقداری تجزیہ)

سوچ، عمل اور جمالیاتی احساس میں صحیح اور غلط کی تمیز قائم کرنے کی فلسفیانہ جانچ پڑت۔ اس عمل کے دوران چیزیں 'جیسی کہ انہیں ہونا چاہئے' معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کوشش میں تصور 'صحیح' کی تعریف بطور مفروضے کے ہی قبول کی جاتی ہے (دیکھئے positive analysis)۔

Norms (57) (اقدار)

اخلاقی رویوں کو جانچنے کے پیمانے۔

Objectivity (58) (معروضیت)

چیزوں کو ویسا ہی جان لینا جیسا کہ وہ فی نفسہ ہیں (دیکھئے subjectivity)۔

Obligation (59) (ذمہ داری)

کسی عمل کو کرنے یا اس سے رکنے کی ذمہ داری۔ یہ ایسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو کسی کو نقصان پہنچانے کے نتیجے میں لازم آتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا منبع معاشرتی معاہدات اور قانون دونوں ہوسکتے ہیں۔

Orthodox Islam (60) (سکہ بند اسلام)

علمائے اسلام کا مرکزی دھارا جو قرآن، حدیث اور اجماع امت کی آفاقیت اور اجتہاد بطور تسلسل تقلید کے قائل ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ اسلام کی جو تشریح ہماری تاریخ میں کی گئی وہی حق ہے اور کسی نئی تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مغرب جاہلیت خالصہ ہے (دیکھئے modernist Islam نیز revisionist Islam)۔

Paternalism (61) (پدریت)

فرد کی خودمختاریت کا انکار کرنا اس بنیاد پر کہ فرد کا سرپرست (patron) اس کی بھلائی کا اس سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

Pluralism (62) (کثرت جوہر یا خیر)

یہ ماننا کہ خیر کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں اور یہ تمام تعبیریں مساوی اقداری حیثیت رکھتی ہیں۔

Positive analysis (63) (ایجابی، اثباتی یا واقعاتی تجزیہ)

جانچ پڑت کا وہ عمل جسکے ذریعے چیزیں 'جیسی وہ فی نفسہ ہیں' جاننے کی کوشش کی جائے (دیکھئے normative analysis)۔

Post-modernism (64) (پس جدیدیت)

وہ نظریہ جو انسان کے وجود کی کوئی حتمی و آفاقی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ درحقیقت آزادی کو بطور مقصد حیات فرض کرتا ہے، البتہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ تحریک تنویر نے جو اقدار و مقاصد بطور آفاقی حقیقت کے پیش کئے انکے جواز کی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں۔ انکا اصل اعتراض یہ ہے کہ عملاً مغرب میں آزادی اسطرح حاصل نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہئے تھی بلکہ مغرب نے حصول آزادی کیلئے ایک زبردست جبر قائم کردیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(عمل تکاثر) Profit-maximization (65)

یہ تصور کہ پیدواری عمل کا اصل اور جائز مقصد سرمائے کی لامحدود بڑھوتری ہے۔

(ترقی) Progress (66) ✓

ہیومن ارادے کا کائناتی تسلط۔ اسکا مطلب تصرف فی الارض کو بطور مقصد حیات قبول کرنا ہے اور Progress کا ذریعہ سرمایہ کی بڑھوتری ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی اور انفرادیت کی تیسری اہم قدر ہے اور اسلامی تصور آخرت (یہ کہ دنیا دار الامتحان ہے) کا رد ہے (یعنی اسے دار القرار سمجھنا چاہئے)۔

(عقلیت پرستی) Rationalism (67) ✓

انسانی عقل کو علم کے بنیادی منبع کے طور پر قبول کرنا (دیکھئے empiricism)۔

(ترمیم پسند اسلام) Revisionist Islam (68) ✓

مغرب کو اسلامی تاریخ کا تسلسل ثابت کرنے کیلئے اسلامی علمیت و تاریخ کی نئی تشریح پیش کرنا (دیکھئے modernist Islam نیز orthodox Islam)۔

(حقوق) Rights (69) ✓

فرد کا ایسا اخلاقی دعوی جو دوسرے فرد یا ایک اجتماعیت کو فرد کیلئے مخصوص ذمہ داریوں کی ادائیگی کا مکلّف ٹھرائے۔ سرمایہ دارانہ نظم ہیومن رائٹس کی بالادستی قائم کرتا ہے۔

(اصولی افادیت پسندی) Rule utilitarianism (70) ✓

یہ تصور کہ افادیت پرستی (utilitarianism) سے اخذ ہونے والے عمومی اصولوں کو بنیاد بنا کر انفرادی اور اجتماعی رویوں پر جائز و ناجائز کا حکم لگانا چاہئے (دیکھئے act utilitarianism)۔

(سائنس) Science (71) ✓

علت و معلول اور کائناتی ہم آہنگی (uniformity) کے قوانین کی روشنی میں کائنات کی ایسی تفہیم حاصل کرنا کہ اسے انسانی ارادے کے ماتحت کر کے انسان کی صمدیت کو قائم کرنا ممکن ہو سکے۔

(نظریہ تشلکیت) Skepticism (72) ✓

یہ نظریہ کہ علم بطور کیفیت یقین (certainty) کا حصول ناممکن ہے۔

(عمرانی معاہدہ) Social contract (73) ✓

citizen اور حکام کے درمیان ایک فرضی عمرانی معاہدہ جسکا مقصد سرمایہ دارانہ ریاست کا قیام ہوتا ہے جو مساوی آزادی یعنی سرمائے کے حصول کی جدوجہد کی فوقیت کو دیگر تمام مقاصد زندگی کے حصول پر قائم کرتی ہے (دیکھئے citizen)۔

(سوشل ڈیموکریسی) Social democracy (74) ✓

سرمایہ داری کی ایک اہم تعبیر جسکے مطابق مارکیٹ نظم کی بالادستی کیلئے محض ہیومن رائٹس کافی نہیں بلکہ چند ویلفیر رائٹس کی فراہمی بھی لازم ہے جسکی ذمہ داری سرمایہ دارانہ ریاست پر عائد ہوتی ہے (دیکھئے welfare rights)۔

(سوشل ازم) Socialism / Marxism (75) ✓

سرمایہ داری کی ایک اہم تعبیر جسکے مطابق مساوی آزادی کے حصول کیلئے مارکیٹ نظم نہیں بلکہ ذرائع پیداوار کو ریاستی تحویل میں دینا ضروری ہے۔

(ساختیت پسندی) Structuralism (76)

یہ تصور کہ ثقافت اور زبان کے تجزیئے کے ذریعے انسانی تعلقات اور رویوں کو متعین کرنے والے قوانین کا ادراک کرنا ممکن ہے۔

(موضوعیت) Subjectivism (77) ✓

یہ تصور کہ کسی ایسے آفاقی مفروضے یا قدر کا کوئی وجود نہیں جو علم حاصل کرنے والے فرد کی خواہشات یا احساسات سے ماوراء ہو (دیکھئے objectivity)۔

(مقصدیت پسندی) Telelogical (78)

یہ تصور کہ ہر فعل کسی نہ کسی مقصد کے حصول کی خاطر انجام دیا جاتا ہے۔

(نتیجیت یا مقصدیت پسندی پر مبنی اخلاقیات) Telelogical ethics (79)

ایک اخلاقی نظریہ جس کے مطابق خیر و شر کا تعین افعال کے نتیجے کے اعتبار سے کیا جانا چاہئے (دیکھئے Deontological)۔

(رواداری) Tolerance (80) ✓

اس سے مراد زندگی گزارنے کے تمام طریقوں کو مساوی معاشرتی قدر دینے کا رویہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسکا مطلب ''نہی عن المنکر'' کا انکار ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Universalism (81) (آفاقیت)

یہ ماننا کہ ایسے تصورات دریافت کیے جاسکتے ہیں جو آفاقی یعنی زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوں (دیکھیے cultural relativism)۔

Util (82)

لذت ماپنے کا ایک فرضی پیمانہ۔

Utilitarianism (83) (افادیت پسندی)

یہ تصور کہ وہی کام درست ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ لذت کا باعث بنے۔

Utility (84) (افادیت)

کسی شے کو صرف کرنے سے حاصل ہونے والا مزہ۔

Validity (85) (وجوب، ثبوت صحت)

منطق میں اس سے مراد کسی دلیل کے قضیوں اور نتیجے میں لزوم کا تعلق ہونا ہے، یعنی اگر قضیہ درست ہو تو نتیجہ بھی لازماً درست ہوگا۔

Welfare rights (86) (ویلفیئر حقوق)

ویلفیئر حقوق سے مراد تین چیزوں کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے: (۱) صحت، (۲) تعلیم، (۳) آمدنی۔

Welfare state (87) (فلاحی ریاست)

ایسی سرمایہ دارانہ ریاست جو ہیومن رائٹس کے علاوہ ویلفیئر رائٹس کی فراہمی بھی یقینی بنائے۔

ہم کیا چاہتے ہیں؟

ہم اسلامی انقلابی ہیں، ہم عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل شکست وریخت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ہم عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں پاکستان کو ضم کرنے کے مخالف ہیں، ہم مغرب سے فیصلہ کن تصادم کو لازم اور ایک دینی فریضہ تصور کرتے ہیں، ہم نے یہ موقف مندرجہ ذیل وجوہ کی بنیاد پر اختیار کیا ہے:

☆ اسلام ایک مکمل دین اور مکمل نظام ہے وہ کسی دوسری تہذیب اور کسی دوسرے نظامِ حیات میں ضم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں کسی دوسری تیسری تہذیب کا پیوند لگایا جاسکتا ہے۔

☆ مغربی تہذیب خالصتاً ایک ملحدانہ تہذیب ہے، اس نے تمام قانون سازی کو انسان کے لیے مختص کر دیا ہے، وہ خدا کی نہیں نفس پرستی کی قائل ہے۔ اس کی بنیاد لا الٰہ الا الانسان ہے، اس نے عملاً احکام الٰہی کو زندگی کے ہر شعبہ سے معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ مغربی تہذیب ایک خدا دشمن اور خدا بے زار تہذیب ہے۔ اس خدا دشمنی کے نتیجے میں جس نظامِ زندگی نے تسلط حاصل کیا ہے وہ سرمایہ داری کا نظام ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے نتیجے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاقیات اور روحانیت تباہ ہو گئی ہے' اس اخلاقی اور روحانی تباہی کا سب سے بڑا مظہر زنا کا عام ہو جانا ہے۔ آج یورپ میں 50 فیصد سے زیادہ بچے ناجائز پیدا ہوتے ہیں۔ امریکا میں 30 فی صد مرد ہم جنس پرست ہیں' عفت کا تصور بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

☆ سرمایہ داری حرص اور حسد کی عالمگیریت کا دوسرا نام ہے' سرمایہ داری کے فروغ کے نتیجے میں تمام معیشت پر سود اور سٹہ کے بازار کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ حلال رزق کا دائرہ محدود سے محدود تر ہو جاتا ہے۔ پورا معاشی نظام ظلم کی چکی میں پس جاتا ہے۔ اسلامی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور تمام وسائل سمٹ سمٹا کر ملک کے حاسد ترین اور سفاک ترین افراد کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔

☆ سرمایہ دارانہ سیاسی نظام عالمگیر سطح پر ظلم کو فروغ دیتا ہے' یہ نظام معیارات خیر و شر اور نفسانی خواہشات کی بنیاد پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ظلم عظیم کا برپا ہونا لازم ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے امریکی عوام نے دو صدیوں کے عرصہ میں ایک کروڑ ریڈ انڈینز کو نہایت منظم حکمت عملی کے تحت قتل کیا اور ان کا پورا براعظم ان سے چھین لیا۔ آج یہی خون آشام امریکی اس سے بھی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف ہیں۔

☆ امریکا اسلام سے شدید نفرت کرتا ہے' اسلامی تہذیب کو نیست و نابود کرنا اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ اسی ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ایجنٹ مسلمان ممالک کے حکومتی نظام میں شامل کیے ہیں۔ آئی ایم ایف' ورلڈ بینک اور ایشین ڈیویلپمنٹ بینک نے ان ایجنٹوں کی سرکاری نظام میں بالادستی کو مستحکم کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ فراہم کیا ہے، ان ایجنٹوں کو بے دخل کرنا اور ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے پیسہ سے چلائے گئے پروگراموں کو معطل کرنا ملکی سلامتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

☆ ہمیں اسلامی جماعتوں کو باور کرانا ہے کہ امریکی استعمار سے مقابلہ ممکن ہے۔ ہمیں جلد از جلد انقلابی اداراتی صف بندی کے عمل کا آغاز کرنا ہے اور مساجد اور مدارس کو محور بنا کر ایسے عوامی ادارے بنانے ہیں جن کے علماء بااقتدار ہوں۔ ہمیں ہر محکمہ اور ہر وزارت پر علماء کی بالادستی قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے اس کو کرنے کے لیے جماعتی سطح پر ایسا نظام قائم کرنا ہوگا جس میں علماء کی عوامی قیادت فراہم کرنے کی ذمہ داریاں تواتر سے بڑھتی چلی جائیں اور جس کے نتیجے میں علماء ہر سطح پر معاشرتی قیادت فراہم کرنے کے قابل بنتے چلے جائیں اور قوت سول انتظامیہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے آلہ کار مشیروں اور افسروں کے ہاتھوں سے نکل کر علماء کے ہاتھوں میں مرتکز ہو' ہمیں اس عمل کو ممکن بنانے کے لیے جامع منصوبہ بندی کرنے اور تمام ریاستی وسائل ہدف کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے ہیں۔

اسلامی جماعتوں کو یہ بات اچھی طرح باور کر لینی چاہیے کہ ان کا اصل اثاثہ علماء کرام ہی ہیں۔ علماء ہی اس ملک کی اصل انقلابی قوت ہیں' وہی اسلام کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں' انہوں نے ہی اپنی پوری زندگیاں قال اللہ و قال الرسول سے وابستہ کر رکھی ہیں' وہی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تحفظ دین اور غلبہ دین کے لیے اپنی جانیں قربان کرتے رہے ہیں' وہی مغربی استعمار کے قدیم ترین مخالف ہیں' ان میں مغرب سے بھرپور مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی جائے تو وہ اس ملک کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیں گے۔ علماء اسلامی جماعتوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ معاشرہ اور ریاست کی ہر سطح پر اقتدار ان کے سپرد کرنا تحفظ اسلام اور غلبہ دین کے لیے ضروری ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہماری مطبوعات

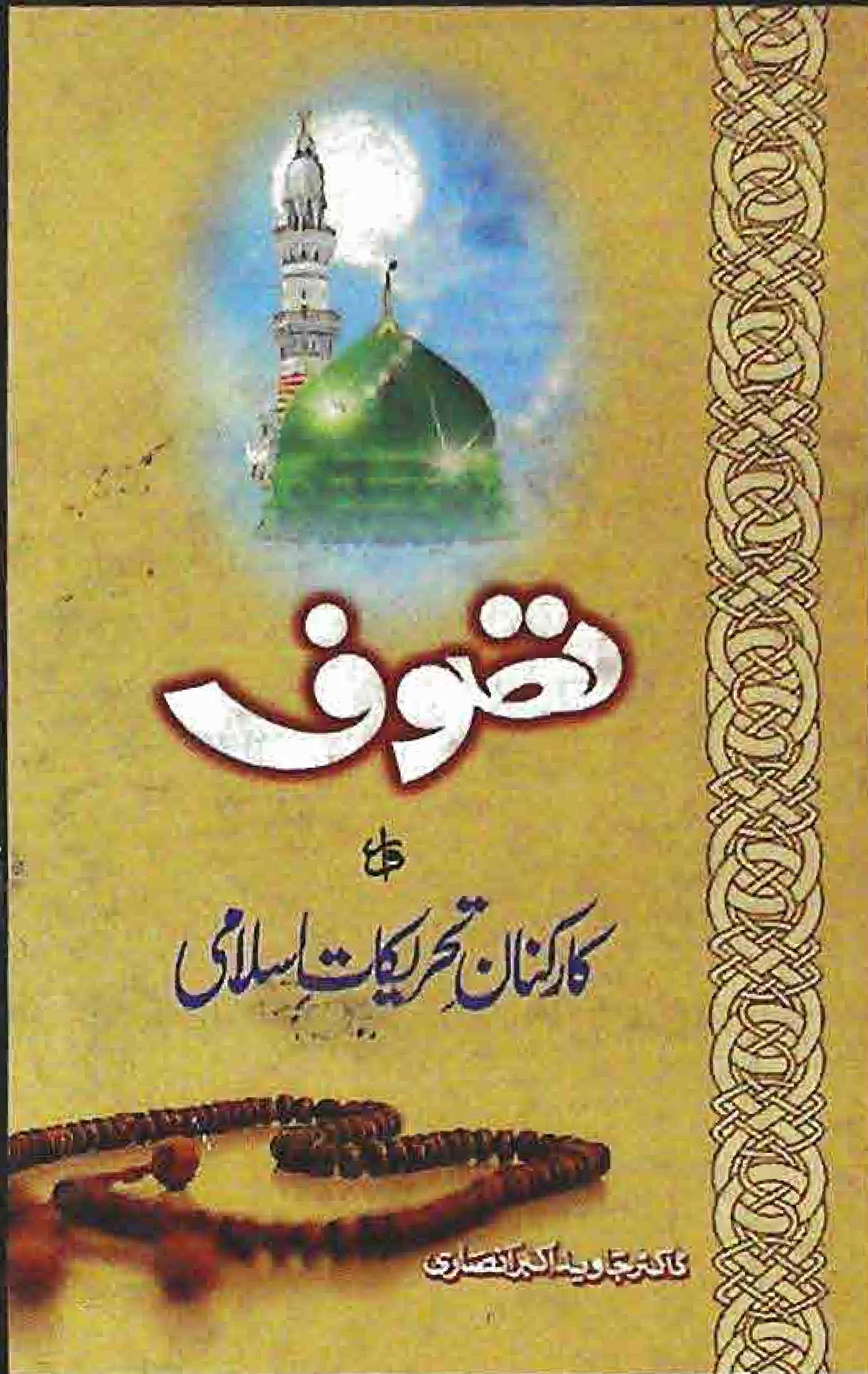

تصوف اور تزکیہ وسلوک کی ضرورت پر
ایک لاجواب اور قابل مطالعہ کتابچہ
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے قلم سے
صفحات : ۳۲
اعلیٰ طباعت
قیمت : ۲۵ روپے
علاوہ ڈاک خرچ

جمہوریت کی تاریخی حیثیت
جمہوریت اور سرمایہ داری کے
باہمی ربط اسلامی خلافت اور
جمہوریت کے مابین بنیادی فرق کو
واضح کرنے والی اہم مباحث پر
مشتمل کتاب، ہر اسلامی انقلابی اور
مجاہد فی سبیل اللہ کے لائق مطالعہ
صفحات: ۲۷۷
قیمت: ۱۵۰ روپے علاوہ ڈاک خرچ